قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ

اعتراضات اور حقائق

Three Mistakes by Mr. Jinnah

I revered Mr. M. A. Jinnah when I was a studen... Muslim University Aligarh. I exalted him in my d... in the Air Force and I ... him now when he is no more with us. I hold ... as a politician and a sta... he seldom faulted in his political decision m...g. Having said that and ... all my unshakable faith and trust in Mr. Jinnah's judgments, I now wit... ...EL that there are a few decisions or lack of ... Gover... General where PERHAPS he faltered. One may term these as 'mistake... but ref...ce to any such 'mistake' is hypothetical as the...e are conditioned by ... m...ny ... and 'buts'.

Based on my li...nited knowledge of aff...irs ... te but taking cognizance of the ground realitie... then prevailing, I am b... candid in airing my views, I could as well be wrong i... my assessment! I felt at odds with at least three of Mr. Jinnah's decisions as Governor General.

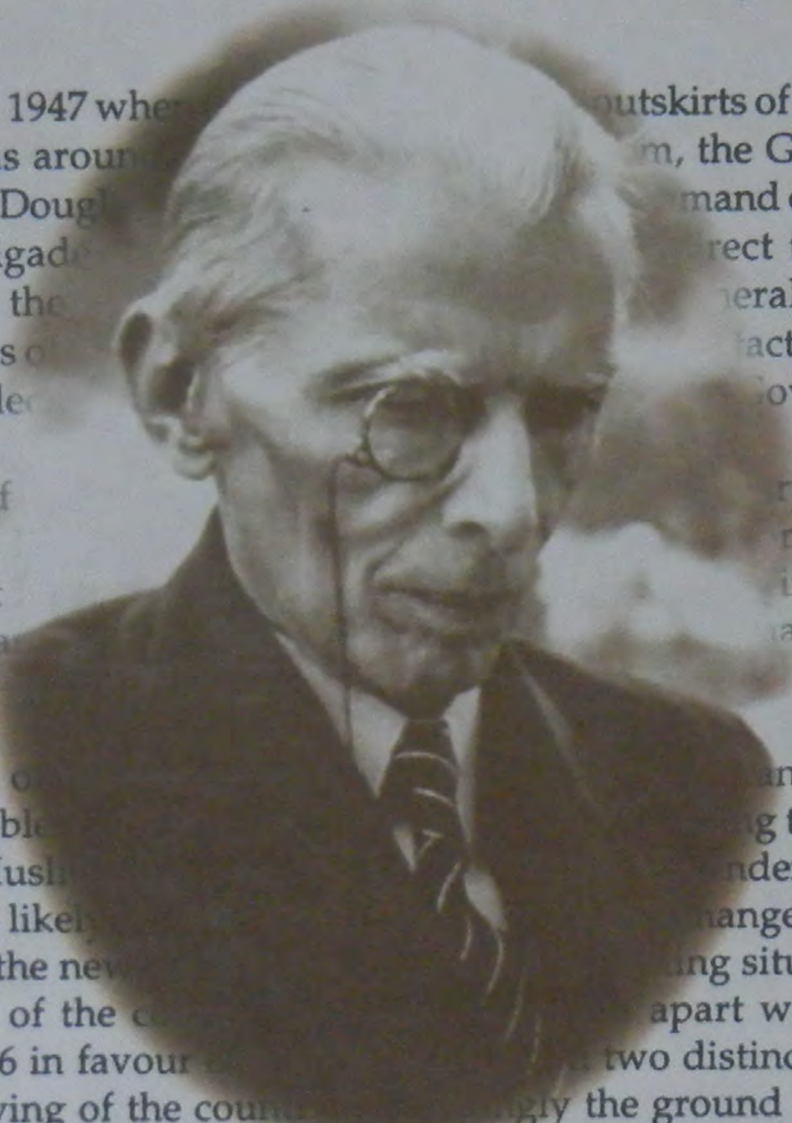
First

The first mis... ...mitt... ...y Mr. ... in ...lic... ...vas on 15 August, 1947 when a... ...ve...or ...eneral he ap... an un...lected bureaucrat Malik Ghulam Mohammad as Federal Minister for Finance. Later he nominated Ch. Sir Mohammad Zafarullah, another unelected person as Foreign Minister.

Second

Late in October, 1947 whe... ...utskirts of Srinagar airfield, ransacking the areas arou... ...m, the Governor General ordered Lt. General Doug... ...mand of Pakistan Army to dispatch one brigad... ...rect the thrust of the lashkars to capture th... ...eral Gracey ignored the legitimate orders o... ...acted Field Marshal Sir Claude Auchinle... ...overnor General's intentions.

Disobedience of ... ...y, requiring stem disciplinary action. ... General slipped and agreed to meet ... ...me and situation demanded immedia... ...and and replacing



Third

The question o... ...n was amongst the many ticklish probl... ...g the language of the majority of the Musl... ...ndence, was generally considered as the like... ...anged the composition of population in the ne... ...ng situation. Now, there were two wings of the c... ...apart with the balance of population 54 : 46 in favour ... two distinct languages being spoken in each wing of the cou... ...gly the ground situation was that one language was spoken and understood in one wing with the unfamiliarity of it in the other.

... ...sit to East Pakistan in March 1948, without taking th... ...nfidence, declared Urdu the language of just two perc... ..., as the national language of Pakistan at a public meeting in Paltan Maidan, Dacca. This was done in the hope of national integration but it was taken aimss and misunderstood. Other considerations aside, imposition of Urdu as the national language on the majority of the population of the country

منیر احمد منیر

یہ کتاب یہاں سے بھی دستیاب

تاپ مین

علی چیمبر، 65 مال روڈ، اندرون ریگل سینما، لاہور

فون: 7325466

☆

الفیصل، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

○

قیمت	250 روپے
جنوری	2010ء
پبلشرز	ماہنامہ آتش فشاں، 78 ستلج بلاک علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور پوسٹ بکس 162 لاہور موبائل: 0333-4332920
پرنٹرز	مکتبہ جدید پریس، لاہور



حسین شہید سہروردی کے نام

1962ء کی قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر اور دیرینہ مسلم لیگی یوسف خٹک کے بقول:

''سہروردی صاحب نے مجھے ایک نہیں دو مرتبہ کہا تھا کہ آپ ایوب خاں سے کہیں کہ میں مرنے سے پہلے پاکستان کے لئے ایک آخری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک CONSTITUTIONAL SETTLEMENT (آئینی تصفیہ) ہو جائے۔ ورنہ میرے بعد کوئی ایسی شخصیت نہیں ہوگی جو یہ خدمت انجام دے سکے۔ میں ایوب خاں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں پاکستان میں نہ رہوں تو اس کے بعد جب تک ایوب خاں صدر رہوں میں ملک سے باہر چلا جانے کیلئے بھی تیار ہوں۔ بلکہ وہ اگر دوسری مرتبہ بھی صدر منتخب ہونا چاہیں تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں پاکستان کے لئے یہ آخری خدمت انجام دے دوں کیونکہ میں دل کا مریض ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ اب میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا۔ لیکن میں پاکستان کے لئے یہ آخری خدمت انجام دینا چاہتا ہوں۔ اور مجھے کچھ نہیں چاہئے''۔

قائداعظم کے پاکستان کے ایکے اور یکجائی کی یہ سہروردی پیش کش حاکم وقت ''فیلڈ مارشل'' جنرل محمد ایوب خاں نے مسترد کر دی۔



قائداعظم محمد علی جناح

فہرست

تصاویر

پیش لفظ

''قائداعظمؒ۔۔اعتراضات اور حقائق'' کے وجود کے محرک قائداعظمؒ کے ایک اے ڈی سی مسٹر عطا ربانی کی 313 صفحاتی کتاب The Sun Shall Rise کے سوا تین کے قریب وہ صفحات ہیں، جنہیں مصنف نے Three mistakes by Mr.Jinnah (مسٹر جناح کی طرف سے سرزد ہونے والی تین غلطیاں) کی ضمنی سرخی دے کر ان پر روشنی ڈالی ہے۔ اور انہیں قائداعظمؒ کی غلطیاں ثابت کرنے میں پوراز ور قلم صرف کر دیا ہے۔

سوا تین کے قریب یہ صفحات اس کتاب کا علیحدہ باب نہیں بلکہ باب اول کا حصہ ہیں، پھر بھی ان کا بڑا چرچا ہوا، اس لئے کہ ان میں بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کو ہدف بنایا گیا ہے اور ایسا کرنے والا وہ شخص ہے جو قائداعظمؒ کے تین اولین اے ڈی سیز میں سے ایک تھا۔۔ فلائٹ لیفٹننٹ عطا ربانی۔

عطا ربانی کی اس تصنیف کے متعلق مجھے ابتداً آگاہی تنویر قیصر شاہد کے روزنامہ ''ایکسپریس'' لاہور میں شائع ہونے والے ایک کالم سے ہوئی جس سے اندازہ ہوا، شائد پوری کتاب ہی ''قائداعظمؒ کی تین غلطیوں'' پر محیط ہے۔ بہر حال، اخبارات میں اس پر بحث چھڑی، لیکن کسی طرف سے ٹھوس مؤقف نہ اپنایا گیا۔ ایک طرف ضد دوسری طرف عقیدت حاوی رہی۔ بالخصوص روزنامہ نوائے وقت لاہور میں یہی کیفیت تھی۔ نوائے وقت کے حوالے سے یہ بات حیرت آفرین رہی کہ 19 اپریل 2009ء کے شمارے میں اس کتاب پر بڑا ہی تعریفی تبصرہ کیا گیا اور اسے ریسرچ کرنے والوں کے لئے ایک مستند تاریخ کا درجہ دیا گیا۔ Three Mistakes by Mr.Jinnah کے حوالے سے یہاں تک لکھا گیا: ''اس کتاب میں جہاں پاکستان، جمہوریت اور قائداعظمؒ سے محبت کرنے والوں کے لئے بہت کچھ ہے وہیں قائداعظمؒ کے نقادوں کے لئے اسی باب میں تین سب ہیڈ ینگز کی صورت میں اپنی ضرورت کا سامان میسر ہے''۔ تبصرے کا تمت بالخیر ملتجیانہ انداز میں اس طرح کیا گیا: ''عطا ربانی صاحب اپنی زیر نظر کتاب میں قائداعظمؒ کی غلطیوں کے حوالے سے نہ لکھتے تو بہتر تھا''۔ یوں تبصرہ نگار نے عطا ربانی کی طرف سے بیان کی گئی یہ غلطیاں درست تسلیم کیں۔

روزنامہ جنگ لاہور میں ریاض احمد سید نے اپنے کالم ''سفارت خانہ'' کے تحت ''کیا ہم قائداعظمؒ کو معاف نہیں رکھ سکتے'' میں مسٹر عطا ربانی کی اس کتاب کا بھی نوٹس لیا۔ 4 فروری 2009ء کو پہلی قسط میں لکھا: ''ان کے اردل میں رہنے والے ادنیٰ وردی پوش ان کی غلطیاں پکڑتے ہیں''۔ 7 فروری 2009ء

کو شائع ہونے والی دوسری قسط مسٹر عطا ربانی کے حوالے سے براہ راست مبر اتھی۔ ربانی صاحب کا جواب 11 فروری 2009ء کے روزنامہ جنگ لاہور میں چھپا، جس میں انہوں نے اپنے آپ کو راست قرار دینے کی پوری کوشش کی اور یہ بھی لکھا: '' کسی کے بیان سے صرف ایک بات کو اچک کر سیاق و سباق کے حوالے کے بغیر اس سے ناجائز انتفاع ہرگز قرین انصاف کی بات نہیں..... میں شرطیہ یہ بات کہتا ہوں کہ کتاب کو پڑھنا یا ان ''غلطیوں'' سے متعلق اس کے باب کو سمجھ کر پڑھنا تو ایک طرف رہا ان بے خبر نکتہ چینوں نے اس کتاب کو دیکھا تک نہیں ہے اور یہ بات عام قارئین کو گمراہ کرنے کے مترادف ہے''۔

عطا ربانی صاحب کا یہ موقف خاصا درست ہے، کیونکہ ہمارے ہاں یہی رواج ہے۔ نہ پڑھنا، نہ دیکھنا، نہ بھالنا۔ کسی نے سیاق و سباق سے ہٹ کر ایک بیان مخالفت میں ایسا داغا کہ پیشہ ور بیان بازوں کو اخبارات میں نام چھپوانے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا۔ موصوف کو ''قائداعظمؒ--اعتراضات اور حقائق'' سے یہ شکوہ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ انہوں نے جن تین فیصلوں یا اقدامات کو گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کی غلطیاں قرار دیا ہے، میں نے نہ سیاق و سباق سے ہٹ کر بات کی ہے اور نہ ہی بغیر پڑھے قلم اٹھایا ہے بلکہ موصوف کی ایک ایک سطر کا جائزہ لیا ہے۔

مسٹر عطا ربانی نے یہ تین فیصلے قائداعظمؒ کی غلطیاں قرار دیئے ہیں: اولاً: غلام محمد کو پاکستان کا وزیر خزانہ نامزد کرنا۔ ثانیاً: حکم عدولی کرتے ہوئے کشمیر میں فوج نہ بھیجنے کے باوجود قائم مقام انگریز کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو برطرف نہ کرنا اور نہ ہی اس کا کورٹ مارشل کرنا بلکہ قائداعظمؒ کا الٹا اسے مستقل کمانڈر انچیف مقرر کر دینا۔ ثالثاً: ڈھاکہ جا کر جلسۂ عام میں اردو کو پاکستان کی قومی زبان ڈیکلیئر کرنا۔

ان الزامات کا جواب میں نے اخبار میں چھپوانے کے خیال سے لکھنا شروع کیا، لیکن اس کی طوالت اس کے کتاب بنانے کی متقاضی ہوئی۔ قائداعظمؒ پر مختلف حوالوں سے جو اعتراضات کئے جاتے رہے یا بعض معاملات کے بارے میں ان کی نادرست تصویر پیش کی جاتی رہی، جن جن کے میں بعض قومی اخبارات میں جواب دیتا رہا، ان میں سے تیرہ مضمون، بعض کے ناؤں کتابی تقاضے کے تحت بدل کر، اور بعض کا سراپا مزید بھرپور اور معلوماتی کر کے اس کتاب کا حصہ بنا دیا ہے۔ چودھواں اور آخری عنوان ''قائداعظمؒ کی تین غلطیاں--ایک نیا شگوفہ'' ہے جس میں مسٹر عطا ربانی کے مؤقف مذکور کی جانچ اور پرکھ کی گئی ہے۔ 56 صفحات پر محیط یہی طویل ترین تحریر ہے اور یہی اس کتاب کے ظہور کا سبب۔

لاہور-16 اگست 2009ء

منیر احمد منیر

جناح سے قائداعظمؒ

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی پر پچھلے دنوں پاکستان ٹیلی ویژن نے ''جناح سے قائداعظمؒ'' کے عنوان سے گیارہ قسطوں میں ایک ڈرامہ ٹیلی کاسٹ کیا ہے، جو کئی پہلوؤں سے قائداعظمؒ جیسے بطل جلیل کی شاندار زندگی سے لگا نہیں کھاتا۔ سکرپٹ پر کماحقہٗ محنت نہیں کی گئی اور اسے جس بددلی سے پروڈیوس کیا گیا ہے اس نے اس عنوان کا مبیح تہس نہس کر دیا ہے۔

جو چیز فوری طور پر کھٹکتی ہے وہ اس کا بلیک اینڈ وائٹ ہونا ہے۔ اس چیز نے اس کی جاذبیت کو بری طرح متاثر کیا ہے، کیونکہ رنگین ہونے کی صورت میں اشخاص اور اشیا کی تفصیلات زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ ویسے بھی یہ دور کلر کا ہے۔ اگرچہ ڈرامے کے کارپردازوں نے اس ضمن میں اخبارات میں اس بودی دلیل کا سہارا لیا کہ ایسا اس دور کا تاثر برقرار رکھنے کے لئے کیا گیا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ کے دور میں پھولوں کا رنگ سیاہ ہوتا تھا؟ ملبوسات، عمارتیں اور دیگر اشیا سیاہ و سفید ہوتی تھیں؟ حیرت ہے کہ آٹھویں صدی کے جرنیل محمد بن قاسم پر تو ڈرامہ کلر میں بنایا جاتا ہے، جس سے اس کا تاثر دوچند ہو جاتا ہے جبکہ بیسویں صدی کے قائداعظمؒ کی زندگی پر مبنی ڈرامہ ''جناح سے قائداعظمؒ'' کو بلیک اینڈ وائٹ کی نذر کر کے اس کا صوری تاثر زیروزبر کر دیا جاتا ہے۔

دوسرے، کئی مقامات پر واقعاتی صحت کا بالکل دھیان نہیں رکھا گیا۔ جگہ کی کمی کے باعث میں زیادہ تفصیل میں نہیں جا رہا، صرف چند ایک واقعات کی نشاندہی کر رہا ہوں۔ مثال کے طور پر قائداعظمؒ کی شروع زمانے کی تصاویر ہمیں بتاتی ہیں کہ وہ مونچھیں رکھتے تھے۔ 1916ء کے لکھنؤ سیشن کے موقع پر بھی ان کی مونچھیں بدستور موجود تھیں۔ اس سیشن کی تصاویر کئی کتابوں میں چھپ چکی ہیں اور اخبارات میں بھی کبھی کبھار کوئی تصویر نظر آ جاتی ہے۔ لیکن ڈرامے میں لکھنؤ سیشن کے موقع پر قائدؒ کو بغیر مونچھوں کے دکھایا گیا ہے، اگر اس موقعہ کی تصاویر کو پیش نظر رکھا جاتا تو قائد کے سراپے کے ساتھ ساتھ اس انداز کا سٹیج بنانے میں بھی بڑی مدد مل سکتی تھی۔

لاہور کے ایک ہندو پبلشر راج پال نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے شان میں ایک گستاخانہ کتاب

شائع کی تھی ۔اس کتاب کا مصنف چمپو متی لال تھا،بعض کے نزدیک وہ نہیں مہاشہ کرشن اس کا مصنف تھا۔
بہر حال، لاہور ہی کے ایک نوجوان علم دین نے ، جو بعد میں غازی اور شہید کہلائے ،اس گستاخانہ کتاب کے پبلشر راج پال کو واصل جہنم کیا۔سیشن کورٹ نے انہیں پھانسی کی سزا سنائی۔سیشن کے اس فیصلے کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں اپیل کی گئی۔ اپیل میں غازی علم دین کی طرف سے قائداعظمؒ کو وکیل کیا گیا۔
یہ 1929ء کا واقعہ ہے۔اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غازی علم دین نے کسی بھی مرحلے پر قتل کا اقرار نہیں کیا۔ وہ سیشن کورٹ میں بھی قتل سے انکاری رہا لیکن یہاں یہ جملہ بڑا مشہور رہا، یا مشہور کر دیا گیا کہ قائداعظمؒ نے انہیں کہا تھا،''تو ایک دفعہ کہہ دے کہ میں نے قتل نہیں کیا پھر تجھے بچانا میرا کام''۔
افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس خلافِ حقیقت جملے اور واقعہ کو ڈرامے میں اس طرح پیش کیا گیا کہ قائداعظمؒ کی طرف سے ان کا جونیئر وکیل اور ملک برکت علی جیل میں جا کر غازی علم دین سے ملاقات کر کے کہتے ہیں،تو ایک دفعہ کہہ دے کہ میں نے قتل نہیں کیا۔ وہ جواب میں ایسا کرنے سے انکار کرتے رہے۔ پھر قائداعظمؒ کا یہی جونیئر وکیل اور ملک برکت علی علامہ اقبالؒ سے ملاقات کرتے ہیں کہ وہی علم دین کو انکار پر آمادہ کریں تاکہ اس کی جان بچائی جا سکے۔ علامہ اقبالؒ ایسا کرنے سے صاف انکار کرتے ہیں بلکہ وہ اس دورکنی وفد سے کہتے ہیں:''اسی گلاں کردے رئے تے ترخاناں دا منڈا بازی لے گیا''(ہم باتیں ہی کرتے رہ گئے اور بڑھئیوں کا بیٹا بازی لے گیا)۔ ڈرامے میں پیش کی گئی یہ ساری تفصیل سراسر خلاف واقعہ ہے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ غازی علم دین نے ابتدائی تفتیش اور پھر سیشن میں یہی مؤقف اختیار کیا کہ اس نے راج پال کو قتل نہیں کیا۔اس کی خاصی تفصیل لاہور ہائی کورٹ کے ریکارڈ میں بھی موجود ہے۔
اب ہم اس مقدمے کے دوسرے اور حقیقی پہلو کی طرف آتے ہیں: قائداعظمؒ سیشن میں یعنی ٹرائل کورٹ میں غازی علم دین کے وکیل نہیں تھے۔ وہ ہائی کورٹ یعنی اپیلٹ کورٹ میں اس کی طرف سے پیش ہوئے تھے۔ اپیلٹ کورٹ میں صرف ٹرائل کورٹ کے فیصلے پر تنقید ہوتی ہے،کوئی گواہ پیش نہیں کیا جاتا۔ ہائی کورٹ (اپیلٹ کورٹ) میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ ماتحت عدالت کا فیصلہ ریکارڈ پر موجود شہادتوں کی روشنی میں قانون کے مطابق ہے کہ نہیں۔فوجداری مقدمے میں وہاں نہ ملزم پیش ہوتا ہے نہ اس کا بیان لیا جاتا ہے۔ یہ ساری کارروائی ماتحت عدالت میں مکمل ہو جاتی ہے۔تو پھر قائداعظمؒ علم دین سے کیسے یہ کہہ سکتے تھے:''تو ایک دفعہ کہہ دے کہ میں نے قتل نہیں کیا پھر تجھے بچانا میرا کام''۔جسٹس منیر نے ایک دفعہ قائداعظمؒ کے ساتھ اپنی ملاقاتوں کی تفصیل بتاتے ہوئے مجھے بتایا، قائداعظمؒ کا مؤقف یہ تھا، اگر علم دین سیشن کورٹ میں راج پال کے قتل سے انکار نہ کرتا تو اسے سزائے موت نہ ہوتی کیونکہ

اشتعال میں قتل کرنے پر سزائے موت نہیں ہوتی۔ یوں وہ پوائنٹ جو علم دین کے حق میں جاتا تھا اس نے مسلسل انکار سے ضائع کر دیا۔

اپیلٹ کورٹ (ہائی کورٹ) میں قائداعظمؒ کے دلائل سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے اقرار اور انکار پر بحث نہیں کی بلکہ صرف اس کی کم عمری کی بنیاد پر عدالت سے سزا میں تخفیف پر زور دیا، جسے عدالت نے تسلیم نہ کیا اور غازی علم دین کی اپیل خارج کر دی۔ باقی رہی قائداعظمؒ کے جونیئر وکیل اور ملک برکت علی کی علامہ اقبالؒ سے ملاقات، تو درج بالا حقیقت پر مبنی تفصیل اس کی تردید کرتی ہے۔ جہاں تک علامہ اقبالؒ کے ان الفاظ ''اسی گلاں کردے رئے تے ترخاناں دا منڈا بازی لے گیا'' کا تعلق ہے وہ انہوں نے نجی محفلوں میں کہے تھے، جبکہ ''جناح سے قائداعظمؒ'' کے مصنف اور پروڈیوسر اسے خواہ مخواہ علم دین کیس میں گھسیٹ لائے ہیں۔

پھر ملک برکت علی مرحوم کو جس حلیئے میں دکھایا گیا وہ قطعاً اس سے مختلف تھا۔ ڈرامے میں انہیں پگڑی، موچھوں اور اچکن کے ساتھ دکھایا گیا، جبکہ وہ چکوال کے زمیندار نہیں بلکہ لاہور کے ایک نامور وکیل اور سیاستدان تھے اور بغیر داڑھی موچھ کے سوٹڈ بوٹڈ آدمی تھے۔ ڈرامہ لکھنے اور بنانے والوں نے صرف ملک برکت علی کی شخصیت سے ہی یہ ناروا سلوک نہیں کیا، بڑے بڑے اہم کرداروں کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے حتیٰ کہ اس پہلو پر بھی محنت نہیں کی گئی کہ کون سے موقع پر قائداعظمؒ نے کون سا لباس زیب تن کیا تھا۔ خیر،

1937ء کا تاریخی لکھنؤ سیشن دکھاتے ہوئے بھی بعض فاش غلطیاں کی گئی ہیں، مثلاً: دکھایا گیا ہے کہ قائداعظمؒ جلسہ گاہ میں نواب اسمٰعیل سے ان کی ٹوپی لے کر پہن لیتے ہیں جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قائداعظمؒ نے ان کی یہ ٹوپی جلسہ گاہ میں نہیں، اپنی قیام گاہ پر اوڑھی تھی۔ مرزا ابوالحسن اصفہانی اس کی چشم دید تفصیل یوں بیان کرتے ہیں:

> ''مسٹر جناحؒ ظاہر ہے راجہ صاحب ہی کے مہمان تھے اور اپنے پرانے دوست مرحوم مہاراجہ صاحب محمود آباد کی قیام گاہ محمود آباد ہاؤس قیصر باغ میں مقیم تھے۔ پہلے روز کے جلسہ عام کے شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے راجہ صاحب، چودھری خلیق الزماں اور میں، مسٹر جناحؒ کی قیام گاہ پر اس دن کے پروگرام پر نظر ڈالنے کی غرض سے جمع تھے کہ نواب اسماعیل خان بھی اسی دیوان خانہ نما برآمدے میں ہمارے ساتھ آ ملے۔ وہ حسب معمول بے عیب لباس میں ملبوس تھے اور ایک سیاہ سموری ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔
>
> ''مسٹر جناحؒ نواب صاحب کی اس ٹوپی کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھنے لگے کہ کیا وہ

اسے تھوڑی دیر کے لئے دے سکتے ہیں۔ نواب صاحب نے اپنی روائتی خوش خلقی سے ٹوپی مسٹر جناحؒ کو دے دی اور ان سے اسے پہننے کی درخواست کی۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ ان پر یہ کیسی لگتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مسٹر جناحؒ نے اسے پہن لیا اور جب انہوں نے دیکھا کہ ہم لوگ اس کی تعریف کر رہے ہیں تو وہ اٹھ کر ساتھ کی خوابگاہ میں چلے گئے اور وہاں ایک قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر ہماری رائے کا محاسبہ کرنے لگے کہ ٹوپی نہ صرف ان کے ٹھیک آئی بلکہ ان پر زیب بھی دیتی تھی۔

''دمنٹ کے بعد برآمدے میں واپس آئے۔ ہم میں سے کسی نے، نام کی کوئی اہمیت نہیں، یہ تجویز کی کہ وہ یہ ٹوپی پہنے رہیں اور اسی طرح اجلاس میں جائیں۔ انہوں نے یہ تجویز مان لی اور ہم سب جلسے میں چلے گئے۔ مجھے وہ مجمع ابھی تک یاد ہے۔ مجھے لوگوں کے مسکراتے ہوئے چہرے اب تک نظر آتے ہیں اور وہ زور شور کی تالیاں اور اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے، جو مسٹر جناحؒ کے داخل ہوتے وقت پنڈال کی فضا میں گونج اٹھے اور اب بھی سنائی دیتے ہیں۔ ڈائس، کرسیوں اور دریوں پر جتنے بھی لوگ بیٹھے تھے وہ سب کے سب سرگوشی کے انداز میں یا بآواز بلند اس ٹوپی کی اور شروانی کی، جسے مسٹر جناحؒ ایسی کسی تقریب میں پہلی مرتبہ زیب تن کئے ہوئے تھے، تحسین و آفرین کرنے لگے۔ اس سے انہیں خود بھی اتنی ہی خوشی اور مسرت ہوئی جتنی ہم سب کو۔

''لکھنؤ کا اجلاس ختم ہونے سے پہلے ہی شہر کے بہت سے نوجوان اور معمر لوگوں نے یہ ٹوپی پہننا شروع کر دی جو قائداعظمؒ کی بدولت راتوں رات مقبول ہو گئی تھی۔ کلاہ ساز بھی اس مقبولیت سے فائدہ اٹھانے میں پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے مختلف حیثیتوں کے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اصلی قراقلی اور نقلی کھال کی ٹوپیاں بنانا شروع کر دیں۔

''ہندوستان کی مسلم قوم نے بہت ہی قلیل عرصے میں یہ ٹوپی اختیار کر لی۔ چنانچہ مدورا کے مسلمانوں میں بھی یہ ایسی ہی مقبول ہوئی جیسی کہ مردان کے مسلمانوں میں''۔

(قائداعظم جناحؒ - جیسا میں انہیں جانتا ہوں - صفحہ 64، 65 پبلشر آتش فشاں لاہور - جون 94ء)۔

سیریل میں اس تاریخی واقعہ کو بھی حسب معمول سرسری انداز میں پیش کیا گیا ہے اور وہ بھی غلط

طریق پر۔

اسی طرح آل انڈیا مسلم لیگ کے تاریخی لاہور سیشن 1940ء میں جہاں قرارداد لاہور منظور ہوتی ہے سامعین سے ''بن کے رہے گا پاکستان'' کے پرجوش نعرے لگوائے گئے۔ حالانکہ قرارداد لاہور میں برصغیر کے مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن کا مطالبہ ضرور ہوا تھا لیکن اس وطن کا نام ابھی تجویز نہیں ہوا تھا۔ پاکستان کا نام نہ قرارداد میں ہے نہ قائداعظمؒ کی تقریر میں۔ قرارداد لاہور منظور ہونے کے بعد ہندو پریس نے طنزاً اسے پاکستان کا نام دے دیا اور اس تواتر سے کہ یہ نام زبان زد عام ہوگیا۔ بالآخر قائداعظمؒ نے بھی یہ نام اپنا لیا۔ اس لئے 1940ء کے لاہور اجلاس میں ''بن کے رہے گا پاکستان'' کا نعرہ لگوانا واقعاتی لحاظ سے بالکل غلط ہے۔

اس تاریخی اجلاس کے موقع پر قائداعظمؒ کیا لباس زیب تن کرتے رہے؟ تصاویر میں سب موجود ہے، اس کے باوجود لباس، ٹوپی اور جوتوں کا انداز اور رنگ مختلف دکھایا گیا ہے۔

بعض جگہ قائداعظمؒ عوام سے خطاب کرتے ہیں لیکن وہاں سامعین دکھانے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

یہ تو ڈرامے کی پہلی دس قسطوں کا طائرانہ جائزہ ہے جن میں قائداعظمؒ کا کردار شہریار جہانگیر نے ادا کیا ہے۔ اصل میں ان دس قسطوں کے سارے عیوب پر شہریار کی شخصیت نے پردہ ڈالے رکھا۔ وہ یقیناً ایک اچھا انتخاب تھا۔

آخری یعنی گیارہویں قسط میں ایک بوڑھے آدمی کو قائداعظمؒ کے روپ میں پیش کیا گیا جس کی آواز میں نہ وہ شان ہے نہ شخصیت میں وہ جلالت جو قائداعظمؒ کا وصف تھیں۔ اس بوڑھے مدثر شاہ کے ٹیڑھے میڑھے سیاہ دانت خاصی بدمزگی پیدا کرتے ہیں۔ یہ بوڑھا کردار قائدؒ کی رفیع الشان شخصیت سے قطعی محروم نظر آتا ہے۔ اس سے تو کہیں بہتر تھا کہ شہریار کو ہی بڑھاپے کے میک اپ کے ساتھ پیش کر دیا جاتا۔

ایک سین میں لیاقت علی خانؒ قائداعظمؒ سے ملنے کے لئے آتے ہیں اور ہاتھ باندھ کر بڑے مؤدب ان کے حضور کھڑے رہتے ہیں۔ پھر قائدؒ ہاتھ کے اشارے سے انہیں بیٹھنے کو کہتے ہیں۔ یہ بالکل واہیات بات ہے۔ کیونکہ قائدؒ اپنے رفقا کو بہت عزت دیتے تھے، بلکہ ہر ملنے والے کی بھرپور پذیرائی کرتے تھے۔ پھر لیاقت علی خانؒ تو ان کے دست راست تھے۔ ان سے بھی ان کا رویہ ایسا نہیں رہا جیسا اس سین میں دکھایا گیا ہے۔

قائدؒ کا ایک طریقہ تھا کہ وہ اپنے مخاطب کو بالعموم اس کے نام سے پکارتے تھے۔ مثلاً: نواب زادہ

نہیں بلکہ لیاقت کہیں ے۔ وغیرہ، وغیرہ۔ یہاں وہ بار بار نواب زادہ صاحب کہتے ہیں۔

اس آخری قسط میں قائداعظمؒ کو بار بار کھانستے ہوئے دکھایا گیا ہے جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ انہیں ٹی بی ہے حالانکہ قائدؒ کے قریبی رفقا کو بھی اخیر وقت تک اس کا علم نہیں تھا کہ وہ ٹی بی جیسے مہلک مرض میں مبتلا ہیں۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ہندو ان کی موت کا انتظار کرے۔ یہ مجھے چودھری محمد حسین چٹھہ صاحب نے بتایا: ''قائداعظمؒ کی بیماری کے آخری ایام میں ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے ایک دفعہ مجھے بتایا کہ جب میں نے قائداعظمؒ کی تشخیص اور انہیں بتایا کہ آپ کو ٹی بی ہے تو وہ کہنے لگے، ڈاکٹر! یہ تو میں بارہ برس سے جانتا ہوں۔ صرف اس لئے ظاہر نہ کیا کہ ہندو میری موت کا انتظار نہ کرنے لگے''۔
(بحوالہ: پندرہ روزہ آتش فشاں لاہور، قائداعظمؒ نمبر۔ دسمبر 1976ء۔ صفحہ: 41)۔

اور ہندو لیڈروں نے ان کی وفات پر کہا بھی، بلکہ بعد میں مونٹ بیٹن نے بھی کہا کہ اگر ہمیں پتہ چل جاتا کہ انہیں مہلک مرض لاحق ہے تو ہمارے لئے مطالبۂ پاکستان ایک سال مؤخر کرنا کوئی مشکل نہ تھا۔ پھر پاکستان کبھی نہ بنتا جبکہ ڈرامے میں قائداعظمؒ کو ٹی بی کے مریض کی طرح کھانستے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مالابار کے حاجی عبدالستار حاجی اسحٰق سیٹھ 1920ء سے مسلم لیگ میں تھے۔ وہ سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی میں قائداعظمؒ کی انڈی پینڈنٹ پارٹی کے ممبر رہے۔ 37ء سے 47ء تک آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے رکن رہے۔ انہوں نے مجھے بتایا:

ہمیں بھی ان کے انتقال کے بعد پتہ چلا کہ انہیں ٹی بی جیسا مہلک مرض تھا حالانکہ میں 37ء سے 47ء تک آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا مسلسل ممبر رہا۔ رات کے دو دو بجے تک بھی اجلاس جاری رہتا تھا۔ ہمیں ایک بھی موقع پر ذرا سا بھی احساس نہیں ہوا کہ انہیں ٹی بی ہے۔ کھانستے تک نہ تھے۔ بخار کا بھی پتہ نہ چلتا۔ میں نے ایک موقع بھی ایسا نہیں دیکھا کہ وہ ذرا سا بھی کھانسے ہوں۔ انہیں اپنے اوپر اتنا کنٹرول تھا.....

چند برس قبل آئی ایس پی آر نے 65ء کی جنگ کے ایک ہیرو عزیز بھٹی شہید پر ایک ڈرامہ تیار کرایا تھا۔ ہر شاٹ پر خوب محنت کی گئی۔ اصل واقعات کو پیش نظر رکھا گیا اور اوریجنل جگہوں پر جا جا کے اسے ریکارڈ کیا گیا۔ لیکن بابائے قومؒ کے لئے شائدان کے پاس بجٹ ہی نہیں تھا۔ یہ ڈرامہ دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی لٹھ لے کے ان کے پیچھے پڑا تھا کہ جوں توں کر کے اسے سمیٹو۔ حالانکہ اگر انہوں نے اس موضوع کی ریکارڈنگ کا فیصلہ کر ہی لیا تھا تو پھر انداز بھی بھرپور اختیار کرنا چاہئے تھا۔ قائداعظمؒ کے آباؤ اجداد، ان کے خاندانی حالات، اس دور کے رسم و رواج اور قائداعظمؒ کی پیدائش سے لے کر

وفات تک اس قدر مطبوعہ مواد موجود ہے کہ قائداعظمؒ جیسی ہستی کے شایان شان ایک شاندار چیز وجود میں آ سکتی تھی جو موجودہ ہی نہیں آنے والی کئی نسلوں کے لئے رہنمائی، معلومات اور قوت محرکہ کا کام دیتی۔ چند برس قبل انڈین ٹی وی پر ''دی سورڈ آف ٹیپو سلطان'' چلی۔ اس کے بعد ''دی گریٹ مراٹھاز'' بھی چلی۔ انہوں نے ان موضوعات کا حق ادا کر دیا اگرچہ بعض باتوں میں انہیں فکشن کا سہارا لینا پڑا اور بعض امور کو ڈراماٹائز کرنا پڑا۔ لیکن یہاں تو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی، کیونکہ قائداعظمؒ کی نجی اور اجتماعی زندگی دانش، تدبر، معاملہ فہمی، اصول پسندی، سچائی، بیباکی، حریت پسندی اور اولوالعزمی کے ایسے ایسے عالی شان واقعات سے بھری پڑی ہے کہ اگر سکرپٹ پر مشقت کی جاتی اور اسے پروڈیوس کرتے وقت جان کھپا دی جاتی تو نئی نسل پر اس عظیم الشان لیڈر کی عظمت کے کئی پہلو اجاگر ہوتے۔ وہ لیڈر جو کردار کی پختگی اور فراست وبصیرت کی فراوانی میں بھی دنیا بھر کے سیاسی لیڈروں میں سب سے نمایاں ہے اور نمایاں رہے گا۔

ان سے تو مصنف اشفاق احمد اور پروڈیوسر بختیار احمد کا ڈرامہ ''قائداعظمؒ'' جو 25 دسمبر 1997ء کو چلا، بازی لے گیا ہے۔ بازی کیا لے گیا ہے ایک ہی قسط میں ایسا زوردار تاثر چھوڑ گیا ہے جس کی گونج عرصے تک قائم رہے گی بلکہ اس ڈرامے کے مرکزی کردار فردوس جمال کا اخبارات میں بیان تھا کہ جب میں اس ڈرامے میں کام کر رہا تھا مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ قائداعظمؒ کی روح میرے اردگرد موجود ہے۔ جبکہ ''جناح سے قائداعظمؒ'' بنانے والوں کو اس کا ادراک ہی نہیں ہو سکا کہ وہ جس رفیع الدرجات ہستی پر کام کر رہے ہیں اس کی اہمیت یہ ہے کہ جب تک ستاروں میں چمک، چاند میں روشنی، سورج میں تپش، گلوں میں مہک اور کرۂ ارض پر زندگی کی بہار موجود ہے قائداعظمؒ کا نام گونجتا رہے گا۔

(روزنامہ ''دن'' لاہور 12، 13 جنوری 1998ء)



اپریل 1948ء۔ گورنر ہاؤس پشاور۔ قائداعظمؒ اور خان عبدالغفار خاں کے درمیان ملاقات

قائداعظمؒ، عبدالغفار خاں اور اتمان زئی

تاریخ کا چہرہ اس وقت بگڑتا ہے جب ہم اپنی خواہشات اور تمناؤں کی موافقت میں اس کا توڑ مروڑ کرتے ہیں۔ یہ روش بڑی قدیم ہے۔ تقریباً اتنی ہی قدیم جتنی کہ انسانی تاریخ۔ اگرچہ اس وسواس میں مبتلا افراد یا گروہ خود فریبی کا شکار ہوتے ہیں پھر بھی انہیں شک کے فائدے کا سزاوار قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ تاریخ کو اپنے اینگل سے دیکھنے اور مرتب کرنے کا کام وہ غیر ارادی طور پر نہیں، شعوری، ارادی اور بقائمی ہوش و حواس کرتے ہیں۔ مقصد کنفیوژن پیدا کرنا اور اس کنفیوژن کے نتیجے میں اپنی مرضی کے نتائج ترتیب دینا ہوتا ہے۔ مثلاً سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں خود بھی یہی کہتے رہے اور ان کے پیروکار بھی مسلسل یہی بات دہرا رہے ہیں کہ انگریز کو ہندوستان سے ہم نے نکالا۔ گزشتہ دنوں عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کے رہنما اجمل خٹک نے چارسدہ میں ایک جلسہ عام میں کہا: ''ہندوستان کو آزاد کرا کے فرنگی کو نکال دیا۔ تاریخ میں ہمارے جتنی قربانیاں کسی نے نہیں دیں۔ ہم نے فرنگی کو نکال کر بھگا دیا ہے''۔

متحدہ ہندوستان ایک براعظم کا درجہ رکھتا تھا۔ آپ اتنے بڑے ملک کے ایک چھوٹے سے صوبے میں جاگزین تھے۔ اور پورا کیا ایک چوتھائی صوبہ بھی آپ کا اس انداز میں کبھی پیروکار نہیں رہا کہ وہ آپ کے اشارے سے انگریز حکمرانوں کے لئے پرابلم بنتا۔ آپ کوئی تو ایسی تحریک بتائیں جو آپ نے شروع کی اور جس سے انگریز واقعی اس قدر پریشان ہوا کہ اس نے ہندوستان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایسی تحریکیں چلی ہیں اور ایسے واقعات ہوئے ہیں لیکن برصغیر کے دوسرے حصوں میں جن کے نتیجے میں انگریز واقعی زچ ہوا۔ ایک طرف تو آپ انگریز دشمنی کا بڑا کریڈٹ لیتے ہیں، دوسری طرف جب پاکستان کا قیام ناگزیر ہو گیا تو اسی انگریز کے کہنے پر پختونستان کا شوشہ چھوڑتے ہیں۔ اور آج تک اس غیر منطقی، غیر اخلاقی، غیر جمہوری، غیر انسانی اور سب سے بڑھ کر غیر پاکستانی نعرے کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں۔ یہ ہے آپ کی انگریز دشمنی اور یہ ہے آپ کا تاریخ مسخ کرنے کا انداز۔

اب میں اجمل خٹک کے بیان کے اس حصے کی طرف آتا ہوں جو اس تحریر کا محرک بنا۔ وہ کہتے ہیں۔

''ان لوگوں کے لئے قائداعظمؒ جو کچھ بھی ہو لیکن ہمارے لئے بے وعدہ ہے، کیونکہ اس نے باچا خاں سے کراچی میں وعدہ کیا اور پھر مکر گیا۔ کراچی میں باچا خاں سے وعدہ کر کے ان کے ہاں آنے کو کہا۔ 18 میل تک سرخپوش جناح اور اس کی بہن کے استقبال کے لئے کھڑے رہے لیکن انگریز اور خان قیوم کے کہنے پر جناح بے وعدہ ہو کر نہ آیا اور جب کرسی دیکھی تو بیٹھ گیا''۔ (حوالہ: روزنامہ خبریں لاہور۔ 13 اگست 1999ء)

قائداعظمؒ کو برصغیر کے ہی نہیں دنیا بھر کے سیاسی لیڈرروں پر یہ فوقیت بھی حاصل رہی کہ وہ جو بات ایک دفعہ کہہ دیتے تھے اٹل ہوتی تھی۔ ان کا کٹر سے کٹر دشمن بھی یہ جانتا اور مانتا ہے کہ وہ وعدے کے بھی اس قدر پکے تھے کہ دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے، قائداعظم محمد علی جناحؒ اپنا قول نہیں ہارتے تھے۔ برصغیر کی سیاسی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ قائداعظمؒ جو ایک بار طے کر لیتے تھے اس سے رتی بھر انحراف کی بھی گنجائش نہ رہتی تھی۔ جبکہ آج اجمل خٹک کہتے ہیں: ''انگریز اور خان قیوم کے کہنے پر جناح بے وعدہ ہو کر نہ آیا''۔

اے این پی والے بڑی دیر سے یہ واویلا کر رہے ہیں کہ غفار خاں نے قائداعظمؒ کو اپنے گھر اتمان زئی آنے کی دعوت دی، جو انہوں نے قبول کر لی لیکن عین وقت پر انہوں نے اس وقت کے وزیراعلیٰ سرحد خان عبدالقیوم خاں کے کہنے پر اس سے پہلوتہی کی۔ اس سلسلے میں میری کئی متعلقہ افراد اور لیڈروں سے گفتگو ہوئی۔ ہر کسی نے واقعات وشواہد سے ان کے اس مؤقف کو غلط قرار دیا۔ یہاں میں صرف یوسف خٹک کے بیان کا حوالہ دے رہا ہوں جو اس وقت، جب قائداعظمؒ بطور گورنر جنرل اپریل 48ء میں سرحد کے دورے پر آئے، سرحد پراونشل مسلم لیگ کے آرگنائزنگ سیکرٹری جنرل تھے:۔

س..... جب قائداعظمؒ گورنر جنرل آف پاکستان کی حیثیت سے اپریل 1948ء میں صوبہ سرحد کے دورے پر آئے تو ولی خاں وغیرہ کا کہنا ہے کہ اتمان زئی میں غفار خاں سے ان کی ملاقات ہو رہی تھی، قیوم خاں نے ملنے نہ دیا۔

ج آپ یقین کر سکتے ہیں کہ قائداعظمؒ کو کوئی روک سکتا تھا۔ قائداعظمؒ کو کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ قیوم خاں کو یہ جرأت ہو سکتی تھی کہ وہ قائداعظمؒ کو یہ کہنے کی جرأت کر سکتا۔ اور اگر وہ کہتا تو وہ مان جاتے۔ یہ نہیں تھا کہ قائداعظمؒ غفار خاں سے ملے نہیں تھے۔ ان سے ملے تھے۔ ان کے ساتھ باتیں بھی کی تھیں۔ اسمبلی (کراچی) میں بھی ان سے ملے تھے۔

س سنا ہے گورنر ہاؤس پشاور میں مذاکرات ہوتے رہے؟

ج ہاں ہوتے رہے۔ اگر قیوم خاں ایسی بات کرتے تو قائداعظمؒ بتا سکتے تھے۔ اخبارات میں

بیان دے سکتے تھے۔ خط لکھ سکتے تھے کہ قیوم خاں نے تمہارے تک پہنچنے نہیں دیا۔ لیکن انہوں نے عبدالغفار خاں سے ملاقات کی۔(حوالہ:''سیاسی اتار چڑھاؤ''۔ جولائی1989۔صفحہ 221،222)۔

قائداعظمؒ جس چیز کو ملک اور قوم کے لئے بہترین خیال کرتے اس سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ متحدہ ہندوستان کے آخری انگریز وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یہ خواہش تھی کہ آزادی کے بعد اسے دونوں ملکوں، بھارت اور پاکستان، کا مشترکہ گورنر جنرل بنایا جائے۔ بھارت نے تو اسے اپنا گورنر جنرل قبول کرلیا، قائداعظمؒ کے نزدیک اس کا پاکستان کا گورنر جنرل بننا خطرناک تھا، اس لئے وہ اس پر ڈٹ گئے۔ خود مونٹ بیٹن یہ کہتا ہے:''میں نے مسٹر جناحؒ سے کہا کہ آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ آپ کی ایک ناں(NO) سے کیا نقصان ہوگا۔ انہوں نے (قائداعظمؒ نے) جواب دیا، ہاں میں سمجھتا ہوں بہت سارے اثاثے خطرے میں پڑ جائیں گے۔ میں نے انہیں کہا کہ بہت سارے نہیں سارے اثاثے خطرے میں پڑ جائیں گے''۔(ایضاً۔سرظفراللہ خاں سے انٹرویو۔صفحہ 55)

گویا جوارادہ کرلیا اس پر اس قدر پختہ تھے کہ پاکستان کے حصے کے سارے اثاثوں کا معرضِ خطر میں پڑ جانا قبول کرلیا، لیکن قوم کے مفاد میں کیا گیا فیصلہ اور ارادہ تبدیل نہیں کیا۔

اگر قائداعظمؒ کا اتمان زئی جانا ملک اور قوم کے مفاد میں تھا تو وہ ملک جس کے وہ بانی تھے، اور وہ قوم جسے انہوں نے بنایا اور سنوارا تھا اس کی بہتری میں وہ اتمان زئی کیوں نہ گئے؟ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وعدے کے باوجود قائداعظمؒ نے اتمان زئی نہ جانے کے متعلق کیا جواز پیش کیا؟ یہ لوگ آج تک یہ نہیں بتا سکے۔ اور یہ بات قائدؒ نے کس کو بتائی کہ انہیں وہاں جانے سے انگریز اور خان قیوم نے روکا ہے۔ ظاہر ہے غفار خاں کو تو نہیں بتائی۔ اور وہ کون تھا جس سے وہ اس قدر راز کی بات کہہ ڈالتے تھے۔ اور اگر کوئی تھا بھی تو کیا وہ اے این پی والوں کے بھی اتنا ہی قریب تھا جتنا وہ قائدؒ کے قریب تھا، جس نے ان سے سنا اور آ کے انہیں بتا دیا۔

اس سلسلے میں اے این پی والے یہ دلیل دیتے ہیں کہ قائداعظمؒ کو ڈرایا گیا کہ انہیں بہانے سے اتمان زئی بلا کر ہلاک کر دیا جائے گا۔ جب میں نے ایک دفعہ ولی خاں سے پوچھا کہ آپ کا کیا خیال ہے کہ قائداعظمؒ کو کوئی اس طرح خوفزدہ کر سکتا تھا تو انہوں نے کہا:''بات دراصل یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے ہی ہندوستان میں گاندھی کے قتل کا واقعہ ہو چکا تھا اس لئے قائداعظمؒ محتاط ہو گئے''۔

مجھے ان کے سیکورٹی آفیسر نے بتایا کہ اس نے انگریز گورنر کے ساتھ بھی کام کیا۔ قائدؒ کے بعد بھی وہ اس ڈیوٹی پر رہا لیکن قائداعظمؒ جیسا انسان اس نے نہیں دیکھا۔ موت سے تو وہ بالکل نہیں ڈرتے تھے۔

میں اس کے طویل انٹرویو میں سے زیادہ تفصیل یہاں نہیں دے سکتا کیونکہ وہ میری زیرِتحریر کتاب ''دی گریٹ لیڈر'' کا ایک انتہائی اہم باب ہے۔صرف اتنا لکھے دیتا ہوں کہ انہوں نے مجھے بتایا، ہم قائداعظمؒ کے علم میں لائے بغیر ان کی سیکورٹی کرتے تھے۔ سیکورٹی کے اہل کاروں کو میں چھپا کے رکھتا تھا کہ قائداعظمؒ کی ان پر نظر نہ پڑے۔ جب انہیں کوئی سپاہی نظر آ جاتا تو ناراض ہوتے: ''جب میری موت کا وقت آ جائے گا تو ایک ہزار سپاہی بھی میری جان نہیں بچا سکیں گے''۔

ان سے میں نے قائداعظمؒ کی غفار خاں کے ساتھ ملاقاتوں کے سلسلے میں ایک خصوصی سوال کیا تو ان کا جواب تھا: ''میں نے انہیں کبھی خوفزدہ نہیں دیکھا، وہ بالکل نہیں ڈرتے تھے''۔

جب یہ صورت تھی، قائداعظمؒ کو اتمان زئی جانے سے کوئی بھی خان قیوم کیسے روک سکتا تھا؟ اس وقت تو یہ صورتِ حال تھی کہ برصغیر پاک و ہند کا تقریباً ہر مسلمان بالخصوص اور عالم اسلام کا ہر مسلمان بالعموم مسلمانوں کے اس مسیحا پر نچھاور تھا۔ وہ موقعہ ذہن میں تازہ کریں جب کی یہ بات کرتے ہیں۔ قائداعظمؒ 11 اپریل 48ء کو پشاور جاتے ہیں۔ ان کا استقبال اس قدر والہانہ ہوتا ہے کہ پشاور کی تاریخ آج تک ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سرحد کے غیور پٹھانوں نے اپنے اس عظیم الشان محسن کے اعزاز میں وہ ہوائی فائرنگ کی کہ بے نظیر۔ جس کار میں قائداعظمؒ سوار تھے بار بار پھولوں سے بھر جاتی تھی۔ ان کو قریب سے دیکھنے کی خواہش میں پٹھان گاڑی کے آگے لیٹ جاتے تھے۔ عقیدت و محبت کا ایک طوفان امڈا ہوا تھا۔ اس کے مقابلے میں غفار خاں اور ان کے سرخ پوش عبرتناک شکست کے باعث پہلے ہی نیم مردہ ہو چکے تھے۔ اوپر سے سرحد کے پٹھانوں کا اپنے رفیع الشان قائدؒ کے لئے یہ جوش و خروش اور جذبات کا یہ والہانہ پن۔ ایسے میں نہ قائداعظمؒ کے اور نہ کسی اور کے ذہن میں اس چیز کا ذرا سا شائبہ بھی آ سکتا تھا کہ بنیاد پرست ہندو لیڈر موہن چند کرم داس گاندھی کا کوئی سرحدی پیروکار ان کی جان سے کھیلنے کا سوچ بھی سکے، جرأت کرنا تو بڑی بات ہے۔

26 جولائی 1943ء۔ ایک خاکسار رفیق صابر مزنگوی نے بمبئی میں قائداعظمؒ پر قاتلانہ حملہ کیا جو ناکام رہا۔ قائداعظمؒ نے پہلا کام یہ کیا، فوراً اخبارات میں یہ خبر نکلوائی کہ حملہ آور مسلمان تھا اور وہ بالکل خیریت سے ہیں۔ اس لئے کہ کہیں غلط فہمی میں مسلمان ہندوؤں کے کشتوں کے پشتے نہ لگا دیں۔ عقیدت، احترام اور جان نثاری کے حوالے سے جولائی 43ء والے قائداعظمؒ کے مقابلے میں اپریل 1948ء والا قائداعظمؒ کہیں زیادہ سربلند اور سرافراز ہو چکا تھا۔ اب وہ برصغیر کے مسلمانوں کو ایک ایسی مملکت دے چکے تھے جس سے دنیا میں ان کی توقیر اور منزلت تھی۔ ایک گورنر جنرل جس پر ملک کا ہر بچہ،

بوڑھا اور مرد و زن جان نچھاور کرنا سعادت سمجھتا ہو اس کی طرف کون ہے جو میلی آنکھ سے دیکھنے کا سوچ بھی سکے۔ اور جب گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ ہو تو معاملہ اور بھی جذباتی اور شدید ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ قائداعظمؒ غفار خانؒ سے ملاقات کے لئے اتمان زئی اس لئے نہیں گئے کہ انہیں جسمانی گزند پہنچنے کا خدشہ تھا بالکل واہیات سوچ ہے۔ جو شخص زندگی بھر موت سے بے نیاز رہا وہ ان حالات میں کیسے خوفزدہ ہو سکتا تھا جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ قائداعظمؒ کا اتمان زئی جانے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ گورنر جنرل یا سربراہ مملکت کی مصروفیات کا باقاعدہ اندراج ہوتا ہے۔ اس میں وقت، تاریخ، شخصیت سب کا ذکر ہوتا ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے پروگرام ملتوی یا منسوخ کرنا پڑے تو اس کی وجہ لکھی جاتی ہے۔ تو گورنر جنرل ہاؤس کے ریکارڈ سے اب بھی یہ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے کہ واقعی قائداعظمؒ اتمان زئی جا رہے تھے اور اگر نہیں گئے تو کیوں؟

اگر وقتی طور پر اسے درست بھی مان لیا جائے کہ قائداعظمؒ پروگرام کے باوجود غفار خاں کی دعوت پر اتمان زئی نہیں گئے تو اس سے کونسی قیامت ٹوٹ پڑی۔ پروگرام بنتے اور بوجوہ ملتوی یا منسوخ بھی ہوتے ہیں۔ تو آپ نے اس کا یہ حل ڈھونڈا کہ پندرہ پندرہ برس خودساختہ جلاوطنی میں افغانستان میں گزارنے شروع کر دیئے اور پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

بات دراصل وہی ہے، کنفیوژن پیدا کرنا اور پھر اپنی من مرضی کے خطوط پر تاریخ مرتب کرنا، لیکن تاریخ کے اوراق پر تعصب، تنگ نظری اور جانبداری کی یہ دھول بالآخر غیر جانبدار اور حق گو مورخ کے قلم کے آگے ٹھہر نہیں سکتی۔ اور ہر گوئبلز چاہے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لئے کتنا ہی سائنسی انداز اپنائے سچ کے آگے پرکاہ ہی ثابت ہوتا ہے۔

یہ لوگ ایک خودساختہ واقعہ لئے بیٹھے ہیں جبکہ قائداعظمؒ کی غفار خاں کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ میں 3 جون 1947ء کے آزادی پلان کے بعد کی ملاقاتوں کا ذکر کر رہا ہوں۔ 18 جون 47ء کو قائداعظمؒ اور غفار خاں کی دہلی میں ملاقات ہوتی ہے جس میں مذکورہ برطانوی پلان کی روشنی میں صوبہ سرحد کے معاملات پر غور کیا گیا۔ یہ ملاقات نصف گھنٹہ رہی۔ اس موقعہ پر گاندھی اور لارڈ اسمے بھی موجود تھے۔ اسی روز شام کے وقت خان عبدالغفار خاں 10 - اورنگ زیب روڈ پر جا کر قائداعظمؒ سے ملاقات کرتے ہیں۔ یہ ملاقات ڈیڑھ گھنٹہ رہی۔ اس ملاقات کے اختتام پر قائداعظمؒ نے نامہ نگاروں سے کہا: ''ہمارے درمیان آزادانہ بے باک گفتگو ہوئی''۔ اس ملاقات کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ گاندھی نے اپنے عبادتی جلسہ میں اس کے متعلق کہا: ''آپ سب میرے ساتھ مل کر دعا کریں کہ خان عبدالغفار خاں اور قائداعظمؒ کی ملاقات کامیاب ہو''۔ گاندھی کی دعا شائد دل سے نہیں نکلی تھی اس لئے نہ اس میں اثر تھا

اور نہ طاقتِ پرواز۔

اس کے بعد کراچی میں ملاقات ہوئی۔ پشاور میں مذکورہ دورے کے موقعہ پر ملاقات رہی۔

19 اپریل 1948ء۔ پشاور کے شہریوں نے اسمبلی ہال پشاور کے لان میں قائداعظمؒ کے اعزاز میں گارڈن پارٹی دی۔ عزیز جاوید اپنی تصنیف ''قائداعظمؒ اور سرحد'' میں ملک الرحمٰن کیانی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ ہاؤس کے گیسٹ ہاؤس میں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا۔ جب جلسے کے اختتام پر سرحد صوبہ مسلم لیگ کے صدر خان ثمین جان خاں نے قائداعظمؒ کے ساتھ ان کی خان عبدالغفار خاں کے ساتھ ملاقات کا ذکر کیا: ''قائداعظمؒ نے ثمین جان خاں کے الفاظ سنتے ہی فرمایا: ''خان عبدالغفار خاں ہمارا بھائی ہے۔ ہم اسے سینے کے ساتھ لگانے کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ وہ پاکستان کی ترقی اور تعمیر کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ میرا کہنا مان لیں''۔ (صفحہ 245۔ پبلشر: ادارہ تحقیق و تصنیف پشاور)۔

خان عبدالغفار خاں نے قائداعظمؒ کا کہا نہ مانا جس پر 20 اپریل 1948ء قائداعظمؒ کو کننگھم پارک (اب جناح پارک) پشاور کے جلسۂ عام میں کہنا پڑا، میں نے پوری کوشش کی کہ یہ لوگ کسی طرح راہِ راست پر آ جائیں لیکن یہ اس کے لئے تیار نہیں۔ ان پر کبھی اعتبار نہ کرنا۔

(روزنامہ ''پاکستان'' لاہور۔ 23 اگست 1999ء)

قائداعظمؒ
مسلمانوں کی تقسیم نہیں
مسلمانوں کے لئے ہندوستان کی تقسیم چاہتے تھے

اخباری اطلاعات کے مطابق بلوچستان کے سینئر وزیر مولانا امیر زمان اور جمعیت طلبائے اسلام کے صوبائی صدر سید عزت اللہ شاہ نے لورالائی میں جمعیت طلبائے اسلام کے گورنمنٹ ڈگری کالج یونٹ کے کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے: ''قیام پاکستان کے وقت پاکستان کے بانی نے تقسیم کے دوران مسلمانوں کے ساتھ غداری کر کے نصف سے زیادہ مسلمانوں کو انڈیا میں چھوڑ دیا''۔

(روز نامہ خبریں لاہور۔ 25 اگست 1999ء)۔

یہ سوچ صرف بلوچستان کے مولانا امیر زمان تک ہی محدود نہیں بلکہ جس سیاسی مکتبۂ فکر سے ان کا تعلق ہے اس کا تقریباً ہر فرد قائداعظمؒ اور پاکستان کے خلاف ہرزہ سرائی اپنا فرض سمجھتا ہے۔ اس تعصب اور تنگ نظری میں وہ اس شدومد سے مبتلا ہیں کہ تاریخی حقائق اور واقعات ان کے لئے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتے۔ جبکہ تاریخی حقائق یہ ہیں، قائداعظمؒ نے جس پاکستان کے لئے جدوجہد کی اس میں پورا بنگال، پورا پنجاب، آسام، سندھ، سرحد اور بلوچستان شامل تھے۔ اس صورت میں وہ ہندو مسلم آبادیوں کے مکمل تبادلہ کے لئے بھی تیار تھے۔ لیکن انگریز حکمرانوں اور ہندو کانگریس کے گٹھ جوڑ نے مذکورہ علاقوں پر مبنی پاکستان کا تصور پورا نہ ہونے دیا۔ چنانچہ صوبوں کی تقسیم کے لئے سب سے پہلی آواز کانگریس کے پلیٹ فارم سے اٹھی۔ اس سلسلے میں 8 مارچ 1947ء کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز منظور کی۔ اس تجویز کے بعد ہندو قیادت ہندو مسلم تبادلۂ آبادی کے حق میں ہوگئی کیونکہ صوبوں کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کی مملکت پاکستان کا وہ نقشہ نہیں رہتا تھا جس کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ تگ و دو کر رہی تھی۔ اب انہیں قائداعظمؒ کا تصور تبادلۂ آبادی بہت اچھا لگنے لگا۔ چنانچہ تیرہ اور نوا کھلی

میں گاندھی نے کہا: ''میں تبادلہ آبادی کے حق میں ہوں''۔ 27 مارچ 1947ء- میمن چیمبرز آف کامرس بمبئی کے اجلاس میں قائداعظمؒ نے گاندھی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا: ''مسٹر گاندھی نے دو سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ تبادلۂ آبادی کے حق میں ہیں۔ جس وقت تبادلۂ آبادی کی تجویز میں نے پیش کی تھی اس وقت یہ ایک جرم شمار کیا گیا تھا اور اس کے خلاف شور وغوغا بھی بلند ہوا تھا''۔

جس وقت قائداعظمؒ نے تبادلۂ آبادی کی تجویز پیش کی تھی اس وقت یہ اس لئے جرم تھا اور اس کے خلاف اس لئے شور وغوغا بلند ہوا تھا کہ قائداعظمؒ کی تبادلۂ آبادی کی تجویز اس امر سے مشروط تھی کہ پاکستان میں پورا بنگال اور پورا پنجاب شامل ہو۔ جب ہندو قیادت کو یقین ہوگیا کہ اسے روبہ عمل نہیں ہونے دے گی تو اس نے پنجاب و بنگال کی تقسیم کے ساتھ ساتھ تبادلۂ آبادی پر بھی زور دینا شروع کر دیا۔

30 اپریل 1947ء- دہلی میں قائداعظمؒ نے ایک بیان میں بنگال و پنجاب کی تقسیم کی تجویز کو عناد اور تلخی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی: ''وائسرائے اور حکومتِ برطانیہ اس جال میں نہیں پھنسیں گے اور ایک شدید غلطی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ پاکستان میں چھ صوبے ہونے چاہئیں، یعنی:- بنگال، آسام، پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ۔ اور ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ساتھ مسلح افواج کو بھی تقسیم ہونا چاہئے۔ ہندوستان کے مسئلہ کا صاف اور قابل عمل حل یہی ہے''۔

جب پاکستان میں پورا بنگال، آسام اور پورا پنجاب بھی شامل ہو تو پھر تبادلہ آبادی ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اسی بیان میں قائداعظمؒ نے کہا: ''پاکستان اور ہندوستان کی دستور ساز اسمبلیاں اس مسئلہ پر غور کرسکتی ہیں، اور بعد میں دونوں ملکوں کی حکومتیں ان علاقوں سے آبادیوں کا تبادلہ کرسکتی ہیں جہاں اس کی ضرورت محسوس ہو''۔

لیکن اس تبادلۂ آبادی کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان میں مسلم اکثریتی صوبوں کے طور پر پورا پنجاب اور پورا بنگال بھی شامل ہو۔ اسی لئے قائداعظمؒ نے 12 مئی 1947ء کے ایک انٹرویو میں پنجاب و بنگال کی تقسیم کو ایک سازش قرار دیا۔ 21 مئی کو برطانوی نیوز ایجنسی رائٹر کے نامہ نگار مسٹر ڈون کیمپل نے قائداعظمؒ سے انٹرویو کیا۔ پنجاب و بنگال کی تقسیم پر اس کے ایک سوال کے جواب میں قائداعظمؒ نے کہا: ''اگر یہ دونوں صوبے تقسیم کر دیئے گئے جس کا کہ بنگال کے اعلیٰ ذات کے ہندو اور پنجاب کے سکھ مطالبہ کر رہے ہیں تو اس کا نتیجہ بہت ہی خطرناک ہوگا، اور میری رائے میں پنجاب کے سکھ سب سے زیادہ نقصان میں رہیں گے۔ اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں پر بھی ایک ضرب لگے گی۔ اسی طرح مغربی بنگال کے اعلیٰ ذات کے ہندو بہت زیادہ گھاٹے میں رہیں گے اور یہی حال مشرقی پنجاب کے ہندوؤں کا ہوگا۔

صوبوں کے بٹوارہ کا خیال ہی غیر ذمہ دارانہ اور ناعاقبت اندیشانہ تخیل ہے۔ اگر بدقسمتی سے ہز میجسٹی کی حکومت نے تقسیم کی تائید کردی تو میری رائے میں یہ اس کی بڑی سخت غلطی ہوگی اور یہ غلطی فوراً ہی خطرناک ثابت ہوگی اور بعد میں خوفناک۔ اس کا فوری اثر یہ ہوگا کہ شرقی و مغربی بنگال اور شرقی و مغربی پنجاب میں تلخی پیدا ہوجائے گی اور بعد میں یہ تلخی مستقل فسادی شکل اختیار کر جائے گی''۔

2 جون کو وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی لیڈروں کے سامنے برطانوی سکیم پیش کی جس کے نتیجے میں تقسیم ہند ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں 3 جون کو وائسرائے نے اپنی نشری تقریر میں یہ بھی کہا'' ..... جب مسلم لیگ نے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو کانگریس نے بھی اسی بنیاد پر چند صوبوں کی تقسیم کا مطالبہ کردیا.....''۔

9 جون 47ء کو یہ منصوبہ منظوری یا نامنظوری کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں پیش کیا گیا۔ اس موقعہ پر کونسل نے جو ریزولیوشن پاس کیا اس میں یہ بھی کہا گیا'' ..... برطانوی حکومت کے اعلان کے ماتحت اب ہندوستانی مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کردیا جائے۔ چنانچہ اب مسلم لیگ کونسل کی یہ رائے ہے کہ ہندوستانی مسائل کے حل کا واحد علاج یہ ہے کہ ہندوستان کو ہندوستان اور پاکستان کی دو علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں تقسیم کردیا جائے اور محض اسی بنیاد پر مسلم لیگ کونسل نے ہز میجسٹی کی حکومت کے اس اعلان پر اپنی تمام تر توجہ وقف کردی اور کامل غور کیا۔ کونسل کی یہ بھی رائے ہے کہ اگرچہ تقسیم بنگال و پنجاب سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے روا رکھا جاسکتا ہے مگر برطانوی حکومت کے اس اعلان کو انتقالِ اقتدار کا ذریعہ سمجھتے ہوئے تسلیم کرلیا گیا ہے''۔

20 جون 1947ء۔ متحدہ بنگال کی لیجسلیٹو اسمبلی کے ہندو ارکان کا اجلاس ہوا۔ اس میں تقسیم بنگال کے حق میں 58 اور مخالفت میں 21 ووٹ پڑے۔ مسلم ارکان کے علیحدہ اجلاس میں تقسیم بنگال کے خلاف 106 اور حق میں 35 ووٹ پڑے۔ 23 جون کو پنجاب کے ہندو اور مسلمان ارکان اسمبلی کے بھی علیحدہ علیحدہ اجلاس ہوئے۔ یہاں بھی یہی صورت حال رہی کہ ہندو ارکان تقسیم پنجاب کے حق میں تھے۔ مسلمان ارکان متحدہ پنجاب کے حامی تھے۔

قائداعظمؒ کب چاہتے تھے کہ آدھے یا بقول مولانا امیر زمان نصف سے زائد مسلمان انڈیا میں رہ جائیں۔ لیکن ان مسلمانوں کے لئے کوئی علاقہ بھی تو چاہئے تھا۔ قائداعظمؒ یہ علاقہ خیرات میں نہیں مانگتے تھے بلکہ اپنے حق کے طور پر پورے پنجاب اور پورے بنگال اور آسام کی پاکستان میں شمولیت چاہتے تھے کہ یہ مسلم اکثریتی صوبے تھے۔ اس صورت میں وہ تبادلہ آبادی کے لئے بھی تیار تھے، جیسا کہ اوپر ذکر

آ چکا ہے کہ دونوں ملکوں کی دستور ساز اسمبلیاں اس پر غور کر سکتی ہیں اور دونوں ملکوں کی حکومتیں ''ان علاقوں سے آبادیوں کا تبادلہ کر سکتی ہے جہاں اس کی ضرورت محسوس ہو''۔لیکن جب انگریز اور ہندو کانگریس کے ملت اسلامیہ کے خلاف گٹھ جوڑ نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم ناگزیر کر دی تو قائداعظمؒ کو کہنا پڑا، یہ وہ پاکستان نہیں جس کے لئے ہم نے جدوجہد کی۔ اسے انہوں نے کٹا پھٹا اور کرم خوردہ پاکستان قرار دیا۔

چونکہ جغرافیائی اعتبار سے یہ وہ پاکستان نہ تھا جس کے لئے انہوں نے جدوجہد کی تھی اس لئے اب وہ تبادلۂ آبادی کے حق میں نہیں تھے۔ان کا ارشاد تھا کہ دونوں ملکوں کی اقلیتیں ایک دوسری کے لئے تحفظ کی ضمانت ہوں گی۔لیکن جب مونٹ بیٹن اور نہرو اس سلسلے میں اپنے وعدے سے پھر گئے تو قائدؒ کو بہت تشویش ہوئی۔

اس ساری صورت حال کے باوجود کسی مولانا امیر زماں کو ہندو قیادت اور ہندو کانگریس کے خلاف واویلا تو کیا کوئی جملہ تک کہنے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی۔اس کے برعکس ان کی زبان جب بھی حرکت میں آتی ہے تو پاکستان اور بانی پاکستان کے خلاف، کیونکہ حقِ نمک کی ادائیگی کا تقاضا یہی ہے۔لیکن چاند پر خاک ڈالے اپنے منہ پر پڑے۔

اور یہ بھی ان کی آج کی دلیل ہے کہ ہم ہندوستان کی تقسیم کے نہیں مسلمانوں کی تقسیم کے خلاف تھے۔ حالانکہ جب قائداعظمؒ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے لئے پورا بنگال اور پورا پنجاب مانگ رہے تھے تب بھی یہ لوگ قیام پاکستان کے خلاف تھے، کیونکہ قائداعظمؒ مسلمانوں کی تقسیم نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے ہندوستان کی تقسیم چاہتے تھے۔(روزنامہ ''پاکستان'' لاہور۔29 اگست 1999ء)۔

پاکستان انگریز نے بنایا
یا
تاریخی عمل کا نتیجہ!

ہمارے ہاں شروع سے ایک طبقہ ایسا ہے جو قیام پاکستان کے حوالے سے آئے روز نت نیا شوشہ چھوڑتا رہتا ہے۔ گو یہ طبقہ انتہائی محدود ہے لیکن پریس میں اس کے نظریات کی اشاعت کنفیوژن پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ ان لوگوں کی خوش قسمتی یہ ہے کہ ان سے انٹرویو کرنے والے اخبار نویس بالعموم اس موضوع پر مطالعہ نہیں کرتے۔ یوں اس شخص کے فرمودات عام آدمی کے ذہن میں شبہات پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ ولی خاں تو اس پر ویسے ہی ادھار کھائے بیٹھے ہیں، اب خیر سے پیر صاحب پگارا نے بھی اس پر لب کشائی کی ہے۔ جیسا کہ روزنامہ جنگ لاہور 16 جولائی 2000ء کے سنڈے میگزین میں ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا ہے: ''دیکھو بھائی، اگر تو لوگوں کو خوش کرنا ہے تو اور بات ہے اور اگر سچ سننا ہے تو میری معلومات یہی ہیں کہ برطانوی حکومت ہندوستان میں ایک مسلم اسٹیٹ بنانے کا فیصلہ بہت پہلے کر چکی تھی۔ یہ فیصلہ قرارداد پاکستان منظور ہونے سے بہت پہلے ہو چکا تھا''۔

پیر پگارا ہوں یا ولی خاں، یا کوئی اور، یہ مؤقف سراسر تاریخ کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ تاریخی عمل تو یہ ہے کہ بقول قائداعظمؒ: ''پاکستان اسی وقت قائم ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلے مسلمان نے قدم رکھا تھا''۔ اور یہ ہے بھی حقیقت کیونکہ برہمن کو ایک لمحے کے لئے بھی گوارا نہ رہا کہ یہاں مسلمان قدم جمائیں۔ سلطان محمود غزنوی کے پے در پے حملوں نے برہمن اور برہمن ازم کو کمزور تو ضرور کیا لیکن وہ اور اس کے کسی جانشین نے یہاں باقاعدہ اور ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کی کوشش نہ کی۔ یہ شرف شہاب الدین محمد غوری اور اس کے جانشین قطب الدین ایبک کو حاصل ہوا۔ ہندو راجاؤں اور حکمرانوں نے اسے تسلیم نہ کیا۔ لہٰذا وہ اس کوشش میں رہے کہ وہ مسلمانوں کو اسی راستے سے واپس جانے پر مجبور

سروئیں جس راستے سے وہ برصغیر میں داخل ہوئے تھے۔ سپین کی مثال ان کے سامنے تھی جہاں آٹھ سو برس کی حکومت کے بعد مسلمانوں کے لئے وہ سرزمین تنگ کردی گئی۔ لیکن یہاں مسلمان حکمرانوں کی حکمت عملی کے سامنے برہمن کی کوئی پیش نہ جاتی تھی۔ انگریز برصغیر پر قابض ہوئے تو انہوں نے قصداً مسلمانوں کو معاشی زبوں حالی کا شکار کیا۔ تعلیمی اور معاشی لحاظ سے ہندو اس قدر مستحکم ہوتے گئے کہ انہیں برصغیر میں ہندو رام راج کے قیام کی اپنی دیرینہ آشا پورا ہونے کی امید بندھ گئی۔ سرسید کی دوررس نگاہوں نے مسلمانوں کو تعلیمی لحاظ سے خوشحال کرنے کی سکیم شروع کی۔ مسلمانوں میں بھی بیداری کی لہر دوڑی اوران میں کھوئے ہوئے حقوق حکمرانی کا احساس شدید تر ہونے لگا۔ دوسری طرف ہندو اور ہندو کانگریس کے ارادے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یا تو یہاں ہندو بن کر رہنا ہوگا یا پھر اسی راستے سے واپس جانا ہوگا جس راستے سے یہ یہاں آئے تھے۔ اگر انہیں دونوں میں سے کوئی چیز قبول نہیں پھر مرنے کے لئے تیار رہیں۔ ہندوستان کو سپین بنانے کے سلسلے میں ہندو کے جو عزائم تھے ان پر بہت کچھ چھپ چکا ہے۔ اگر محمد امین زبیری کی ''سیاسیات ملیہ'' اور ملک فضل حسین کی ''ہندو راج کے منصوبے'' ہی پڑھ لی جائے تو انسان لرز جاتا ہے۔

ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ انگریز یہاں سے جائے تو مسلمانوں کے لئے بھی کوئی تحفظ ہو ورنہ ہندو برصغیر کو مسلمانوں کے لئے سپین بنا دیں گے۔ اسی لئے جب ہندو قیادت نے انگریز سے QUIT INDIA (ہندوستان چھوڑ دو) کا پرزور مطالبہ کیا تو مسلمانوں کے مسیحا حضرت قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ نے واشگاف الفاظ میں انگریز حکمرانوں سے مطالبہ کیا DIVIDE AND QUIT (جاؤ لیکن ہندوستان کو تقسیم کرکے)۔ ظاہر ہے ہندو کانگریس کے مذموم ارادوں کے ہوتے ہوئے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ مسلمانوں کے لئے ایک الگ مملکت ہو۔ جو نہ صرف ان کی بلکہ پورے مڈل ایسٹ اور سنٹرل ایشیا کی بقا اور ارتقا کا باعث ہوگی۔ اس نظریے کو قائداعظمؒ نے تقویت بخشی لیکن انگریز کسی صورت برصغیر کو دو مملکتوں میں تقسیم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ چیز ناقابل عمل تھی۔ دوسرے وہ ہندوستان کی سیاسی اور معاشی وحدت کو اپنا کارنامہ قرار دیا کرتا تھا۔ اس لئے بھی وہ اس وحدت کو ہرصورت برقرار رکھنے کا متمنی تھا۔ اس ضمن میں بیشمار مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن طوالت سے گریز کی خاطر صرف دو مثالیں۔

17 دسمبر 1942ء۔ وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو (Linlithgo) نے ایسوسی ایٹڈ چیمبرز آف کامرس کلکتہ کے سالانہ اجلاس میں خطاب کرتے ہوئے کہا: ''میں آپ سے اپنے پہلے خطبات میں بھی اس ملک کی وحدت (Unity) کی اہمیت پر اکثر بول چکا ہوں۔ جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان، عملی مقاصد کے لئے،

ایک ہے۔ میرا یہ تجزیہ اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کبھی ماضی میں تھا، بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم، کہ ہمیں اس وحدت کو ٹوٹ پھوٹ سے بچانے کے لئے اس طرح کوشش کرنی چاہئے کہ اسے اقلیتوں کے حقوق اور جائز دعووں، خواہ وہ اقلیتیں بڑی ہوں یا چھوٹی، کے لئے بڑی استقامت سے پورے عدل وانصاف سے ساتھ استوار کیا جا سکے۔ حضرات! جو اسے خارجہ پالیسی، نیوف پالیسی یا دفاعی پالیسی، صنعتی ترقی کے حوالے سے پرکھنا چاہے تو اسے کوئی شبہ نہیں ہوگا کہ یہ اس کا مطلوبہ مقصد ہے۔ کیا ہندوستان اختیار کے ساتھ اس کا دعویٰ کر سکتا ہے جس کا وہ حقدار ہے؟ اگر یہ دو حصوں میں بٹ جاتا ہے تو کیا یہ بین الاقوامی مباحث میں، سلطنت کے دیگر حصوں کے ساتھ بحث وتمحیص میں اپنا کردار موثر انداز میں ادا کر سکتا ہے؟ اگر ہندوستان کو وہ مقام حاصل کرنا ہے جو اسے سلطنت اور بین الاقوامی مشوروں میں حاصل ہونا چاہئے تو ہندوستان کی وحدت بھاری اور حقیقی اہمیت کی حامل ہونی چاہئے۔ لیکن جیسا میں نے کہا ہے ایسا اقلیتوں کو پورے اور کافی حقوق، جو ان اقلیتوں کو منظور ہوں گی، کی صورت میں ہی ہو سکتا ہے۔ (سپیچز بائی دی مارکوئیس آف لنلتھگو۔ جلد دوم۔ مینجر، گورنمنٹ آف انڈیا پریس شملہ، 1944ء۔ صفحہ 458۔ بحوالہ پاکستان ریزولیوشن ٹو پاکستان۔ لطیف احمد شروانی۔ 1969ء۔ نیشنل پبلشنگ ہاؤس لمیٹڈ سی 37۔ ایم اے ایچ سوسائٹی ٹیپو سلطان روڈ کراچی 68۔ صفحہ 37)۔

17 فروری 1944ء۔ کونسل آف سٹیٹ اور لیجسلیٹو اسمبلی سے وائسرائے ہند لارڈ ویول (Wavel) کا خطاب: ''ہندوستان کی وحدت کے اصل مسئلے پر، ہندو اور مسلمان کے درمیان اختلاف کے حوالے سے، میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں، آپ جغرافیہ تبدیل نہیں کر سکتے۔ دفاع، بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات، کئی اندرونی اور بیرونی معاشی مسائل کے نقطہ نظر سے ہندوستان ایک فطری وحدت ہے۔ دو بڑے طبقوں (Communities) اور بعض دوسری اہم اقلیتوں اور ہندوستانی ریاستوں کے لئے اس وحدت کے اندر رہنے اور اس کی دولت اور مواقع کے بہترین استعمال کے لئے کیا انتظامات کئے جاتے ہیں، یہ فیصلہ کرنا ہندوستانیوں کا کام ہے۔ تاریخ میں بہت مثالیں موجود ہیں کہ دو طبقے حتیٰ کہ دو قومیں ثقافتوں یا مذاہب کے اختلاف کے باوجود اکٹھا رہنے کے انتظامات کر سکتی ہیں۔ مسئلے کے حل بہت ہیں۔ صدیوں کی مخاصمت کے بعد انگلینڈ اور سکاٹ لینڈ ایک حتمی یونین پر پہنچ گئے۔ کینیڈا میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ایک وفاقی سمجھوتہ ہوا، جو تسلی بخش طور پر چل رہا ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں فرانسیسی، اطالوی اور جرمن عناصر کے مابین ایک مختلف قسم کے وفاق پر اتفاق ہوا۔ ان سب میں، جن کا ذکر ہو چکا ہے، مذہبی کے ساتھ ساتھ نسلی اختلافات بھی تھے۔ امریکہ میں بہت سے مذہبی اور نسلی عناصر تباہ کن خانہ

جنگی کے تلخ تجربے کے بعد وفاقی ڈھانچے میں ایک عظیم قوم بن چکے ہیں۔ آئرلینڈ میں متحارب عناصر اب تک متحد ہونے میں ناکام رہے ہیں، اور آئرلینڈ پاکستان کی طرز کا ہے، اگرچہ مشابہت بلاشبہ اضافی ہے۔ روس میں سوویت یونین نے اپنے پہلے سے موجود لچکدار نظام میں ایک نئی تبدیلی وضع کی ہے۔ یہ بھی بلاشبہ غور طلب ہے۔ ہندوستان کے آئینی ماہرین کے غور کے لئے یہ مثالیں موجود ہیں۔ یہ فیصلہ ہندوستان کو کرنا ہے کہ کونسی اس کی ضروریات کے زیادہ قریب تر ہیں۔ لیکن کوئی شخص جغرافیہ تبدیل نہیں کرسکتا۔ (لیجسلیٹو اسمبلی ڈیبٹس۔ جلد اول۔ 1944ء۔ منیجر آف پبلی کیشنز دہلی۔ 1944ء۔ صفحہ 342۔ بحوالہ: ایضاً صفحات 37، 38)۔

لیکن ایک تاریخی تسلسل کے نتیجے میں مسلمانوں کو اپنی بقا ایک الگ مملکت کے قیام کی صورت میں ہی نظر آتی تھی۔ اس کا بھرپور، ٹھوس اور آئینی اظہار انہوں نے 45ء۔46ء کے انتخابات میں کردیا جو اس مقصد کے لئے منعقد کرائے گئے کہ اگر مسلم لیگ جیت گئی تو انہیں پاکستان مل جائے گا نہیں تو متحدہ ہندوستان۔ یوں مسلمان قیام پاکستان کے لئے اَن ٹل ہو چکے تھے۔ دوسری طرف برطانوی وزیراعظم لارڈ ایٹلی (Atlee) اپنے پیش روؤں کی پالیسی کے مطابق ہندوستان کی وحدت برقرار رکھنے کے لئے کوشاں تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے اپنے تین وزرا پر مشتمل ایک کیبنٹ مشن ہندوستان بھیجا، جو ان افراد پر مشتمل تھا۔ لارڈ پیتھک لارنس (سیکرٹری آف سٹیٹ برائے ہندوستان)، سرسٹیفورڈ کرپس (صدر بورڈ آف ٹریڈ) اور مسٹر الیگزینڈر (فرسٹ لارڈ آف ایڈمرلٹی)۔

مشن مارچ 1946ء میں ہندوستان پہنچا۔ مشن نے مسلم لیگ کے جس پہلے گروپ کو ڈنر پر مدعو کیا وہ راجہ صاحب محمود آباد، مس ممتاز شاہنواز اور حسن اصفہانی پر مشتمل تھا۔ حسن اصفہانی لکھتے ہیں:

> سراسٹیفورڈ کرپس برابر ایک متحد ہندوستان، جس میں مسلمانوں کے لئے مناسب تحفظات ہوں، کے نظریے کی تائید کرتے رہے۔ وہ بہت قابل اور قائل کن طریقے سے یہ استدلال کرتے رہے کہ اگر ہندوستان کو تقسیم کرکے پاکستان بنادیا گیا تو نئی ریاست (پاکستان) زندہ رہنے کے قابل نہ ہوگی اور اپنی پیدائش کے تھوڑے ہی عرصے بعد مصائب میں گرفتار ہو جائے گی..... یہ وقت ہے کہ مسلم لیگ کے لیڈر موقع سے فائدہ اٹھائیں اور اس مقصد کے لئے کیبنٹ مشن کی تائید وحمایت سے کانگریس اور دیگر ہندو لیڈروں کے ساتھ معاملہ طے کرلیں۔ انہوں نے کہا، اگر یہ موقع ہاتھ سے جاتا رہا اور ہندوستان کو تقسیم کردیا گیا، اور پھر پاکستان کے زندہ رہنے کی صلاحیت غیر حقیقی ثابت ہوئی تو ہندوستان پاکستان کو

اپنی شرائط پر ہی واپس لینے کو تیار ہوگا۔ اور اس طرح ملک میں مسلمانوں کی حالت بہت افسوسناک ہوجائے گی۔

''مسٹر اے وی الیگزنڈر بہت کم بولے اور وہ بھی محض دفاع کے نقطۂ نظر سے۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ برطانیہ کے ماہرین دفاع کی متفقہ رائے یہ ہے کہ تقسیم ہند سے برصغیر کے دونوں ملکوں، اور بالخصوص پاکستان کے لئے دفاع کا ایک سنگین مسئلہ پیدا ہوجائے گا۔ انہوں نے اس پر زور دیا کہ پاکستان کے دفاع کا مسئلہ ایک ٹیڑھی کھیر ہوگا، اور اس میں بکثرت ایسی دشواریاں پیش آئیں گی، جن پر قابو پانا ممکن نہ ہوگا.....

''ایک اور دلیل انہوں نے یہ پیش کی کہ اگر دولت مشترکہ کسی جنگ میں الجھ گئی تو ایک ایسے منتشر رقبے کو بچانے میں مدد دینے سے برطانوی فوجوں کا کام بھی بڑھ جائے گا۔ برعکس اس کے اگر ہندوستان ایک ملک رہے گا اور آزاد ہندوستان کا دفاع بدستور موجودہ بنیاد پر ایک مرکزی کمان کے ہاتھ میں رہا تو نہ صرف لوگوں پر فی کس دفاع کا بار کم ہوگا بلکہ خود دفاع بھی زیادہ موثر ہوجائے گا''۔ (قائداعظم جناحؒ۔ جیسا میں انہیں جانتا ہوں۔ صفحات 297،296۔ پبلشر: آتش فشاں۔ لاہور)۔

بہرحال، کیبنٹ پلان کو مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے قبول کرلیا جس کے تحت ہندوستان میں تین خودمختار زون قائم ہونا تھے۔ شمال مشرقی زون بنگال وآسام پر، شمال مغربی زون پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ پر جبکہ مرکزی زون باقی ماندہ صوبوں اور علاقوں پر مشتمل ہوگا۔

جب کانگریس نے اسے منظور کیا تھا تو اس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ مولانا نے بظاہر اس خیال سے کہ اب ان کا کام مکمل ہوگیا ہے کانگریس کی صدارت سے استعفا دیدیا۔ ان کی جگہ پنڈت جواہر لال نہرو صدر منتخب ہوگئے اور انہوں نے کیبنٹ مشن پلان کی نئی تشریح شروع کردی۔ مولانا آزاد نے ''انڈیا ونز فریڈم'' میں اسے اپنی سیاسی زندگی کی فاش غلطی قرار دیا جو انہوں نے کانگریس کی صدارت سے استعفا دیا تھا۔ مولانا آزاد نہرو وغیرہ کی بدعہدی پر روشنی ڈالتے ہوئے ''انڈیا ونز فریڈم'' میں لکھتے ہیں: '' کیبنٹ مشن فیصلہ کرچکا تھا کہ اس مسئلے میں لیگ کی تاویل درست تھی..... انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ میں یہ تسلیم کروں کہ مسٹر جناحؒ کے دعوے میں وزن اور زور تھا''۔

کیبنٹ مشن پلان کو کانگریس نے جس طرح ارادی طور پر مسخ کیا اور پھر عارضی حکومت بنانے میں

جس طرح کیبنٹ مشن نے بدعہدی کی، اس کے نتیجے میں مسلم لیگ کو پلان کے سلسلے میں اپنی رضامندی واپس لینا پڑی۔

27، 28، 29 جولائی 1946ء۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا غیر معمولی اجلاس بمبئی میں طلب کیا گیا۔ پہلے روز قائداعظمؒ نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> ہم نے یہ سب کچھ کرنے پر بھی غلطی نہیں کی تھی۔ لیگ نے یہ رعائتیں دے کر اعلیٰ درجے کے تدبر کا ثبوت دیا۔ یہ رویہ ہم نے صرف خانہ جنگی اور خونریزی کو روکنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ اس لئے ہم محدود پاکستان پر راضی ہو گئے۔ یہ قربانی ہم نے کانگریس سے مصالحت کے لئے کی۔ مگر کانگریس نے کسی رواداری کا ثبوت نہیں دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ رواداری اور اخلاق کی آخر میں فتح ہوتی ہے۔ آج مسلمانوں میں کانگریس اور برطانیہ کے خلاف شدید جذبات بھڑک رہے ہیں۔ اس لئے یہ زہر بھی ہمارے لئے تریاق ہو گیا۔ اب مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہم کو آگے بڑھنا چاہئے''۔ (حالاتِ قائداعظمؒ۔ صفحہ 254۔ ایڈیشن 1988ء۔ آتش فشاں لاہور)۔

کونسل کے اس اجلاس میں ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کا فیصلہ ہوا۔ جو پورے ہندوستان میں 16 اگست 1946ء کو منایا گیا۔ اجلاس میں یہ بھی طے پایا کہ:۔

> ''انگریزوں کے طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کے طور پر اور اس طرزِ عمل سے اپنی گہری ناراضی کی علامت کے طور پر، یہ کونسل مسلمانوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ فوراً ان خطابات کو واپس کر دیں جو اجنبی حکومت نے انہیں عطا کئے ہیں''۔

اس قرارداد کے بعد کونسل کے اجلاس کے وہ حاضرین جو خطاب یافتہ تھے، ان میں سے ہر شخص باری باری ڈائس پر گیا اور اس نے پُرجوش تالیوں میں خطاب کی واپسی کا اعلان کیا۔

بمبئی کے ایک مؤثر کانگریس نواز ویکلی ''بلٹز'' نے اس پر لکھا:۔

> ''مسلم لیگ کے بدترین دشمن بھی مسٹر جناح کی لیڈرشپ پر رشک کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ گزشتہ ہفتے لیگ کی جوز بردست قلب ماہیت عمل میں آئی، یعنی جس طرح وہ مسلمان نوابوں، نونوں اور نائٹوں کے ایک رجعت پسند گڑھ جوز سے ایک ایسی انقلاب پسند عوامی تنظیم

> میں تبدیل ہوگئی کہ جو اگر عملاً نہیں تو کم از کم قولاً شہنشاہیت کے خلاف جدو جہد کرنے میں منہمک ہے۔ اسے دیکھ کر چوری چھپے ہم اس قومی خواہش کے اظہار پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کاش انڈین نیشنل کانگریس کے معاملات کی باگ ڈور بھی کسی مسٹر جناح کی سی مسلمہ قابلیت کے نکتہ شناس سیاست دان کے ہاتھوں میں ہوتی۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سیاست دانی کی اپنی اس آخری ضرب کاری سے مسٹر جناح نے انگریزوں اور کانگریس دونوں کو مات دے دی ہے اور اس عام قومی الزام کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ مسلم لیگ برطانوی شہنشاہیت کی طفیلی ہے"۔

اگر چہ اس ساری صورت حال کے بعد برصغیر کے مسلمان پاکستان کے حصول کے لئے اور زیادہ شدید ہو گئے لیکن برطانوی حکومت نے ہندوستان کو ایک رکھنے کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔

20 فروری 1947ء۔ برٹش گورنمنٹ نے پالیسی بیان دیا کہ ہندوستان کو جون 1948ء تک آزادی دے دی جائے گی۔ 21 مارچ کو وائسرائے ہند لارڈ ویول نے الوداعی تقریر کی۔ ان کی جگہ لارڈ مونٹ بیٹن کا اعلان ہو چکا تھا۔ 24 مارچ 47ء کو لارڈ مونٹ بیٹن نے نئے وائسرائے کا حلف اٹھاتے ہوئے کہا:-

> "آئندہ چند ماہ میں کوئی حل ضرور نکالنا چاہئے۔ ہز میجسٹی گورنمنٹ جون 48ء میں اختیارات منتقل کر دینے کا عزم کر چکی ہے، اس لئے الجھے ہوئے مسائل کا سلجھانا ضروری ہے....."۔

وہ الجھے مسائل کیا تھے؟ یہی کہ ہندوستان کو متحد رکھنا۔ جیسا کہ برطانوی وزیر اعظم لارڈ ایٹلی نے مونٹ بیٹن کو وائسرائے بناتے وقت ہدایات دی تھیں کہ کیبنٹ مشن پلان کی بنیاد پر ہندوستان کو متحد رکھا جائے۔ آزادی متحدہ ہندوستان کی صورت میں دی جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر ہمیں رپورٹ کریں، ہم سوچیں گے۔

یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ لارڈ ایٹلی کی لیبر گورنمنٹ تقسیم ہند کے لئے بالکل راضی نہ تھی۔ ان کا جھکاؤ ہندوؤں کی طرف تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ تقسیم ہند کو کسی نہ کسی طرح روکا جائے۔ اس بات کی تصدیق خود ایٹلی نے 3 جون 1959ء کو ایک ٹیلی ویژن انٹرویو میں کی جو ان کے سابقہ پریس سیکرٹری فرانس

ولیم نے کیا۔اس میں ایٹلی نے کہا،

''ہماری ترجیح ایک متحدہ ہندوستان تھی۔ہم نے اس کے لئے سرتوڑ کوشش کی لیکن ہم ایسا کر نہ سکے''۔(حوالہ:ٹائمز آف انڈیا 10 اپریل 1960ء)۔

انہی سرتوڑ کوششوں کے لئے مونٹ بیٹن کا تقرر کیا گیا،جس کے متعلق انگریز مصنف ایچ وی ہڈسن لکھتا ہے:

.....لارڈ مونٹ بیٹن قبل آزادی کے ہندوستان کے متعلق برطانوی باشندوں کی اکثریت کی اس سوچ سے اتفاق رکھتا تھا کہ ہندوستان کی وحدت کو توڑنا، جو کہ برطانوی راج کا طرۂ امتیاز رہی ہے،ایک افسوسناک انجام کی حیثیت رکھتا ہے جس کو وقت کی ضرورت نے اس پر مسلط کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک سیاسی اقدام تھا جس کی اپنی خوبیاں تھیں''۔(دی گریٹ ڈیوائڈ صفحہ 395 - 396 ۔ایڈیشن پہلا:1969ء۔ پبلشر:ہچن سن اینڈ کو لندن)۔

لارڈ مونٹ بیٹن نے برطانوی وزیراعظم کی ہدایت پر کیبنٹ مشن پلان پر اتفاق کی کوشش کی لیکن اب وقت گزر چکا تھا۔پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ کسی نہ کسی طریقے سے قیام پاکستان کو روکا جائے اور اقتدار کی منتقلی متحدہ ہندوستان کی بنیاد پر ہو۔ چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اسے بتایا کہ''اگر وہ تقسیم بنگال کا اعلان کر دے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ بنگال کے مسلمان لیگ سے علیحدگی اختیار کرلیں گے۔ میرے خیال میں پنجاب میں بھی ایسا ہوسکتا ہے اگر چہ اس کا امکان نسبتاً کم ہے''۔(ایضاً۔صفحہ 245)

''دی گریٹ ڈیوائڈ'' کے مصنف کے مطابق سردار پٹیل نے بھی یہ تجویز دی کہ جناح کو کیبنٹ مشن پلان کی طرف لانے کا یہی طریقہ ہے کہ تقسیم بنگال اور تقسیم پنجاب کا اعلان کیا جائے۔اور یہی جگ جیون رام نے کہا کہ تقسیم بنگال و پنجاب کے اعلان کی صورت میں مسلمان پاکستان کو ناقابلِ عمل سمجھ کر متحدہ ہندوستان کو ترجیح دیں گے۔مونٹ بیٹن کے نزدیک یہ''دانش مندانہ''نقطۂ نظر تھا۔(ایضاً۔ص245)

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے پیروکار اور ولی خاں اب یہ کہتے ہیں کہ ہم ہندوستان کی تقسیم کے خلاف نہیں تھے ہم تو مسلمانوں کی تقسیم کے خلاف تھے۔جبکہ تاریخی حقائق یہ ہیں کہ قائداعظمؒ نے جس پاکستان کے لئے جدوجہد کی اس میں پورا بنگال، پورا پنجاب، آسام، سندھ، سرحد اور

بلوچستان شامل تھے۔ اس صورت میں وہ ہندو مسلم آبادیوں کے مکمل تبادلہ کے لئے بھی تیار تھے۔ لیکن انگریز حکمرانوں اور ہندو کانگریس کے گٹھ جوڑ نے مذکورہ علاقوں پر مبنی پاکستان کا تصور پورا نہ ہونے دیا۔ چنانچہ صوبوں کی تقسیم کے لئے سب سے پہلی آواز کانگریس کے پلیٹ فارم سے اٹھی۔ اس سلسلے میں 8 مارچ 1947ء کو کانگریس کی مجلس عاملہ نے پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز منظور کی۔ اس تجویز کے بعد ہندو قیادت ہندو مسلم تبادلۂ آبادی کے حق میں ہوگئی کیونکہ صوبوں کی تقسیم کے بعد مسلمانوں کی مملکت پاکستان کا وہ نقشہ نہیں رہتا تھا جس کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ تگ و دو کر رہی تھی۔ اب انہیں قائداعظمؒ کا تصور تبادلۂ آبادی بہت اچھا لگنے لگا۔ چنانچہ تیرہ اور نواکھلی میں گاندھی نے کہا: ''میں تبادلۂ آبادی کے حق میں ہوں''۔

27 مارچ 1947ء۔ میمن چیمبر آف کامرس بمبئی کے اجلاس میں قائداعظمؒ نے گاندھی کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''مسٹر گاندھی نے دو سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ تبادلۂ آبادی کے حق میں ہیں۔ جس وقت تبادلۂ آبادی کی تجویز میں نے پیش کی تھی اس وقت یہ ایک جرم شمار کیا گیا تھا اور اس کے خلاف شور و غوغا بھی بلند ہوا تھا''۔

جس وقت قائداعظمؒ نے تبادلۂ آبادی کی تجویز پیش کی تھی اس وقت یہ اس لئے جرم تھا اور اس کے خلاف اس لیے شور و غوغا بلند ہوا تھا کہ قائداعظمؒ کی تبادلۂ آبادی کی تجویز اس امر سے مشروط تھی کہ پاکستان میں پورا بنگال اور پورا پنجاب اور آسام شامل ہو۔ جب ہندو قیادت کو یقین ہوگیا کہ وہ اسے روبہ عمل نہیں ہونے دیں گے تو انہوں نے پنجاب و بنگال کی تقسیم کے ساتھ ساتھ تبادلۂ آبادی پر بھی زور دینا شروع کر دیا۔

30-اپریل 1947ء۔ دہلی میں قائداعظمؒ نے ایک بیان میں بنگال و پنجاب کی تقسیم کی تجویز کو عناد اور تلخی کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے امید ظاہر کی: ''وائسرائے اور حکومت برطانیہ اس جال میں نہیں پھنسیں گے اور ایک شدید غلطی کے مرتکب نہیں ہوں گے۔ پاکستان میں چھ صوبے ہونے چاہئیں، یعنی:۔ بنگال، آسام، پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ۔ اور ہندوستان کی تقسیم کے ساتھ ساتھ مسلح افواج کو بھی تقسیم ہونا چاہئے۔ ہندوستان کے مسئلہ کا صاف اور قابل عمل حل یہی ہے''۔

جب پاکستان میں پورا بنگال، آسام اور پنجاب شامل ہو تو پھر تبادلۂ آبادی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی بیان میں قائداعظمؒ نے کہا: ''پاکستان اور ہندوستان کی دستور ساز اسمبلیاں اس مسئلہ پر غور کر سکتی ہیں، اور بعد میں دونوں ملکوں کی حکومتیں ان علاقوں سے آبادیوں کا تبادلہ کر سکتی ہیں جہاں اس کی ضرورت محسوس ہو''۔

لیکن اس تبادلۂ آبادی کے لئے ضروری ہے کہ پاکستان میں مسلم اکثریتی صوبوں کے طور پر پورا پنجاب اور پورا بنگال اور آسام شامل ہو۔ اسی لئے قائداعظمؒ نے 12 مئی 1947ء کے ایک انٹرویو میں پنجاب و بنگال کی تقسیم کو ایک سازش قرار دیا۔ 21 مئی کو برطانوی نیوز ایجنسی رائٹر کے نامہ نگار مسٹر ڈون کیمپل نے قائداعظمؒ سے انٹرویو کیا۔ پنجاب و بنگال کی تقسیم پر اس کے ایک سوال کے جواب میں قائداعظمؒ نے کہا: ''اگر یہ دونوں صوبے تقسیم کر دیئے گئے جس کا کہ بنگال کے اعلیٰ ذات کے ہندو اور پنجاب کے سکھ مطالبہ کر رہے ہیں تو اس کا نتیجہ بہت ہی خطرناک ہوگا، اور میری رائے میں پنجاب کے سکھ سب سے زیادہ نقصان میں رہیں گے۔ اور مغربی پنجاب کے مسلمانوں پر بھی ایک ضرب لگے گی۔ اسی طرح مغربی بنگال کے اعلیٰ ذات کے ہندو بہت زیادہ گھاٹے میں رہیں گے اور یہی حال مشرقی پنجاب کے ہندوؤں کا ہوگا۔ صوبوں کے بٹوارہ کا خیال ہی غیر ذمہ دارانہ اور عاقبت نا اندیشانہ تخیل ہے۔ اگر بدقسمتی سے ہز میجسٹی کی حکومت نے تقسیم کی تائید کر دی تو میری رائے میں یہ اس کی بڑی سخت غلطی ہوگی اور یہ غلطی فوراً ہی خطرناک ثابت ہوگی اور بعد میں خوفناک۔ اس کا فوری اثر یہ ہوگا کہ مشرقی و مغربی بنگال اور مشرقی و مغربی پنجاب میں تلخی پیدا ہو جائے گی اور بعد میں یہ تلخی مستقل فساد کی شکل اختیار کر جائے گی''۔

2 جون کو وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی لیڈروں کے سامنے برطانوی سکیم پیش کی، جس کے نتیجے میں تقسیم ہند ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں 3 جون کو وائسرائے نے اپنی نشری تقریر میں یہ بھی کہا: ''.....جب مسلم لیگ نے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو کانگریس نے بھی اسی بنیاد پر چند صوبوں کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا.....''۔

9 جون 1947ء کو یہ منصوبہ منظوری یا نامنظوری کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں پیش کیا گیا۔ اس موقعہ پر کونسل نے جو ریزولیوشن پاس کیا اس میں یہ بھی کہا گیا: ''.....برطانوی حکومت کے اعلان کے ماتحت اب ہندوستانی مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ اب مسلم لیگ کونسل کی یہ رائے ہے کہ ہندوستانی مسائل کے حل کا واحد علاج یہ ہے کہ ہندوستان کو ہندوستان اور پاکستان کی دو علیحدہ علیحدہ ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے اور محض اس بنیاد پر مسلم لیگ کونسل نے ہز میجسٹی کی حکومت کے اس اعلان پر اپنی تمام تر توجہ وقف کر دی اور کامل غور کیا۔ کونسل کی یہ بھی رائے ہے کہ اگرچہ تقسیم بنگال و پنجاب سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسے روا رکھا جا سکتا ہے مگر برطانوی حکومت کے اس اعلان کو انتقالِ اقتدار کا ذریعہ سمجھتے ہوئے تسلیم کر لیا گیا ہے''۔

20 جون کو متحدہ بنگال کی لیجسلیٹو اسمبلی کے ہندو ارکان کا اجلاس ہوا، اس میں تقسیم بنگال کے

حق میں 58 اور مخالفت میں 21 ووٹ پڑے۔ مسلم ارکان کے علیحدہ اجلاس میں تقسیم بنگال کے خلاف 106 اور حق میں 35 ووٹ پڑے۔ 23 جون کو پنجاب کے ہندو اور مسلمان ارکان اسمبلی کے بھی علیحدہ علیحدہ اجلاس ہوئے۔ یہاں بھی یہی صورت حال رہی کہ ہندو ارکان تقسیم پنجاب کے حق میں تھے جبکہ مسلمان ارکان متحدہ پنجاب کے حامی تھے۔

قائداعظمؒ کب چاہتے تھے کہ آدھے یا نصف سے زائد مسلمان انڈیا میں رہ جائیں۔ لیکن ان مسلمانوں کے لئے کوئی علاقہ بھی تو چاہئے تھا۔ قائداعظمؒ یہ علاقہ خیرات میں نہیں مانگتے تھے بلکہ اپنے حق کے طور پر پورے پنجاب اور پورے بنگال کی پاکستان میں شمولیت چاہتے تھے کہ یہ مسلم اکثریتی صوبے تھے۔ اس صورت میں وہ تبادلۂ آبادی کے لئے بھی تیار تھے، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ دونوں ملکوں کی دستور ساز اسمبلیاں اس پر غور کرسکتی ہیں اور دونوں ملکوں کی حکومتیں ''ان علاقوں سے آبادیوں کا تبادلہ کرسکتی ہیں جہاں اس کی ضرورت محسوس ہو''۔ لیکن جب انگریز اور ہندو کانگریس کے ملت اسلامیہ کے خلاف گٹھ جوڑ نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم ناگزیر کردی تو قائداعظمؒ کو کہنا پڑا کہ یہ وہ پاکستان نہیں جس کے لئے ہم نے جدوجہد کی۔ اسے انہوں نے کرم خوردہ اور کٹا پھٹا پاکستان قرار دیا۔

چونکہ جغرافیائی اعتبار سے یہ وہ پاکستان نہ تھا جس کے لئے انہوں نے جدوجہد کی تھی اس لئے اب وہ تبادلۂ آبادی کے حق میں نہیں تھے۔ ان کا ارشاد تھا کہ دونوں ملکوں کی اقلیتیں ایک دوسری کے لئے تحفظ کی ضمانت ہوں گی۔ بظاہر یہی سوچ ہندو کانگریس کی تھی۔ تقسیم ہند کے اصول کو باضابطہ طور پر منظور کرنے کے سلسلے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس جون 1947ء میں کانسٹی ٹیوشن ہال دہلی میں ہوا۔ اس موقعہ پر اپنی افتتاحی تقریر میں صدر کانگریس اچاریہ کرپلانی نے نہایت اشتعال انگیز لہجے میں کہا:

> ''اب جب کہ پاکستان بن گیا ہے، ہم پاکستان والوں کو آگاہ کئے دیتے ہیں کہ اگر انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ برا برتاؤ کیا تو پھر ہم یہاں کے ہندوؤں کے غصہ کے سیلاب کی روک تھام نہ کرسکیں گے''۔ (حوالہ: عظمت رفتہ۔ از: ضیاء الدین احمد برنی بی اے۔ صفحہ 473۔ تاریخ اشاعت: 30 جولائی 1961ء۔ ایڈیشن: اول۔ ناشر: تعلیمی مرکز۔ کراچی)۔

اس کے باوجود جب مونٹ بیٹن اور نہرو اس سلسلے میں اپنے وعدے سے پھر گئے تو قائدؒ کو بہت تشویش ہوئی۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اور یہ ان مخالفین کی آج کی دلیل ہے کہ ہم ہندوستان کی تقسیم کے نہیں مسلمانوں کی تقسیم کے خلاف

تھے۔ حالانکہ جب قائداعظمؒ ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے لئے پورا بنگال اور پورا پنجاب مانگ رہے تھے تب بھی یہ لوگ قیام پاکستان کے خلاف تھے، کیونکہ قائداعظمؒ مسلمانوں کی تقسیم نہیں بلکہ مسلمانوں کے لئے ہندوستان کی تقسیم چاہتے تھے، جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس تقسیم کو روکنے کے لئے مونٹ بیٹن کو تقسیم بنگال اور تقسیم پنجاب کا مشورہ دیا۔ جس کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں کی تقسیم بھی عمل میں آ گئی۔

مونٹ بیٹن اور ہندو کانگریس اور مولانا آزاد کی یہ کوشش اور پیش گوئی بھی ناکام رہی۔ تقسیم بنگال کے باوجود نہ بنگال کے مسلمانوں نے پاکستان سے منہ موڑا نہ پنجاب کے مسلمانوں نے بلکہ وہ اپنے عظیم قائدؒ کی قیادت میں مسلم مملکت کے لئے ہر قربانی دینے پر تیار رہے۔

قیام پاکستان کو روکنے کے لئے انگریز حکمرانوں اور ہندو قیادت نے ایک اور سر توڑ کوشش۔ 20 فروری 47ء کو برٹش گورنمنٹ کا پالیسی سٹیٹ منٹ یہ تھا کہ جون 48ء تک ہندوستان کو آزادی دے دی جائے گی۔ قیام پاکستان کو ناممکن یا ناممکن العمل بنانے کے لئے اس عرصے میں کمی کرنے پر غور کیا گیا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کا اصرار تھا کہ اگر فوری انتقال اقتدار کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ مردہ پاکستان کی صورت میں نکلے گا۔ ''دی گریٹ ڈیوائڈ'' کا مصنف ایچ وی ہڈسن لکھتا ہے کہ نہرو نے اس بات پر اتفاق ظاہر کیا کہ مسٹر جناح کو خوف زدہ کر کے تعاون پر آمادہ اسی صورت کیا جا سکتا ہے کہ انتقال اقتدار جلد از جلد کر دیا جائے۔ (صفحہ 232)

اثاثوں کی تقسیم، فوجوں اور اسلحہ کی تقسیم اور دیگر مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے وقت چاہئے تھا، اس لئے قائداعظمؒ نے اصرار کیا کہ انتقالِ اقتدار 14، 15 اگست کو نہ کیا جائے، اسے بعد کی تاریخوں پر ملتوی کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نمائندوں کی حیثیت سے لیاقت علی خاںؒ اور سردار عبدالرب نشترؒ نے مونٹ بیٹن وغیرہ سے ملاقات کی لیکن ان کی کوششیں بار آور ثابت نہ ہوئیں۔ مونٹ بیٹن اقتدار کے جلد از جلد انتقال کے لئے بضد رہا اور ان لیڈروں کو اس نے جواب دیا:

> ''افسوس، پلان کا ایک اہم نکتہ یہی ہے کہ 15 اگست کو انتقال اقتدار کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ہم اپنا ارادہ تبدیل نہیں کر سکتے''۔

2 جون 1947ء۔ وائسرائے نے ہندوستانی لیڈروں کے سامنے اپنی سکیم پیش کر دی۔

3 جون کو ہندو، مسلم اور سکھ لیڈروں نے وائسرائے کو بتا دیا کہ انہیں برطانوی سکیم منظور ہے۔ جس میں لکھا تھا:

''20 فروری 47ء کو ملک معظم کی حکومت نے اس ارادہ کا اعلان کیا تھا کہ جون 48ء تک برطانوی ہند کو حاکمانہ اختیارات تفویض کر دیئے جائیں گے۔ اس وقت حکومت کو امید تھی کہ ہندوستان کی اہم جماعتیں کیبنٹ مشن کے پلان مورخہ 16 مئی 46ء کو عملی جامہ پہنانے میں حکومت سے اشتراک عمل کریں گی اور ایک ایسا دستور اساسی وضع کر لیں گی جو تمام افراد متعلقہ کے لئے قابلِ قبول ہو۔ لیکن افسوس کہ یہ امید پوری نہ ہوئی.....''۔

وہ امید یہی تھی، متحدہ ہندوستان۔ جس کے لئے برطانوی وزیر اعظم لارڈ اٹیلی کا کہنا ہے کہ ہم نے ہندوستان کو متحد رکھنے کی سر توڑ کوشش کی۔

انہی سر توڑ کوششوں کے لئے لارڈ اٹیلی کی حکومت نے لارڈ مونٹ بیٹن کو متحدہ ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیجا جس نے بعد ازاں بار بار تسلیم کیا کہ اس نے ہندوستان کو متحد رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن مسٹر جناح کے آگے اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ حوالے کئی ہیں۔ یہاں صرف چند ایک:

1983ء میں لیری کولنز (Larry Collins) اور ڈومینک لیپری (Dominique Lapierre) کی تصنیف ''مونٹ بیٹن اینڈ دی پارٹیشن آف انڈیا'' شائع ہوئی۔ جسے وایکاس پبلشنگ ہاؤس انڈیا نے شائع کیا۔ 296 صفحات پر مشتمل پیپر بیک کتاب کے دو حصے ہیں۔ 122 صفحات پر مشتمل پہلے حصے میں لارڈ مونٹ بیٹن کا انٹرویو ہے۔ دوسرے میں 22 مارچ سے 15 اگست 1947ء تک تقسیم ہند سے متعلق اس کی ذاتی اور سرکاری دستاویزات کی سلیکشن ہے۔ اس انٹرویو میں مونٹ بیٹن کہتے ہیں'' ..... بدقسمتی سے کسی حل کے لئے گاندھی کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا کردار صرف یہی تھا کہ اس نے بالکل شروع میں مجھے بتا دیا تھا کہ جو کچھ بھی ہو آپ کو ہندوستان تقسیم کرنے کا خیال تک نہ کرنا چاہئے۔ میں نے کہا، یہ میں کرنا ہی نہیں چاہتا۔ میرا مطلب ہے، ہم برصغیر کے لئے جو عظیم ورثہ چھوڑ سکتے ہیں وہ اس کی وحدت ہے۔ (صفحہ 48) ..... میں ہر طرح سے از حد کوشاں رہا کہ کسی طرح یہ تقسیم ٹل جائے۔ (صفحہ 49)۔

کولن اور لیپری نے مونٹ بیٹن نے پوچھا، کہ انہیں علم نہ تھا کہ مسٹر جناح ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہیں اور 6 ماہ تک ہی زندہ رہ سکیں گے۔ اس پر مونٹ بیٹن نے کہا، دیکھیں! ساری طاقت اس شخص کے پاس تھی۔ اگر کسی نے مجھے بتایا ہوتا کہ وہ کسی وقت بھی فوت ہو جائیں گے تو میں یہ سوال اب اپنے آپ سے کرتا ہوں -- میں کہتا: ہندوستان کو تقسیم نہ کریں یکجا رہنے دیں۔ میں وقت کو پیچھے کی طرف دھکیل دیتا۔ اور

اپنے مؤقف پر قائم رہتا؟ تاہم یہ مجھے نہ بتایا گیا لیکن یہ حرکت مجرمانہ ہے۔ اور یہ میں اب ارتجالاً کہہ رہا ہوں کہ ہندوستان کو کسی قسم کی متحدہ صورت میں رکھنے کا یہی واحد موقع ہوتا۔ کیونکہ صرف وہی تھے۔ میں صرف وہی کا لفظ دہراتا ہوں کہ صرف وہی (مسٹر جناح) راستے کا پتھر تھے۔ دوسرے اس قدر بے لوچ نہیں تھے۔ مجھے یقین ہے کانگریس ان لوگوں کے ساتھ کسی مفاہمت پر پہنچ جاتی۔ (صفحہ 57 تا 59)۔

آخری چیز جو جناح صاحب چاہتے تھے وہ یہ تھی کہ ہمیں (انگریزوں کو) یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ (صفحہ 60)..... کوئی بھی بالخصوص میں ہندوستان کی کسی قسم کی تقسیم نہیں چاہتا تھا۔ یہ بھیانک تصور تھا۔ یہ قابل عمل نہیں تھا۔ یہ واقعتہً قابل عمل نہ تھا کیونکہ اگر آپ ہندوستان میں مسلم آبادی کی تقسیم دیکھیں یہ سارے ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم آدھے سے زائد مسلمانوں کو الگ کر کے انہیں مشرقی اور مغربی پاکستان میں سمونے کے قابل تھے۔ باقی کے سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے تھے۔ بیشتر وہیں رہنے میں راضی تھے..... (صفحہ 60)۔

اس پس منظر میں مونٹ بیٹن اپنی اس وقت کی سوچ بتاتا ہے: ''..... چنانچہ بوقتِ رخصت ہمارے ہاتھوں ہندوستان کو تقسیم کرنا المیہ ہوتا..... یقین کے ساتھ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ہندوستان پہنچتے وقت میری ذہنی کیفیت کیا تھی۔ میں متحدہ ہندوستان کا زبردست حامی تھا۔ میں نے سوچا ہندوستانیوں کے لئے جو عظیم ترین واحد ورثہ ہم چھوڑ سکتے ہیں وہ ایک متحدہ ملک ہے۔ ہندوستان کو متحدہ رکھنا زبردست کارنامہ ہوتا..... میں نے سوچا کہ ہمیں ہندوستان کو متحد رکھنے کے لئے ہر کوشش کرنی چاہئے اور واقعتاً یہ میری زبردست خواہش تھی کہ ہمیں اس کا حل نکالنا چاہئے''۔ (صفحہ 61)۔

.....اگر مسٹر جناح اس بیماری سے دو برس پہلے انتقال کر گئے ہوتے، میرا خیال ہے ہم ملک کو متحد رکھ سکتے تھے۔ وہ واحد شخص تھے جنہوں نے حقیقتاً اس خیال کو ناممکن بنادیا۔ جب تک میری مسٹر جناح سے واقعتاً ملاقات نہیں ہوئی میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کام کس قدر دشوار ہے''۔ (صفحہ 62)۔

''صحیح اور ذوفہم کام (Right and Intelligent thing) پر لوگوں کو آمادہ کرنے کی اہلیت کا مجھے غیر معمولی زعم ہے۔ اس لئے نہیں کہ میں قائل کرنے کی طاقت رکھتا ہوں بلکہ اس لئے کہ مجھے حقائق کا مثبت ترین پہلو پیش کرنے کا گر آتا ہے۔ مجھے قطعاً احساس نہ تھا کہ جناح صاحب کے معاملے میں آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ انہوں نے مکمل طور پر اپنا ذہن بنا رکھا تھا۔ کوئی چیز انہیں اس سے ہلا نہ سکتی تھی''۔ (صفحہ 62)۔

قائداعظمؒ نے پورے بنگال، آسام، پورے پنجاب، سرحد، سندھ بلوچستان کا مطالبہ کیا۔ وہ تقسیم

بنگال و پنجاب کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے مونٹ بیٹن پر واضح کیا کہ ایسا کرنے کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ قائداعظمؒ نے ایسٹ اور ویسٹ کو ملانے کے لئے کوری ڈور بھی مانگا۔ مونٹ بیٹن اس پر بھی تیار نہ تھا۔ اس کے تقسیم بنگال و پنجاب کے تہیہ پر قائداعظمؒ نے اس سے کہا: ''تو آپ مجھے کرم خوردہ پاکستان دینے پر مصر ہیں''۔ مونٹ بیٹن کہتا ہے میں نے کہا: ''آپ اسے کرم خوردہ پاکستان کہتے ہیں۔ میں تو چاہتا ہوں آپ یہ بھی بالکل نہ لیں، اگر یہ اس حد تک کرم خوردہ ہے۔ میں تو فی الواقعہ یہی چاہتا ہوں کہ آپ ہندوستان کو متحد رہنے دیں.....۔(صفحات:63-64)۔

قائداعظمؒ نے مونٹ بیٹن سے کہا: ''نہیں، میں ہندوستان کا حصہ نہیں بننا چاہتا۔ میں ہندوراج تلے رہنے کے مقابلے پر نقصان اٹھانے کو تیار ہوں۔(صفحہ 64)۔ مونٹ بیٹن کہتا ہے:'' میں نے محسوس کیا جب تک یہ شخص زندہ ہے کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دوسروں کو قائل کیا جا سکتا ہے۔ ساری طاقت اس شخص ہی کے پاس ہے اور اس شخصِ واحد نے ویسا ہی کیا۔(صفحہ 65)۔''..... میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں جناح کے سامنے ناکام ہوگیا۔(صفحہ 66)۔

برطانوی حکومت اور انگریز وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کی تمام تر کوششوں کے باوجود جب برصغیر کے مسلمان قائداعظمؒ کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر متحد رہے تو اس نے دوسری تدابیر اختیار کیں جن کا مقصد پاکستان کو غیر مستحکم کرنا اور پیدائش کے ساتھ ہی ختم کر دینا تھا تاکہ مسلمان تنگ آکر بھارت میں دوبارہ شمولیت کی درخواست کریں۔

ان اقدامات میں ایک اثاثوں کی تقسیم تھا۔ قائداعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری (1944ء-1947ء) کے ایچ خورشید کے بقول:

''..... برطانوی ہند فوج کی تقسیم میں تاخیر کی گئی اور وہ مسلمان فوجی جو جنگ عظیم دوم کی وجہ سے مشرق وسطی، اٹلی، لیبیا، انڈونیشیا، ملائیشیا اور سنگاپور وغیرہ میں تھے، ان کی واپسی کے انتظامات التوا میں ڈال دیئے گئے۔

''..... پاکستان کے حصے کے سامانِ حرب کا معتدبہ حصہ کلکتے میں پڑا رہنے دیا گیا۔ اس کی مالیت کروڑوں روپے تھی۔ کئی سال بعد بجائے فوجی سامان کے پاکستان کے حصے میں برطانوی فوج کے بچکھچے بوٹ آئے۔ مشین گنیں، ٹینک، رائفلیں اور دیگر جنگی سامان بھارت کو دیدیا گیا۔

''..... پاکستان کے حصے کی 65 کروڑ روپے کی ادائیگی روک دی گئی جو بعد میں

گاندھی کی مرن بھرت کی دھمکی پر کردی گئی''۔(بحوالہ ماہنامہ آتش فشاں۔ قائداعظم نمبر۔دسمبر 1976ء۔صفحہ 249)۔

''ماؤنٹ بیٹن کے ان کاموں میں سے جن سے ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ پاکستان کے دوست نہیں ہیں ایک یہ تھا کہ انہوں نے 19 گولہ و بارود بنانے والے کارخانوں کے جو ہماری سرحد کے دوسری طرف تھے اور حکومت بنگال کے ساز وسامان سے لیس پریس کے اثاثوں کو تقسیم کرنے سے انکار کردیا تھا''۔ (قائداعظم جناحؒ۔ جیسا میں انہیں جانتا ہوں۔ از: حسن اصفہانی۔صفحہ 370۔پبلشر آتش فشاں لاہور)۔

اس کے تو دستاویزی ثبوت بھی آچکے ہیں کہ انگریز نے تقسیم پنجاب اور تقسیم بنگال کے لئے جو دو بونڈری کمشن قائم کئے تھے عین وقت پر ان کے طے شدہ فیصلے تبدیل کردیئے گئے۔پنجاب بونڈری کمشن میں جب تقسیم کے لئے تحصیل کو یونٹ قرار دیا جا چکا تو ضلع فیروز پور کی دو تحصیلیں فیروز پور اور زیرہ اور ضلع جالندھر کی دو تحصیلیں نکودر اور جالندھر مسلم اکثریتی ہونے کی وجہ سے پاکستان کا حصہ تھیں۔

جسٹس منیر بھی اس بونڈری کمشن کے ایک مسلمان رکن تھے۔22،23،24 جون 1964ء کے پاکستان ٹائمز لاہور میں ''ڈیز ٹو ریممبر'' کے عنوان سے انہوں نے ایک طویل مضمون لکھا جس میں لارڈ مونٹ بیٹن کی ناانصافیوں پر خوب روشنی ڈالی۔فیروز پور اور زیرہ تحصیلوں کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''اس امر کی دوٹوک شہادت موجود ہے کہ پنجاب ایوارڈ کو 8 اگست کو قطعی صورت دے دی گئی تھی..... تاہم یہ طے شدہ بات ہے کہ پنجاب ایوارڈ کے مشمولات جن سے سرایون جینکنز (گورنر پنجاب) کو مطلع کرنا ضروری تھا وہ اسی رات ٹیلی فون پر ان کو بتا دیئے گئے۔ اس طرح جو معلومات انہیں دی گئیں انہیں لکھ لیا گیا۔

''ان معلومات کے مطابق فیروز پور اور زیرہ تحصیلیں پاکستان میں آتی تھیں۔ اور سرسیرل (ریڈکلف) نے بالکل یہی بات مجھے اس وقت بتائی جب میں نے ان سے باضابطہ ملاقات کی تھی۔ جب 17 اگست کو ایوارڈ کا اعلان کیا گیا تو یہ تحصیلیں بھارت کا حصہ قرار دی گئیں۔آخر یہ کیسے ہو گیا؟ اس کا واحد ممکنہ جواب یہی ہے کہ سرسیرل نے 8 اور 17 اگست کے درمیانی عرصہ میں، جبکہ وہ نئی دہلی میں تھا، کسی وقت ایوارڈ میں تبدیلی کردی تھی۔ یہ بھی واضح ہے کہ وہ یہ تبدیلی اپنے طور پر نہیں کرسکتا تھا کیونکہ یہ بات اس کے علم میں آچکی ہوگی

کہ اور جنل ایوارڈ سے سرایون جینکنز کو مطلع کیا جاچکا تھا۔ اور آٹھ تاریخ کے بعد ایسے تازہ دلائل اس تک نہیں پہنچے تھے جو اسے اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کی ترغیب دیتے۔ لہٰذا اس سے یہی نا قابل تردید نتیجہ نکلتا ہے کہ اسے مطلوبہ تبدیلی کے لئے لارڈ مونٹ بیٹن نے مجبور کیا ہوگا''۔

ہوگا والی بات تو خود سرسیرل ریڈکلف نے ختم کردی جب اس نے اقرار کیا کہ ''اس نے جو کچھ کیا وائسرائے کے زیر اثر کیا''۔

انگریز کی اس جانبداری کی خاصی تفصیل ایک ہندو مصنف کنورسین کی تصنیف THE REMINISCENCES OF AN ENGINEER (ایک انجینئر کی یادیں) میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

اسی طرح بنگال میں ہوا۔ جسٹس ایس اے رحمٰن جو اس بونڈری کمشن کے ایک ممبر تھے وہ حسن اصفہانی کے نام اپنے خط میں لکھتے ہیں:-

''جب ایوارڈ کا اعلان ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انہوں نے کریم گنج اور بدر پور کے مسلمان اکثریت کے علاقے بھارت کو دے دیئے ہیں اور ہمیں صرف سلہٹ کے تین غیر مسلم اکثریت کے تھانے اور ان کے گرد کا ایک مختصر سا علاقہ دیا ہے۔ اس طرح انہوں نے ہمیں مسلم اکثریت کے علاقے کے ایک بڑے ٹکڑے سے محروم کردیا اور اس پر طرہ یہ کہ ہمیں کچھار میں سے ایک انچ زمین بھی نہیں دی۔ اور کچھ نہ کہا جائے تو کم از کم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک انتہائی تعجب خیز اور غیر منصفانہ فیصلہ تھا۔ پسِ پشت کیا کچھ ہوتا رہا یہ میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن آپ اپنے نتائج خود نکال سکتے ہیں''۔ (قائداعظم جناحؒ۔ جیسا میں انہیں جانتا ہوں۔ صفحہ 357)۔

کلکتہ کے ضمن میں چودھری محمد علی لکھتے ہیں:-

''مسلم لیگ کلکتہ کو جو اہمیت دیتی تھی اور شہر کے متعلق ان کے مطالبے میں جو قوت تھی، مونٹ بیٹن ان دونوں باتوں سے پوری طرح آگاہ تھا''۔

کیمبل جانسن نے لکھا ہے کہ

''25 اپریل کو اپنے عملے کے ایک اجلاس میں مونٹ بیٹن نے کلکتہ کے مستقبل کے

بارے میں پیشگی اندیشے کا اظہار کیا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ مسلمان اس کے لئے استصواب کا مطالبہ کر کے رہیں گے اور اس کی قسمت کا فیصلہ ایک بہت اہم مسئلہ بن جائے گا۔ لیکن اس کے خیال میں یہاں حق خوداختیاری کو عمل میں لانا بہت ناپسندیدہ ہوگا۔ کیونکہ اس سے غلط جواب حاصل ہونے کا احتمال ہے''۔ (حوالہ: ''مشن ود مونٹ بیٹن''۔ صفحات: 71-72)۔

غلط جواب سے ظاہر ہے مونٹ بیٹن کا اشارہ مسلم لیگ کے حق میں فیصلہ سے تھا۔ اگر مونٹ بیٹن فی الحقیقت غیر جانبدار ہوتا تو بطور وائسرائے اسے اس بات سے سروکار نہیں ہونا چاہئے تھا کہ کلکتے کے لوگوں سے رجوع کرنے سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے؟ لیکن وہ غیر جانبدار نہیں تھا۔ اس کے برعکس، جیسا کہ بعد میں سردار پٹیل نے انکشاف کیا، وہ کانگریس کے لیڈروں سے خفیہ معاہدہ کر چکا تھا کہ کلکتہ ہندوستان کو دے دیا جائے گا۔

''15 جولائی 1950ء۔ کلکتہ میں ایک جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے پٹیل نے کہا: ''ہم نے یہ شرط لگائی تھی کہ صرف اسی صورت میں ہم تقسیم پر رضامند ہوں گے کہ ہمیں کلکتہ سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اگر تقسیم پر رضامند ہوں گے کہ ہمیں کلکتہ سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اگر کلکتہ جاتا ہے تو پھر ہندوستان بھی نہیں رہتا''۔ (روزنامہ ''ہندو'' 16 جنوری 1950ء۔ بحوالہ: ظہور پاکستان۔ چودھری محمد علی۔ صفحات: 255-256)۔

یوں برطانوی حکومت کی شہ پر انگریز وائسرائے نے ہندو کانگریس کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے مسلمانوں کے ساتھ جو زیادتی کی اس پر قائداعظمؒ کو یہ کہنا پڑا کہ یہ وہ پاکستان نہیں جس کے لئے ہم نے جدوجہد کی۔ اسے انہوں نے کٹا پھٹا اور کرم خوردہ پاکستان قرار دیا۔

پاکستان کو مزید ناقابل عمل بنانے کے لئے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس پر مہاجرین کا ایسا زبردست دباؤ ڈالا گیا کہ یہ واقعی چھ ماہ بعد بھارت سے درخواست کرنے پر مجبور ہو کہ اسے دوبارہ اپنے ساتھ شامل کر لیا جائے۔

اس سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری مرحوم سید شمس الحسن 7 اگست 1947ء کو دہلی میں قائداعظمؒ کے ساتھ اپنی ملاقات کا حال اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

..... مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر کاغذات انہوں نے ایک طرف کر دیئے اور اپنے مخصوص اور دل آویز انداز میں اپنی مونوکل ہٹاتے ہوئے مجھ سے شہر کی صورت حال کے

متعلق دریافت فرمایا۔ میں نے انہیں بگڑتی ہوئی فرقہ وارانہ کشیدگی کے متعلق بتایا اور مسلمانوں کی اس تشویش سے بھی آگاہ کیا کہ بڑے پیمانے پر ان کے قتل عام کے ایک منظم منصوبے پر عمل ہونے کو ہے۔

''اس اطلاع پر قائدؒ بے حد پریشان ہوئے۔ انہوں نے مشرقی پنجاب میں ہندوؤں کے انسانیت سوز سلوک کا حوالہ دیا کہ کس طرح لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت نہرو نے حالیہ مذاکرات کے دوران میں انہیں یقین دلایا تھا، اس کے باوجود مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا منظم قتل عام شدت سے جاری رکھنے کی دانستہ اجازت دے دی گئی..... میں نے قائدؒ کو کبھی اس طرح افسردہ اور پریشان نہیں پایا تھا''۔(صرف مسٹر جناحؒ۔ صفحات: 17، 18۔ پبلشر: آتش فشاں لاہور)۔

کے ایچ خورشیدؒ کہتے ہیں:

''لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کو وجود میں آنے کے ساتھ ہی ختم کر ڈالنے کے لئے یہ اقدامات کئے:

اول:۔ نام نہاد جنرل موہن سنگھ نے پرائیویٹ فوج تیار کر رکھی تھی جس میں ریاست ہائے پھلکیاں، بالخصوص جیند اور نابھہ کے فوجی شامل تھے۔ ان ریاستوں کے اجداد نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے غداری کی تھی۔ موہن سنگھ کو مشرقی پنجاب میں غارت گری کی کھلی چھٹی دے دی گئی''۔ (آتش فشاں۔ قائداعظمؒ نمبر۔ صفحہ 249)۔

ان اقدامات کے نتیجے میں پاکستان پر مہاجرین کا جو بوجھ پڑا اس کا مقصد بھی اس نوزائیدہ مملکت کو ختم کرنا تھا۔ بقول سر ظفر اللہ خاں:

''..... میں نے کسی غیر پاکستانی سے سنا کہ ہم قائل ہوگئے کہ پاکستان نے اپنی ہستی کو پورے طور پر ثابت کر دیا ہے کہ اتنے بڑے امتحان میں سے بچ نکلے ورنہ مہاجرین والا ہی اتنا بڑا معاملہ تھا کہ اس پر ہی ٹوٹ جاتا''۔ (سیاسی اتار چڑھاؤ۔ صفحہ 98۔ آتش فشاں لاہور)

ہندوستانی ریاستوں کے ضمن میں انگریز وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن نے طے شدہ اصول سے ہٹ کر جو پالیسی اختیار کی وہ آج پاکستان کے لئے کئی مسائل کا سبب بنی ہوئی ہے۔ بالخصوص جونا گڑھ،

مناودر، مانگرول، حیدرآباد اور کشمیر کے سلسلے میں۔ اول الذکر چار ریاستوں کے حکمران مسلمان تھے۔ آبادی کی اکثریت ہندو تھی۔ وہاں تو یہ مؤقف اختیار کیا گیا کہ ان ریاستوں کی اکثریتی آبادی ہندو ہے۔ انہیں بھارتی یونین کا حصہ ہونا چاہئے۔ کشمیر میں حکمران ہندو تھا آبادی 85 فی صد مسلمان تھی۔ یہ کلیہ وہاں نہ استعمال کیا گیا۔

چودھری محمد علی لکھتے ہیں:

''.....3 جون کے منصوبہ کے اعلان کے بعد نظام نے یہ اعلان کیا کہ وہ نہ ہندوستان سے الحاق کرے گا اور نہ پاکستان سے۔ اسے اپنی ریاست کے لئے ڈومینین کا درجہ حاصل کر لینے کی توقع تھی۔ چنانچہ اس نے 11 جولائی 1947ء کو ایک وفد وائسرائے کے پاس بھیجا۔ مونٹ بیٹن نے وفد کو بتایا کہ حکومت برطانیہ حیدرآباد کو ڈومینین کا درجہ دینے پر آمادہ نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اس نے حیدرآباد پر ہندوستان سے الحاق کرنے کے لئے زور دیا، لیکن یہ بات نظام کے لئے قابلِ قبول نہیں تھی۔ جب وفد کی طرف سے اشارۃً یہ کہا گیا کہ اگر ہندوستان نے نظام پر بہت زیادہ دباؤ ڈالا تو پھر وہ پاکستان سے الحاق کرنے پر بھی غور کر سکتا ہے، تو مونٹ بیٹن نے یہ جواب دیا: ''اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ قانونی طور پر نظام کو یہ حق حاصل ہے لیکن جغرافیائی حقائق کی وجہ سے جو مشکلات درپیش ہیں وہ بہت ٹھوس ہیں۔ کوئی دھمکی دیئے بغیر اس نے پیش گوئی کی کہ اگر اس کے مشورہ کو قبول نہ کیا گیا تو پانچ یا دس سال کے اندر ریاست کو تباہ کن نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا''۔ مونٹ بیٹن جن جغرافیائی حقائق کی طرف اشارہ کر رہا تھا وہ یہ تھے کہ حیدرآباد کو سمندر تک کوئی راستہ نہ تھا اور یہ ریاست چاروں طرف سے ہندوستانی علاقے سے گھری ہوئی تھی''۔ (ظہور پاکستان۔ صفحہ 334)

انگریز وائسرائے لارڈ مونٹ بیٹن کو حیدرآباد کے بارے میں تو یہ جغرافیائی حقائق نظر آ رہے تھے لیکن کشمیر جو جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی، تاریخی، مذہبی، ہر اعتبار سے پاکستان کا حصہ تھا اور جہاں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی وہاں اسے یہ حقائق نظر نہیں آ رہے تھے۔ حیدرآباد کے بارے میں تو اس کا خیال تھا کہ ''حیدرآباد کی ساری ہندو آبادی ہندوستان سے الحاق کے حق میں ہے۔ وہ بار بار اس بات پر زور دیتے تھے کہ حیدرآباد کے مسئلے کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دینا چاہئے''۔ (ایضاً۔ صفحہ 336)۔

لیکن وہ کشمیر کے ضمن میں ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جہاں ہر روز جلوس نکل رہے تھے اور پوری وادی ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ اس کے توڑ کے لئے جون 47ء کے تیسرے

ہفتے میں مونٹ بیٹن نے کشمیر میں چار دن بسر کیئے اور مہاراجہ کے ساتھ صورت حال پر بات چیت کرتا رہا۔

''جب ہندوستانی کابینہ کو کشمیر میں قبائلی یلغار کی اطلاع ملی تو وہ'' حکومت کشمیر کی ایک پہلے سے آئی ہوئی درخواست پر اسلحہ اور گولہ وبارود بہ عجلت تمام بھیجنے کی خواہاں تھی'' لیکن مونٹ بیٹن نے زور دیا کہ اس سے پہلے ریاست کا الحاق حاصل کر لینا چاہئے''۔(ایضاً۔ صفحہ 350)۔

26 اکتوبر 47ء کو لارڈ اور لیڈی مونٹ بیٹن نے آین سٹیفنز کو ڈنر پر دعوت دی۔ وہ لکھتا ہے۔

''معاملات پر ان کے یک طرفہ فیصلوں سے میں دنگ رہ گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کلی طور پر ہندوؤں کے حامی بن گئے ہیں۔ اس رات گورنمنٹ ہاؤس کا ماحول قریب قریب جنگ کے زمانے کا سا تھا۔ پاکستان، مسلم لیگ اور مسٹر جناحؒ دشمن تھے۔ پٹھانوں کے حملہ کے باعث عین اس وقت ہندوستان سے مہاراجہ کے باقاعدہ الحاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جا رہا تھا۔ یہ عظیم ریاست جس کے بیشتر باشندے مسلمان تھے، بشرط استصواب قانونی اعتبار سے جناح کے ہاتھوں سے نکلی جا رہی تھی۔ جوناگڑھ کا الحاق قبول کرنا پاکستان کی دیوانگی تھی۔ ہندوستانی افواج آناً فاناً کشمیر میں طیاروں کے ذریعہ پہنچائی جائیں گی۔ سارا بندوبست کیا جا چکا ہے۔ یہ تھا مونٹ بیٹن کا انداز گفتگو''۔(ایضاً: صفحہ۔ 351)۔

اس امر کی ٹھوس تفصیلات آ چکی ہیں کہ مہاراجہ کشمیر کی طرف سے جس الحاق نامے کو بنیاد بنا کر کشمیر کو بھارت میں شامل کی گیا وہ جعلی تھا۔

جب سیکورٹی کونسل میں قرارداد پیش تھی اور ہندوستانی مندوب کے مطالبے پر اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ اس پر چودھری ظفر اللہ خاں کہتے ہیں:-

''.....اجلاس کے التوا کی مدت بڑھتی چلی گئی تو چودھری محمد علی اور میں نے فیصلہ کیا کہ لندن جائیں اور وہاں معاملے کا کھوج لگائیں۔ چودھری صاحب کی رائے تھی کہ اس وقت معاملہ لندن اور دہلی میں زیر بحث ہے۔ لندن میں ہم نے برطانوی وزیر خارجہ مسٹر ارنسٹ بیون سے ملاقات کی۔ اتفاق ایسا تھا کہ جس روز میں گیارہ بجے وزیر خارجہ سے مل رہا تھا اسی دن میری وزیراعظم برطانیہ مسٹر اٹیلی سے اپوائنٹمنٹ تھی۔ وزیر خارجہ ہماری بات سننے کے بعد کہنے لگے،'' مجھے آپ سے اتفاق ہے اور ہمدردی بھی، لیکن ہندوستان کے معاملات میں

وزیراعظم پر کرپس کا بڑا اثر ہے اور وہ اس معاملے میں وزیراعظم کے پیچھے پڑا ہوا ہے''.....اس طرح لارڈ مونٹ بیٹن جو وزیراعظم ایٹلی کا چہیتا تھا اس کے ذریعے کرپس مسٹر ایٹلی پر اثر انداز رہا۔ اور برطانیہ کا موقف اس حد تک تبدیل کرادیا کہ اگر کوئی ریزولیوشن پاس ہو تو وہ ہندوستان کے موقف کے مطابق ہو''۔

(سیاسی اتار چڑھاؤ۔صفحات:62-63)۔

اس انٹرویو میں ایک اور جگہ چودھری ظفراللہ خاں کہتے ہیں:۔

کشمیر پر بحث کے دوران فروری 1948ء میں میں نے کہا کہ ہماری ریگولر فوج وہاں نہیں لڑ رہی۔ ہندوستان والوں نے لارڈ مونٹ بیٹن کا اثر وغیرہ ڈلوا کے ریزولیوشن رکوالیا۔ اور ہندوستان نے ارادہ کر رکھا تھا کہ یو این او میں تو بات روک لی ہے۔ ہم کشمیر پر جتنا قبضہ کر سکتے ہیں کر لینا چاہئے''۔(ایضاً۔صفحہ 129)۔

اس ساری تفصیل کے بعد پیر پگارا کی اس دلیل میں بھی کیا وزن رہ جاتا ہے کہ''برطانوی وزیراعظم چرچل کی پنجاب کے اس وقت کے وزیراعظم سر سکندر حیات سے قاہرہ میں ملاقات ہوئی تو چرچل نے کہا کہ مسلمانوں نے سلطنت برطانیہ کے لئے جو قربانیاں دی ہیں ان کی بلڈمنی کے طور پر انہیں الگ ریاست دی جائے گی''۔

سر سکندر حیات کب پاکستان کے حامی تھے۔انہوں نے 40ء کا لاہور سیشن، جس میں مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کی قرارداد پیش ہونا تھی، رکوانے کی پوری کوشش کی۔ بلکہ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اجلاس سے چند روز پہلے 19 مارچ کو، خاکساروں کے جلوس پر جو فائرنگ ہوئی اور جس کے نتیجے میں سیاسی فضا خاصی سوگوار ہوگئی وہ سب سکندر حیات کا منصوبہ تھا۔تاہم یہ چیز تو ریکارڈ پر موجود ہے کہ خاکساروں والے سانحہ کے بعد سکندر حیات نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ لاہور سیشن ملتوی کر دیا جائے لیکن قائداعظمؒ کے عزم صمیم کے آگے اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ پاکستان مخالف چرچل سکندر ملاقات کا ذکر تو بہت کرتے ہیں لیکن آج تک کوئی اس ضمن میں ٹھوس شہادت پیش نہیں کر سکا۔

انٹرویو مذکور میں پیر صاحب ایک جگہ کہتے ہیں:''دیکھو بھئی۔ سچ سے تکلیف تو ہوتی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جس طرح دیگر بااثر لوگوں کو انگریز نے مسلم لیگ میں بھیجا تھا، علامہ اقبالؒ بھی اسی طرح مسلم لیگ میں آئے تھے۔آپ یہ بتائیں کہ علامہ اقبالؒ کس کے کہنے پر قائداعظمؒ کے پاس گئے تھے۔ دیکھو

بھئی، جتنے بھی بااثر لوگ تھے وہ انگریزوں کے کہنے پر مسلم لیگ میں آئے تھے"۔

جہاں تک علامہ اقبالؒ کے متعلق پیر صاحب کا یہ کہنا ہے کہ" آپ یہ بتائیں کہ علامہ اقبالؒ کس کے کہنے پر قائداعظمؒ کے پاس گئے تھے"۔ ہم پیر صاحب کو بتاتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کسی کے کہنے پر بھی قائداعظمؒ کے پاس نہیں گئے تھے۔ ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ قائداعظمؒ کے پاس گئے ہی نہیں تھے پھر کسی کے کہنے یا نہ کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بہت لوگ یہ غلطی کر جاتے ہیں، بلکہ پاکستان ٹیلی ویژن پر بھی میں نے یہ غلطی دیکھی کہ جب قائداعظمؒ نے 1931ء میں لندن میں سکونت اختیار کر لی تو انہیں واپسی پر علامہ اقبالؒ نے خطوط کے ذریعے آمادہ کیا۔ اقبالؒ قائداعظمؒ ملاقات کی بات کتنی ہی درست کیوں نہ ہو تو بھی اس پر کلی انحصار نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ ریکارڈ کی چیز نہیں۔ اس طرح تو لیاقت علی خاں نے بھی لندن جا کر قائداعظمؒ سے ملاقات کی تھی اور ان سے ہندوستان واپس آنے پر اصرار کیا تھا۔ جب دستاویزی ریکارڈ موجود ہو تو اولیت اسی کو حاصل ہوتی ہے۔ جو چیزیں ریکارڈ پر ہیں ان میں سے ایک تو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کی وہ قرارداد ہے جو 12 مارچ 1933ء کو دہلی اجلاس میں پیش ہوئی جس میں قائداعظمؒ سے پر زور اصرار کیا گیا کہ وہ ہندوستان واپس آ کر پھر سے مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں۔ دوسرے، وہ خطوط ہیں جو آسام کے عبدالمتین چودھری قائداعظمؒ کو لکھتے رہے۔ تیسرے، پشاور کے میاں عبدالعزیز، جو آل انڈیا مسلم لیگ کے بانیوں میں سے تھے اور اس کے صدر بھی رہے، کا خط۔ یہ تین چیزیں ریکارڈ پر ہیں۔

ایک طرف تو پیر صاحب کہتے ہیں کہ" بااثر لوگوں کو انگریز نے مسلم لیگ میں بھیجا تھا"۔ دوسری طرف وہ سندھ کے سومرو خاندان کے متعلق کہتے ہیں" سومرو خاندان شروع سے ہی سلطنت برطانیہ کا وفادار تھا"۔ ان کی مراد اللہ بخش سومرو خاندان سے ہے۔ تو پھر اللہ بخش سومرو قائداعظمؒ کے اصرار کے باوجود مرتے دم تک کانگریسی کیوں رہے؟ پیر صاحب کی یہ دلیل بے وزن ہے کہ وہ اس لئے مسلم لیگ میں نہ آئے" کیونکہ مسلم لیگ میں سر غلام حسین ہدایت اللہ اور ایوب کھوڑو موجود تھے جو کبھی سومرو کو وزیر اعلیٰ نہ بننے دیتے"۔

اللہ بخش سومرو مسلم لیگ میں آ جاتے تو ان کی سندھ میں جو مسلمہ حیثیت تھی اسے کوئی فرق نہ پڑتا۔ چلو وہ تو 43ء میں قتل ہو گئے۔ ان کے خاندان کے دیگر مؤثر لوگ جو بقول پیر پگارا سلطنت برطانیہ کے وفادار تھے انہوں نے کیوں نہ مسلم لیگ جائن کی؟ مثلاً ان کے بھائی مولا بخش سومرو تھے۔ جبکہ ان میں سے کوئی کانگریسی ووٹوں سے وزیر اعلیٰ بھی نہ بنا۔

ہم نے پیچھے جو ٹھوس ثبوت پیش کئے ہیں کہ کس طرح انگریز قیام پاکستان کے مخالف تھے۔ وہ بھی پیر صاحب پگارا کی اس بے وزن دلیل کی سخت کاٹ کرتے ہیں:" بااثر لوگوں کو انگریز نے مسلم لیگ میں

بھیجا تھا''۔

پیر صاحب کہتے ہیں کہ ''برٹش امپائر نے تمام ہندوستانی نوابوں، باعزت افراد اور اہم افراد کو الگ ملک بنانے کا راستہ دکھایا''۔

پنجاب کی یونینسٹ پارٹی جاگیرداوں، نوابوں اور بڑے بڑے زمینداروں کی پارٹی تھی اور سب کے سب انگریز کے کاسہ لیس۔ وہ تو آخیر دم تک قیام پاکستان کی مخالفت کرتے رہے بلکہ سرخضر حیات ٹوانہ کی حکومت نے مسلم لیگ کی راہ میں بے پناہ روڑے اٹکائے۔ ان نوابوں اور زمینداروں کو تو انگریز نے مسلم لیگ میں نہ بھیجا جبکہ وہ ٹوڈی تھے، انگریز کے ذہنی اور فکری لحاظ سے غلام۔ مجھے سید امجد علی نے بتایا، پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے سرخضر حیات ٹوانہ سے پوچھا کہ آپ نے پاکستان کی اس قدر مخالفت کیوں کی؟ ٹوانہ نے جواب دیا، انہیں انگریز گورنر گلینسی نے یقین دلایا تھا پاکستان نہیں بنے گا۔

پیر صاحب کو معلوم ہوگا کہ 45ء، 46ء کے الیکشن پاکستان کی بنیاد پر تھے۔ اگر مسلم لیگ جیت گئی تو پاکستان۔ ہار گئی تو متحدہ ہندوستان۔ اس وقت پنجاب میں یونینسٹ گورنمنٹ تھی۔ اس نے مسلم لیگ کو ہرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ مسلم لیگ مخالف امیدواروں سے اتحاد قائم کئے۔ یہاں میں سیالکوٹ کی مثال دیتا ہوں۔ چار سیٹیں تھیں۔ مسلم لیگی امیدوار چاروں سیٹوں پر کھڑے تھے۔ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کے مقابلے میں نواب محمد دین مرزائی تھے۔ چودھری سرفراز کے مقابلے میں احراری امیدوار صاحبزادہ فیض الحسن تھے۔ چودھری ناصر دین کے مقابلے میں یونینسٹ امیدوار غلام جیلانی تھے۔ شہر کی نشست پر مسلم لیگ کے شیخ کرامت علی کے مقابلے میں احرار کے مولوی مظہر علی اظہر تھے۔ احراریوں، مرزائیوں اور یونینسٹوں نے مسلم لیگ کے مقابلے میں ایکا کرلیا۔ لطف یہ کہ مرزائیوں کے ترجمان اخبار ''الفضل'' مورخہ 31 جنوری 1946ء صفحہ 12، کالم 1 میں ''ایک ضروری اعلان'' کے تحت اپنے پیروکاروں کو حکم دیا گیا: ''تحصیل ڈسکہ کی تمام جماعتوں کو اطلاع دی جاتی ہے کہ تمام احمدی ووٹ نیز ان کے زیراثر ووٹ صاحبزادہ فیض الحسن صاحب آلومہار کے حق میں گزاریں''۔ اس کا علامہ میر محمد ابراہیم سیالکوٹی نے سخت نوٹس لیتے ہوئے کہا: ''احرار جن احمدیوں کی مخالفت کا ڈھول پیٹا کرتے تھے، اب ان کے سامنے ووٹوں کے حصول کے لئے ناک گھسیاں کررہے ہیں اور ماتھے رگڑ رہے ہیں''۔ اس کی ہوش ربا تفصیل سیاسی اتار چڑھاؤ (پبلشر: آتش فشاں لاہور) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جس انگریز نے مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ سے اپنی بعض شرائط منوانے کی غرض سے احراریوں اور مرزائیوں سے اس کے خلاف 1931ء میں ایک بھرپور تحریک شروع کرادی تھی وہ ان شعلہ بیاں مقرروں

کومسلم لیگ کی طرف کیوں نہ لایا۔اس لئے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پاکستان وجود میں آئے بلکہ وہ ایسے لوگوں کی پیٹھ ٹھونک کر پاکستان کو ورثے میں ایک ایسا طبقہ دے گیا ہے جوفکری اورنظریاتی طور پر آج بھی ہندو کانگریس کا غلام اور پاکستان کا اشد دشمن ہے۔تبھی تو آئے روز ولی خانوں اور پیر پگاڑؤں کی زبانی نت نئے شگوفے چھوٹتے رہتے ہیں۔

جب پاکستان کا قیام ناگزیر ہوگیا تو بقول مولانا ابوالکلام آزاد''عبدالغفار خاں پر سکتہ طاری ہوگیا''۔اب وہ آزاد پٹھانستان کے لئے سرگرم ہوجاتے ہیں۔ان کی اس سرگرمی کے پیچھے سرحد کے انگریز گورنراولف کیرو کاہاتھ تھا۔اس کی تفصیل''ٹرانسفرآف پاور'' جلد دہم،صفحہ 944 پرموجود ہے۔جس کے مطابق سراولف کیرو نے 22 مئی 47ء کو اس وقت کے قائم مقام وائسرائے سرجان کول ول (COLVILLE) کو یہ خوشخبری دی کہ اس کی یعنی ڈاکٹرخان صاحب کی وزارت اورعبدالغفارخاں نے پٹھانستان پرپراپیگنڈے کاآغازکردیاہے۔

اگر پاکستان انگریز بنارہاتھاتو پھروہ سرحد کے خان برادران سے پاکستان کو پیدائش کے ساتھ ہی کمزورکرنے کے لئے اس قسم کی کارروائیاں کیوں کررہاتھا۔وہ سرحدی گاندھی کی پیٹھ کیوں ٹھونک رہاتھا۔ محض اس لئے کہ پاکستان ایک کمزور اور مسائل سے معمور مملکت کے طور پر وجود میں آئے اور جلد ہی انڈین یونین کا حصہ بننے کی درخواست کرے۔وہ انڈین یونین جس کے ٹوٹنے کا انگریز کوازحد صدمہ تھا۔اس کی کچھ تفصیل ہم پیچھے بیان کرچکے ہیں۔

پیرصاحب کہتے ہیں کہ''مسلم لیگ بااثر لوگوں کی جماعت تھی یہ عوامی جماعت نہیں تھی کہ جس کے ووٹر ہوں۔بااثر لوگوں کے ماننے والے اسے ووٹ دیتے تھے''۔پیرصاحب کے اس موقف میں کس قدر تضاد ہے۔ایک طرف تو وہ کہتے ہیں کہ مسلم لیگ بااثر لوگوں کی جماعت تھی۔ساتھ ہی کہتے ہیں یہ عوامی جماعت نہیں تھی۔عجیب منطق ہے۔مسلم لیگ بااثر لوگوں کی جماعت بھی تھی اورعوامی بھی نہیں تھی۔پھر مان بھی جاتے ہیں کہ بااثر لوگوں کے ماننے والے اسے ووٹ دیتے تھے۔پیرصاحب کا اصل میں یہ موضوع نہیں تھا جسے وہ چھیڑ بیٹھے ہیں اس لئے ان کے جوابات میں تاریخی حقائق سے چشم پوشی بھی ہےاورکنفیوژن بھی۔عوامی جماعت تو اس وقت تھی ہی مسلم لیگ پورے برصغیر میں۔بڑے بڑے جدی پشتی اور خاندانی نواب،وڈیرے،بعض گدی نشین مسلم لیگ کے ایک عام ورکر سے ہار گئے تھے۔اگرمسلم لیگ کے ووٹرزنہیں تھےاس قدر بھرپور اور لینڈ سلائڈ وکٹری اسے کس طرح حاصل ہوگئی جس میں بڑے بڑے جگادری برج بھی الٹ گئے۔

باقی ان کا یہ کہنا کہ اس میں نواب تھے۔تو ان نوابوں کا یہ حال تھا،جیسا کہ سید شمس الحسن رقم طراز ہیں۔

..عام طور پر یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ یہ نوابوں اور جاگیرداروں کی تنظیم تھی۔
جبکہ حقیقت یہ ہے کہ لیگ کو نوابوں اور جاگیرداروں سے کوئی مالی معاونت نہیں ملتی تھی۔ اس کے مرکزی دفتر کی کفالت کا زیادہ تر انحصار عام ارکان کے چندے پر تھا۔ چندہ اکٹھا کرنا ایک کٹھن کام تھا۔ ہم چندے کی اپیلیں وی پی پی (Value payable parcel) کے ذریعے بھیجتے۔ ان میں سے زیادہ تر بغیر وصول کئے اسی طرح واپس آجاتیں..... جہاں تک قائدؒ کا تعلق تھا وہ عطیات کے لئے کوئی عوامی اپیل کرنا اصولاً پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ مجھے بار بار کہتے کہ لیگ کے ارکان کو اپنی ذمہ داری محسوس کرنی چاہئے اور اپنا چندہ باقاعدگی سے ادا کرنا چاہئے''۔(..... صرف مسٹر جناح صفحہ 76)

ولی خاں کے متعلق پیر صاحب نے کہا ہے کہ''..... ولی خاں نے جب اس بارے میں بیان دیا تو جنرل ضیاء الحق نے انہیں اس معاملہ پر گفتگو کی دعوت دی۔ ولی خاں نے جواباً ایک فوٹوسٹیٹ کاپی انہیں بھیجی جس میں واضح طور پر یہ لکھا تھا کہ مسلم اسٹیٹ بنانے کا فیصلہ 1940ء سے پہلے ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ضیاء الحق خاموش ہو گئے۔ میں نے لندن جا کر تو تحقیق نہیں کی لیکن میری معلومات یہی ہیں''۔
اچھی بات ہے کہ پیر صاحب نے مان لیا ہے کہ ان کی معلومات بلاتحقیق ہیں۔ وار ولی خاں بھی تاریخ پر اوچھا ہی کرتے ہیں اور وار پیر صاحب نے بھی اوچھا ہی کیا ہے۔ اوچھے وار کو پیچھے ہمیشہ ذاتی رنجش ہوتی ہے۔ پیر صاحب کی رنجش میں بعد میں بیان کرتا ہوں پہلے ولی خاں۔
ولی خاں کے''حقائق حقائق ہیں'' کا توڑ تو ان کتب میں دیکھا جاسکتا جو چند ایک نے جواباً لکھی ہیں۔ میں ایک دفعہ اسلام آباد سردار شوکت حیات سے ملا۔ سردار صاحب کہنے لگے، ولی جب بھی اسلام آباد آتا ہے میرے پاس ٹھہرتا ہے۔ پھر سردار صاحب ریک میں لگی''ٹرانسفر آف پاور'' کی جلدوں کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے، میں نے ولی سے کہا ہے کہ جو کچھ تم نے لکھا ہے بتاؤ ان جلدوں میں کہاں ہے؟ ولی تم بات سیاق وسباق سے الگ ہو کر کرتے ہو۔
نہرو یونیورسٹی دہلی سے ایک پروفیسر کراچی آیا۔ اس نے تحریک آزادی، تحریک پاکستان اور قائداعظمؒ کے سکالر مرحوم خالد شمس الحسن سے بھی ملاقات کی۔ خالد صاحب کہتے ہیں کہ وہ پروفیسر کہتا ہے، ولی خاں توڑ مروڑ کے بات کرتا ہے۔ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو ہم اسے کب کا پاکستان کے خلاف استعمال کر چکے ہوتے۔
دراصل ولی خاں کی رنجش پاکستان کے وجود سے ہے جو ان کی تمام تر چالوں اور کوششوں کے باوجود وجود میں آکے رہا۔ اس رنجش کا اظہار انہوں نے پیر پگارا کے انٹرویو سے چند ہفتے قبل جنگ میں بھی کیا

ہے۔ اور وہ اکثر کہتے ہیں کہ انگریز نے پاکستان اس لئے بنایا کہ وقت آنے پر اسے روس کے خلاف استعمال کیا جاسکے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر انگریز کی یہ چال تھی تو پھر اس نے کٹا پھٹا اور مسائل سے اٹا ہوا پاکستان کیوں دیا۔ پھر تو وہ پورے پنجاب، پورے بنگال و آسام اور کشمیر سمیت ایک بھرپور پاکستان دیتا جو روس جیسی سپر پاور کے سامنے کم از کم کھڑا تو ہوسکتا۔ پھر لارڈ مونٹ بیٹن کشمیر پر بھارت کا قبضہ کرانے کی راہ ہموار نہ کرتا۔ بہت کہا گیا کہ مہاراجہ کشمیر ہری سنگھ کی درخواست پر کشمیر کا بھارت سے الحاق ہوا۔ اب یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ وہ الحاق نامہ جعلی تھا جس کے لئے مونٹ بیٹن نے مؤثر کردار ادا کیا تھا۔

اگر پاکستان کو سوویت یونین جیسی سپر پاور کے مقابلے کے لئے تشکیل دیا جارہا تھا تو پھر اسی لارڈ مونٹ بیٹن نے خان آف قلات کو پاکستان کے ساتھ الحاق نہ کرنے پر کیوں اکسایا؟ جبکہ قلات سٹیٹ اور بلوچستان کی پاکستان کے لئے سٹرٹیجک اہمیت از حد تھی۔ اور مونٹ بیٹن پاکستان اور بھارت کا مشترکہ گورنر جنرل بننے پر کیوں مصر رہا۔ یہاں قائداعظمؒ نے اس کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی۔ وہ خود راوی ہے کہ اس نے جناح صاحب سے کہا کہ آپ کو پتہ ہے اس ایک ناں کا نقصان ہوگا۔ قائداعظمؒ کا جواب تھا: بہت سارے اثاثے خطرے میں پڑ جائیں گے۔ مونٹ بیٹن کہتا ہے: میں نے کہا، بہت سارے نہیں سارے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ کیا ایسا پاکستان سوویت یونین جیسی سپر پاور کا مقابلہ کرسکتا تھا؟ 71ء کی پاک بھارت جنگ نے ثابت بھی کردیا کہ پاکستان بھارت سے بھی شکست نہ کھاتا اگر بھارت کو سوویت یونین کی اسلحی اور عسکری امداد حاصل نہ ہوتی۔

لارڈ مونٹ بیٹن کو پاکستان اور بھارت کا مشترکہ گورنر جنرل بنانے کی تجویز قائداعظمؒ نے مسترد کردی۔ کہ ایسا ناقابل عمل ہوتا۔ بقول چودھری ظفر اللہ خاں: ''اس کے تعلق میں ایک جناح صاحب نے تجویز پیش کی جس کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ اور وہ بہت ہی معقول تجویز تھی..... انہوں نے کہا، یہ تو میں نہیں مانتا کہ گورنر جنرل ایک ہو۔ ان کا اپنا ہو، ہمارا اپنا ہو۔ لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار ہوں کہ تقسیم کو عمل میں لانے کے لئے جن اختیارات کی ضرورت ہو وہ اختیارات تمہیں بادشاہِ برطانیہ کا نمائندہ مقرر کرکے دے دیئے جائیں۔ اور ان معاملات میں تمہارے حکم کی دونوں حکومتیں پابند ہوں اور اس کا تم تقسیم یا جو بھی تعلق ہو اس ضمن میں نفاذ کراسکو۔ مونٹ بیٹن نے کہا، ہز میجسٹی گورنمنٹ کو یہ تجویز پسند نہیں۔ قائداعظمؒ کی اگر وہ تجویز مان لی جاتی تو جتنے فسادات ہوئے یہ رک جاتے..... وہ تجویز جو قائداعظمؒ نے پیش کی تھی اس پر عمل کرنے سے مونٹ بیٹن کو اختیارات حاصل ہوجاتے، لیکن اس کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ (سیاسی اتار چڑھاؤ۔ صفحہ 56)۔

جزائرانڈیمان اورنکوبار کے متعلق قائداعظمؒ کا موقف تھا کہ یہ ہندوستان کا حصہ نہ تھے۔ اسے انگریز نے فتح کر کے ہندوستان میں شامل کیا تھا۔ یہ جزائر پاکستان کو ملنے چاہئیں۔ انگریز حکمرانوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ قائداعظمؒ کا یہ مطالبہ کس قدر دوررس تھا۔ 71ء میں گنگا طیارے کے اغوا کا ڈرامار چا کر بھارت نے اپنی فضائی حدود سے پاکستانی جہازوں کی پرواز روک دی تو مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ہمیں رابطے کے لئے سری لنکا کا سہارالینا پڑا۔ اگر جزائرانڈیمان اورنکوبار پاکستان کو مل گئے ہوتے تو اسے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کسی دوسرے ملک کا مرہون منت نہ ہونا پڑتا۔ اگر انگریز پاکستان سوویت یونین کے مقابلے کے لئے تخلیق کرر ہا تھا تو وہ اسے ورثے میں مسائل کا انبار نہ دیتا۔

قائداعظمؒ نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان رابطے کے لئے کوری ڈور مانگا۔ اس سے بھی انکار کر دیا گیا حالانکہ اسی برطانیہ نے پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر پولینڈ کو کوری ڈور دیا تھا۔ جنگ عظیم اول میں جرمنی، آسٹریا، ترکی اور بلغاریہ ایک طرف تھے۔ ان کے مقابلے میں برطانیہ، فرانس، سرویا، روس، بلجیم، جاپان، اٹلی اور امریکہ وغیرہ تھے اور انہیں اتحادی قوتیں کہا جاتا تھا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد 1919ء میں معاہدہ ورسے (Versailies) کی رو سے جب ان اتحادی قوتوں نے پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کے نئے آزاد و خودمختار ملک قائم کئے تو پولینڈ کو ساحل سمندر تک رسائی کے لئے کوریڈور دیا۔ پاکستان چونکہ انگریزوں کی خواہش اور کوشش کے برعکس وجود میں آرہا تھا۔ پھر اس کا وجود میں آنا وسط ایشیائی مسلم ریاستوں اور مشرق وسطی کے مسلم ممالک کے لئے ایک بہت بڑی قوت کا سبب بن رہا تھا، اس لئے انگریز حکمرانوں کی کوشش رہی کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو ایسا کٹا پھٹا اور کرم خوردہ پاکستان دیا جائے کہ 6 ماہ بعد ہی یہ ہاتھ جوڑ کر انڈین یونین میں شمولیت کی درخواست کرنے پر مجبور ہوں اور انگریز ہندوستان کو انتظامی طور پر ایک ملک بنانے کا جو کریڈٹ لے رہا ہے وہ برقرار رہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب آزادی کا بل برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوا تو انگریز پارلیمینٹیر ینز اس بات پر دکھ کا اظہار کرتے رہے کہ ہندوستان کی جو یونٹی، ایکا، وحدت انہوں نے قائم کی تھی پاکستان کے قیام کی صورت میں وہ ختم ہو رہی ہے۔

اب ولی خاں کی تضاد بیانی دیکھیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ پاکستان انگریز نے بنایا۔ کہتے چلے جائیں گے۔ پھر اچانک ریورس گیئر لگتا ہے تو گویا ہوتے ہیں کہ پاکستان تو ہم نے بنایا۔ مسلم لیگ کون ہوتی ہے پاکستان بنانے والی۔ بلکہ جن دنوں نواز شریف کی مسلم لیگ کے ساتھ ان کا اتحاد تھا تو انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ انگریز کو برصغیر سے مسلم لیگ کے سبز پرچم اور ہمارے سرخ جھنڈے نے نکالا۔ کبھی یہ

رٹ شروع کر دیتے ہیں کہ پاکستان تو نہرو نے بنایا۔

اگر خان عبدالولی خاں کے بیانات کو اکٹھا کیا جائے تو وہ بوکھلاہٹ، شکست خوردگی، پاکستان دشمنی، ذہنی خلجان اور تضاد بیانی کا شاہکار ہوں گے۔

پیر پگارا نے پہلی بار یہ راگ چھیڑا ہے۔ ان کا انٹرویو بغور پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں پاکستان سے رنجش نہیں۔ ان کی رنجش موجودہ حکمرانوں سے ہے کہ ضیاء الحق ان کے جو ناز اٹھاتے تھے موجودہ فوجی حکمران ایسا نہیں کر رہے۔ ضیاء الحق کی تو مجبوری تھی کہ انہوں نے بھٹو کو پھانسی پر چڑھایا تھا۔ انہیں سندھ میں کوئی متبادل چاہئے تھا۔ جنرل مشرف نے چونکہ کسی بھٹو کو دار پر نہیں لٹکایا اس لئے وہ بے نیاز ہیں۔ انہوں نے جس شخص کو بہتر سمجھا اسے سندھ کا گورنر بنا دیا، یعنی محمد میاں سومرو۔ یہ پیر صاحب کی انا کا مسئلہ بن گیا کہ ان کی مرضی کا گورنر کیوں نہیں بنایا گیا۔ یہ غصہ انہوں نے پاکستان کے وجود پر چھینٹے اڑا کے نکالا ہے۔ جن سے اگرچہ ان کا اپنا دامن ہی داغدار ہوا ہے۔ دوسری طرف سندھ کے سومرو خاندان پر جو دل کی بھڑاس نکالی ہے اس میں بھی بعض حقائق کو مسخ کر ڈالا ہے۔ جب نیت ذات کی ہو تو تضاد بیانی بھی آجاتی ہے۔

اب ایک طرف تو پیر صاحب پاکستان کو انگریزوں کی تخلیق کہتے ہیں۔ دوسری طرف اسی انٹرویو میں ایک جگہ کہتے ہیں: ''.....اگر بھارت کی بالا دستی تسلیم کرنی ہوتی تو ہم الگ کیوں ہوتے''۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہتے ہیں: ''پاکستان ٹوٹنے کے موقعہ پر بہت دکھ ہوا۔ ہم نے اپنے بزرگوں اور ہندوستان کے مسلمانوں سے غداری کی ہے''۔

ایک جگہ کہتے ہیں''.....برطانوی دور میں صرف ایک مارشل لا لگا وہ حروں کے خلاف تھا''۔ جس مارشل لا کا پیر صاحب نے ذکر کیا ہے وہ یکم جون 1942ء کو حروں کے خلاف لگا تھا۔ لیکن یہ برطانوی دور کا واحد مارشل لا نہیں تھا۔ اس سے پہلے 15 اپریل 1919ء کو ایک خوفناک مارشل لا پنجاب میں لگ چکا تھا۔

ایک جگہ تو پیر صاحب سر سید احمد خانؒ کو خواہ مخواہ بیچ میں گھسیٹ لائے ہیں۔ ان کا انتقال تو 1898ء میں ہو چکا تھا۔

یہ جو مختصر جائزہ ہم نے پیش کیا ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انگریز ہر حال میں ہندوستان کو متحد رکھنا چاہتا تھا۔ جب پاکستان ناگزیر ہو گیا تو اس نے کانگریسی قیادت سے مل کر ایسے اقدامات کئے کہ اس ملک کو ورثے میں بے شمار مسائل ملیں تاکہ نہرو کے بقول ''ہم نے پاکستان اس لئے قبول کیا ہے کہ کچھ دیر بعد یہ خود ہی مر جائے''۔ اور مونٹ بیٹن کے بقول: ''ہم محض ایک خیمہ نصب کر رہے ہیں۔ اس سے

زیادہ کچھ نہیں کر سکتے''۔اور سر ظفر اللہ خاں کے مطابق:''.....اس کی تو تحریری شہادت موجود ہے کہ انگریز پاکستان کے قیام کے سخت خلاف تھے۔موتٹ بیٹن کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کرتے وقت یہ ہدایت کی گئی تھی کہ کوشش کرو کہ کیبنٹ پلان پر عمل کراسکو۔اس نے جائزہ وائزہ لے کے رپورٹ کردی کہ اس کا امکان تو مجھے نظر نہیں آتا۔ پھر آگے بات نہیں چلی۔ادھر تو یہ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ انگریز کی پالیسی سارا وقت پاکستان کے خلاف رہی ہے، ہندوستان کے حق میں رہی ہے کیونکہ ہندوستان پاکستان کی نسبت کئی گنا بڑا ملک ہے۔اور انگلستان چاہتا ہے کہ اس کی دوستی اسے حاصل رہے۔اور کسی حد تک اس بات میں صداقت بھی ہے۔ادھر یہ کہتے ہیں کہ یہ بٹ جائیں آپس میں اور ہندوستان کمزور ہو''۔

(''سیاسی اتار چڑھاؤ''صفحہ 57)۔

ان تمام کوششوں اور اقدامات کے باوجود جو ہندو کانگریس اور انگریز حکمرانوں نے پاکستان کا قیام روکنے اور جب یہ ناگزیر ہوگیا تو اسے کٹا پھٹا بنانے میں انجام دیں، مسلمان قوم نے قائداعظمؒ کی عظیم الشان قیادت میں اپنی ہستی منوالی۔

انگریز پاکستان کے قیام کے سخت خلاف تھے اور اسے وجود میں آنے سے روکنے کے لئے انہوں نے جو جو کچھ کیا اس پر اس قدر مواد موجود ہے کہ کئی جلدیں تیار ہوسکتی ہیں۔ لیکن اخباری نقطۂ نگاہ اور ایک مضمون ہونے کے ناتے اس کا اختصار ضروری تھا۔اگر تھوڑی بہت طوالت آئی بھی تو یہ ابلاغ کا تقاضا تھا۔(روزنامہ جنگ۔سنڈے میگزین 3و10 ستمبر 2000ء)۔

لفظ قائداعظمؒ

روز نامہ جنگ، سنڈے میگزین، 22 جولائی 2001ء۔ ''سابق وزیر اور سفیر سید احمد سعید کرمانی سے خصوصی انٹرویو''۔ صفحہ 6 تا 11۔ احمد سعید کرمانی آل انڈیا مسلم لیگ لاہور سیشن 1940ء کے ذکر میں صفحہ 8 کالم ایک پر کہتے ہیں: ''قائداعظمؒ اس وقت قائداعظمؒ نہیں بنے تھے۔ یہ خطاب ان کو 42ء/43 میں ملا''۔

انٹرویو لینے والے کو یہاں انہیں ٹوکنا چاہئے تھا کہ محمد علی جناحؒ کو قوم کی طرف سے قائداعظمؒ کا خطاب 42ء، 43ء سے بہت پہلے مل چکا تھا۔ اگر چہ اس سلسلے میں اختلاف رائے ہے کہ انہیں قائداعظمؒ کے لازوال خطاب سے سب سے پہلے کہاں اور کب پکارا گیا، تاہم یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ 40ء کے اجلاس سے پہلے قائداعظمؒ کا سابقہ ان کے نام کا جزو بن چکا تھا۔ اس سلسلے میں ریکارڈ یہ کہتا ہے:۔

محمد امین زبیری کی مشہور تالیف ''سیاست ملیہ'' کے مطابق 7 دسمبر 1936ء کو جمعیت علمائے ہند کے رہنما مولانا احمد سعید دہلوی نے مرادآباد کے جامع مسجد میں ایک وعظ کیا جس میں مسٹر جناح کی نسبت کہا:

> ''آج مسلمانوں میں سیاست کو سمجھنے والا اس سے بہتر کوئی شخص نہیں، لہٰذا مسلمانوں کے قائداعظم ہونے کے بجاطور پر وہ مستحق ہیں''۔
> (صفحہ 253۔ ایڈیشن 1991ء۔ پبلشر: آتش فشاں لاہور)۔

پروفیسر شریف المجاہد مطلوب الحسن سید کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ جناح صاحب کو کسی لیگ سیشن میں پہلی بار قائداعظمؒ کے خطاب سے مولانا ظفر علی خاں نے پکارا۔ یہ آل انڈیا مسلم لیگ کا لکھنؤ سیشن تھا۔ جو 15 تا 18 اکتوبر 1937ء لکھنؤ کے لال باغ میں ہوا۔ پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب ''قائداعظم جناحؒ۔ سٹڈیز اینڈ انٹرپریٹیشن'' میں سید صاحب کے حوالے سے مولانا ظفر علی خاںؒ کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں:

''ہمارے قائدمحمد علی جناح، بلکہ میں یہ کہوں گا کہ ہمارے قائداعظم محمد علی جناح .....''۔(صفحہ 433)

قائداعظمؒ کو یکم جنوری 1938ء کے روز مسلمانانِ ''گیا'' کی طرف سے ایم شاہ سید قاسم الدین احمد نے سپاسنامہ پیش کیا۔ قائداعظمؒ نے اس کے جواب میں تقریر کی۔ اسی روز مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن ''گیا'' کے استقبالیے میں بھی وہ خطاب کرتے ہیں۔ یکم جنوری کو ہی مسلم سٹوڈنٹس کلب گیا ان کے اعزاز میں ایک تقریب کا اہتمام کرتی ہے۔ قائداعظمؒ جوابی تقریر ارشاد فرماتے ہیں۔ 2 جنوری کو قائداعظمؒ گیا شہر کی جمعہ مسجد میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہیں۔''گیا'' میں ان کی اس آمد پر کلکتہ کے اردو روزنامہ ''عصرجدید'' نے 3 جنوری 1938ء کی اشاعت میں لکھا:۔ ''گیا میں مسلمانانِ ہند کا قائداعظمؒ''۔

آل انڈیا مسلم لیگ کے سابق آفس سیکرٹری مرحوم سید شمس الحسن اپنی تالیف'' صرف مسٹر جناح'' کے صفحہ 88 اور 89 پر لکھتے ہیں:۔

''اگرچہ قائدؒ کسی قسم کے اعزاز کو ناپسند کرتے تھے، لیکن جب برصغیر کے مسلمانوں نے انہیں قائداعظمؒ کے خطاب سے پکارا تو وہ انہیں اس امر سے نہ روک سکے۔ یہ خطاب پہلے پہل شروع 1938ء میں مولانا مظہرالدین نے اپنے سہ روزہ ''الامان'' (جو دہلی سے شائع ہوتا تھا) میں استعمال کیا تھا جو فوراً ہی مقبول ہوگیا۔ مولانا مظہرالدین جمعیت علمائے ہند کے علما پر تنقید کرنے میں بڑے بے باک تھے۔ اسی باعث انہیں 13 مارچ 1939ء کو دہلی میں شہید کر دیا گیا''۔

ملا واحدی کے نزدیک محمد علی جناح کو قائداعظمؒ کا خطاب سب سے پہلے خواجہ حسن نظامی نے دیا۔ اس ضمن میں وہ ''میرے زمانہ کی دلی'' مطبوعہ: 1958ء، کے صفحہ 268 پر لکھتے ہیں:۔

''قائداعظمؒ کو قائداعظمؒ بھی سب سے پہلے خواجہ صاحب نے لکھا''۔

حسین ملک، جنہیں 1936ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جائنٹ سیکرٹری منتخب کیا گیا تھا، نے مجھے ایک انٹرویو میں بتایا:۔

''38ء میں دہلی میں ایک جلسہ ہوا۔ جلسے کے بعد جلوس نکالا گیا۔ قائداعظمؒ بگھی میں سوار ہوئے۔ دہلی مسلم لیگ کے صدر شیخ شجاع الحق ان کے ساتھ بیٹھے تھے، اور میں سامنے والی سیٹ پر تھا۔ ہجوم بہت تھا، اس لئے بعض اوقات مجھے بگھی سے اترنا پڑتا۔ دہلی کی فضا اللہ اکبر اور زندہ باد کے نعروں سے معمور تھی۔ مختلف بازاروں میں سے ہوتا ہوا جلوس دریا بازار

میں سے گزر رہا تھا کہ ''قائداعظم زندہ باد'' کا نعرہ بلند ہوا۔ پھر یہ نعرہ مسلسل بلند ہونے لگا۔
لوگ یہ نعرہ پوری قوت سے لگا رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا جب انہیں قائداعظم کے لقب
سے پکارا گیا۔ اس کے بعد مسٹر جناحؒ کسی نے پکارا ہی نہیں۔ قائداعظمؒ (The Great
Leader) ہی ان کا نام بن گیا۔ دنیا میں یہ سعادت بھی کسی کو کم ہی نصیب ہوئی
ہوگی''۔ (بحوالہ: ''آتش فشاں'' لاہور۔ قائداعظم نمبر۔ دسمبر 1976ء۔ صفحہ 29)۔

آل انڈیا مسلم لیگ کا 26واں سالانہ اجلاس 26 تا 29 دسمبر 1938ء پٹنہ میں ہوا۔ وہیں 26 دسمبر کو جلسۂ عام میں لاہور موچی گیٹ کے میاں فیروزالدین نے قائداعظم زندہ باد کا نعرہ بلند کیا۔ قیام پاکستان کے بعد مختلف اخبارات میں ہم یہی پڑھتے رہے کہ قائداعظمؒ کے خطاب کے موجد میاں فیروزالدین ہیں۔ تاہم اوپر دی گئی تفصیل اس کی نفی کرتی ہے، بلکہ اکثر بیان ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں، لیکن یہ طے ہے کہ 40ء سے پہلے قائداعظمؒ کا خطاب برصغیر میں اپنی گونج پیدا کر چکا تھا۔ ان سے پہلے بھی کئی ہندوستانی اور غیر ملکی شخصیتوں کو یہ خطاب دیا گیا، لیکن بات بنی نہیں۔ یہ تفصیل بھی بڑی معلوماتی ہے۔ صرف چند مثالیں:-

سعودی عرب کے بانی سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے نام کے ساتھ بھی قائداعظم لکھا جاتا رہا، لیکن چلا نہیں۔ ان کے ایک سوانح میں درج ہے:-

.....انسانی شخصیت کو سمجھنا اور سمجھ کر دوسروں کو سمجھانا بہت دشوار امر ہے، اس لئے سلطان ابن سعود جیسے زعیم ملت اور قائداعظم کی سوانح عمری کسی بڑے آدمی کو لکھنی چاہئے تھی (حوالہ: ''سوانح حیات سلطان ابن سعود''۔ دیباچہ۔ صفحہ ج۔ مرتبہ: سید سردار محمد حسنی بی اے (آنرز)۔ اشاعت اول۔ سن اشاعت۔ 1936ء۔ پبلشر سلسلۂ مشاہیر اسلام، اندرون دروازہ سیداں جالندھر شہر)۔

اسی دیباچے میں مرتب آگے چل کر سلطان عبدالعزیز کو دیئے گئے مخالفانہ القابات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:- ''.....اس کے برعکس ایک دوسری جماعت ہے جو اسے قوم کا قائداعظم اور ملت کا محبوب ترین رہنما سمجھتی ہے''۔ (ایضاً: صفحہ ج۔ د)۔
مولانا ابوالکلام آزاد کے لئے بھی قائداعظم کا لفظ استعمال ہوا۔ سابق رکن اسمبلی عبدالوحید خاں، جو

بعدازاں ایوب خاں کے وزیر اطلاعات بھی رہے، اپنی تصنیف ''تقسیمِ ہند'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

''دور''الہلال'' میں مولانا کی انقلابی تحریریں جب کتابی شکل میں شائع ہوئی تھیں تو ان کے ناشرین کتاب کے ابتدا میں ان کو'' قائداعظم'' کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ مثلاً ان کے ایک بیان مورخہ 10 جنوری 1913ء کے دیباچے میں جو 21ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا، مشتاق احمد صاحب کے مندرجہ ذیل الفاظ قابل غور ہیں:-

''مولٰنا کی چشم حقیقت بیں اس وقت وہ سب کچھ دیکھ رہی تھی جو آج پیش آیا ہے۔ ایک حقیقی مصلح، ریفارمر یا قائداعظم میں یہ وصف ہونا لازمی ہے کہ آئندہ کے متعلق صحیح نتائج پر پہنچ جائے''۔ (صفحہ 17۔ طبع اول: اکتوبر 1959ء۔ پبلشر: مکتبہ ایوان ادب 15 کوپر روڈ لاہور)۔

چودھری افضل حق، جن کے متعلق شورش کاشمیری لکھا کرتے تھے، وہ مجلسِ احرار کا دماغ تھے۔ 14 فروری 1922ء کو سزایاب ہوئے۔ انہوں نے جیل کے تجربات اور مشاہدات پر'' دنیا میں دوزخ یعنی جیل خانہ'' کے نام سے کتاب لکھی۔ اس کے آغاز میں ہی وہ گاندھی کو قائداعظم قرار دیتے ہیں:-

''برٹش حکومت کی مسلسل ناانصافیوں کی تاریخ میں جب مارشل لا کے خونیں باب کا اضافہ ہوا۔ اور ہندوستان کے صبر وسکون کا پیمانہ جلیانوالہ باغ کے خونِ شہدا سے لبریز ہوگیا، تو عین اس وقت، جبکہ آتشِ انتقام بدیشیوں کے سامانِ عاقبت کو جلا کر خاک کردینے کے لئے بیتاب ہورہی تھی، ہنٹر کمیشن کو ہندوستان بھیجا گیا، تاکہ بھڑکتے ہوئے شعلوں کو فرو کرے۔ انگلستان کے وقار اور شاہنشاہیت کے دوام کی غرض سے اصلاحات کا دام پھیلایا گیا۔ محبانِ وطن میں سے ہندوستان کا آئندہ قائداعظم مہاتما گاندھی تن وتنہا انگریزی عدل وانصاف کے حق میں نعرہ زن تھا''۔ (صفحہ 1۔ پبلشر: افضل حق، گڑھ شنکر، ضلع ہوشیارپور۔ سن اشاعت درج نہیں)۔

لندن میں دوسری گول میز کانفرنس (7 ستمبر تا یکم دسمبر 1931ء) میں شرکت کے بعد گاندھی 28 دسمبر 1931ء بذریعہ بحری جہاز بمبئی پہنچے۔ ڈاکٹر پی پٹا بھائی سیتارَمیّہ ''تواریخ کانگریس'' میں گاندھی کے لئے قائداعظم کا لقب استعمال کرتے ہیں: ''اہل ہند کے اس قائداعظم کے شایانِ شان استقبال کے لئے ہر چہار اطراف ملک سے ہزارہا لوگ بمبئی میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی

اصحاب تختۂ جہاز پر ان کو خیر مقدم کہنے کے لئے جا پہنچے۔ مہاتما جی سب سے تپاک کے ساتھ ملے۔
(صفحہ 797۔ پبلشر: نیشنل انڈسٹری بک ڈپو، موہن لال روڈ، لاہور)۔
مہجور کاشمیری نے اپنے ان کشمیری اشعار میں شیخ عبداللہ کے لئے قائد اعظم کا سابقہ استعمال کیا ۔

کی سنا بدلو دسون تقدیر　　　　قائد اعظم شیر کشمیر
بندہ گی موکلے یہ زندگی پھیر　　　　قائد اعظم شیر کشمیر

مولانا محمد علی جوہر کے نام کے ساتھ بھی کئی اخبارات قائد اعظم لکھتے رہے۔ میں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے اخبار ''سچ'' کے اس دور کے فائل دیکھے۔ ان میں مولانا محمد علی کے ساتھ قائد اعظم کا سابقہ بڑی کثرت سے استعمال کیا گیا۔ 4 جنوری 1931ء کو وہ لندن میں فوت ہوئے۔ کئی اخبارات نے ان کے ساتھ قائد اعظم کا لفظ استعمال کیا۔ میں نے ایک بار فٹ پاتھ پر 1933ء کا رسالہ ''عالمگیر'' لاہور دیکھا۔ اس میں مولانا پر ایک کتاب کے اشتہار کی عبارت کچھ اس طرح تھی:۔ اپنے دور کے قائد اعظم مولانا محمد علی کی سوانح عمری شائع ہو گئی۔

ترک قوم کے محسن اور جدید ترکی کے بانی کمال اتاترکؒ کے نام کے ساتھ میں نے کئی تحریروں میں قائد اعظم کا خطاب دیکھا ہے۔ یہاں تک کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے 1923ء کے لکھنؤ سیشن میں استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین شیخ شاہد حسین بیرسٹر نے جو استقبالیہ پڑھا اس میں کمال اتاترکؒ کو بھی خراج تحسین پیش کرتے ہوئے اسے قائد اعظم غازی مصطفیٰ کمال پاشا کہا۔

مولانا ظفر علی خانؒ کے مشہور زمانہ روزنامہ ''زمیندار'' لاہور نے 6 دسمبر 1938ء کو فلسطین ایڈیشن شائع کیا۔ اس کے صفحۂ اول پر مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی کی تصویر کے نیچے لکھا:۔
''تحریک آزادئ فلسطین کے قائد اعظم حضرت امین الحسینی مفتی اعظم آپ لبنان میں نظر بند ہیں''۔
اور بھی کئی شخصیتوں کے لئے یہ خطاب استعمال کیا گیا لیکن کسی کے ساتھ یہ چلا نہیں۔ جب یہ دنیا کے انتہائی سچے، کھرے اور بے ریا سیاستدان، بلکہ سٹیٹس مین محمد علی جناح کے لئے استعمال ہوا تو کرۂ ارض قائد اعظم زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھا۔ کسی دوسری شخصیت کے ساتھ اس خطاب کی ضرورت، خواہش اور کوشش ہمیشہ کے لئے دم توڑ گئی۔ لفظ قائد اعظم، محمد علی جناح کی تکمیل، تجسیم، ترصیع اور سراپا بن گیا۔
بقول آغا شورش کاشمیری:۔

جب تک ستاروں میں چمک ہے یہ نام بھی چمکتا رہے گا۔

(روزنامہ ''جنگ''۔ سنڈے میگزین 19 اگست 2001ء)۔



قائداعظمؒ اور لیاقت علی خاںؒ

قائداعظمؒ کے آخری ایام

اور

لیاقت علی خاںؒ کا رویہ

جب ٹھوس، بامقصد، بامعنی اور نتیجہ خیز تحقیقی کام بند پڑے ہوں تو مختلف قومی اور تاریخی امور پر طرح طرح کی افواہیں جنم لیتی ہیں، جو وقت گزرنے کے ساتھ بظاہر اور بالعموم ثقہ تصور ہونے لگتی ہیں۔ ہمارے ہاں ایسا پہلے روز سے ہورہا ہے۔ ہم اپنے ہیرو کے بارے میں موت سمیت کوئی ناموافق بات سننے کے عادی نہیں۔ یہاں تک کہ افسانوی اور فلمی ہیرو کو بھی افسانے، ناول اور فلم کے اخیر تک فتوحات اور کامیابیوں میں بسا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی ناکامی یا موت اس افسانے، ناول یا فلم کی اکثر اوقات ناکامی کا باعث بن جاتی ہے۔

قائداعظمؒ ہماری ملی تاریخ کے ایک جلیل القدر اور حقیقی لیڈر اور ہیرو ہیں۔ ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو جوشِ عقیدت میں ان کی رحلت کو طبعی قرار دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں۔ اس کا الزام ان کے دستِ راست اور انتہائی معتمد ساتھی خان لیاقت علی خاں پر دھرا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کرنل الٰہی بخش کی تصنیف کا بڑی کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے۔ پھر ایمبولینس کی خرابی کا ذمہ دار بھی لیاقت علی خاں کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ قائداعظمؒ اور لیاقت علی خاں کے تعلقات ٹھیک نہیں رہے تھے۔ اور یہ کہ قائداعظمؒ لیاقت علی خاں سے ناراض تھے۔ اگر حقائق پر جائیں تو یہ سب باتیں قیاس آرائیوں، افواہوں اور من گھڑت قصوں کے علاوہ کچھ نہیں۔ سب سے پہلے میں کرنل الٰہی بخش کی کتاب کا ذکر کروں گا۔

ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش قائداعظمؒ کے آخری ایام میں ان کے ایک معالج تھے۔ قائداعظمؒ کی وفات کے بعد 1949ء میں انہوں نے WITH THE QUAID-I-AZAM, DURING HIS LAST DAYS

کے نام سے 118 صفحات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی۔ مدت سے یہ پروپیگنڈا جاری ہے کہ اس کتاب میں چونکہ وزیر اعظم لیاقت علی خاںؒ کے خلاف مواد تھا اس لئے انہوں نے یہ کتاب بحق سرکار ضبط کرادی۔ جب میں قائداعظمؒ کی صد سالہ سالگرہ کے سلسلے میں آتش فشاں کا قائداعظمؒ نمبر تیار کررہا تھا، مجھے سید شریف الدین پیرزادہ نے کہا کہ آپ کرنل الٰہی بخش کی کتاب کیوں نہیں شائع کرتے۔ میں نے کہا، اس پر تو پابندی ہے۔ کہنے لگے، نہیں، اس پر تو کوئی پابندی نہیں۔ پیرزادہ صاحب پہلے شخص تھے جن کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ یہ کتاب ضبط نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں نے اور بھی کئی متعلقہ لوگوں سے معلوم کیا تو انہوں نے بھی یہی بتایا کہ وہ کتاب کبھی ضبط نہیں ہوئی۔ کرنل الٰہی بخش روایتی مصنف یا پبلشر تو تھے نہیں۔ انہوں نے اپنی یادداشتیں شائع کیں۔ ایک ایڈیشن نکالا یا دو یا کتنے۔ پھر اس طرف توجہ ہی نہ دی۔ ظاہر ہے اس میں قائداعظمؒ کے آخری ایام کا آنکھوں دیکھا حال تھا وہ چیز گرم پکوڑوں کی طرح بکی تھی، اس لئے وہ ناپید ہی رہی۔ وہ خود 1960ء میں انتقال کر گئے۔ لیکن یہ پروپیگنڈا اسی طرح رہا، چونکہ اس میں قائداعظمؒ کے حوالے سے لیاقت علی خاںؒ کے متعلق ناپسندیدہ باتیں تھیں، اس لیے وہ کتاب ضبط کرلی گئی۔ اگر وہ ضبط تھی تو 1976ء سے اسے قائداعظمؒ اکیڈیمی کیوں شائع کررہی ہے۔ اردو اور انگریزی دونوں ایڈیشن۔ اردو ایڈیشن بھی کرنل الٰہی بخش نے ''قائداعظمؒ کے آخری ایام'' کے نام سے 1949ء میں شائع کیا تھا۔ کبھی کہا جاتا ہے، لیاقت علی خاںؒ نے پہلے ایڈیشن کی اشاعت کے بعد متعلقہ حصے حذف کرادیئے تھے۔

میرے پاس 1949ء کا بالکل ابتدائی ایڈیشن ہے۔ مجھے تو اس میں کوئی ایسا باب، پیرا، یا جملہ حتیٰ کہ کوئی شوشہ تک نہیں ملا جو قائدملت خان لیاقت علی خاںؒ کے خلاف جاتا ہو، بلکہ اس میں درج ہے:

.....اس روز قائداعظمؒ نے دوپہر کا کھانا رغبت سے نہیں کھایا۔ ان کی کھانسی تکلیف دہ رہی اور شام تک ان کا ٹمپریچر بھی بڑھ چکا تھا۔ نو بجے کے قریب مجھے مس جناح کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں درج تھا کہ ان کی نبض کی رفتار بہت تیز ہوچکی ہے۔ میں گھبرا گیا، لیکن دوبارہ معائنہ کرنے پر معلوم ہوا کہ کوئی نئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ میں نے محترمہ کی ڈھارس بندھائی۔ نیچے کی منزل پر ڈرائنگ روم میں وزیراعظم سے میری ملاقات ہوئی، جو مسٹر محمد علی کے ہمراہ قائداعظمؒ کی خبر گیری کے لئے اسی روز آئے تھے۔ انہوں نے بڑی بے چینی سے قائداعظمؒ کی حالت دریافت کی، اور میری تحسین کی کہ میں مریض کا اعتماد حاصل کرکے پہلے مرحلے میں کامیاب رہا ہوں۔ انہوں نے امید ظاہر کی کہ یہ چیز ان کی صحت یابی میں مددگار ثابت ہوگی۔ انہوں نے مجھے سخت تاکید بھی کی کہ میں اس طویل بیماری کی اصل

وجہ کا کھوج لگاؤں۔ میں نے وزیراعظم کو یقین دلایا کہ قائداعظمؒ کی تشویش ناک حالت کے باوجود بڑی امید ہے کہ اگر جدید ترین ادویات، جو کراچی سے منگوائی گئی ہیں، کے مثبت اثرات ظاہر ہوگئے تو ان کے صحت یاب ہونے کا امکان ہے۔ اور سب سے زیادہ امید افزا بات مریض کی مضبوط قوتِ مدافعت ہے۔ وزیراعظم کو اپنے چیف اور دیرینہ رفیق کی صحت پر جو گہری تشویش تھی میں اس سے بہت متاثر ہوا''۔ (کرنل الٰہی بخش: وِدھ دی قائداعظمؒ ڈیورنگ ہز لاسٹ ڈیز۔ 1949ء۔ صفحہ 23، 24۔ پبلشرز: مکتبہ المعارف، لاہور)۔

بعض لوگ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کے حوالے سے اس بات کا بہت چرچا کرتے ہیں کہ جب لیاقت علی خاںؒ اور چودھری محمد علی زیارت میں قائداعظمؒ کی عیادت کر کے چلے گئے تو قائداعظمؒ نے محترمہ سے کہا، یہ دیکھنے آئے تھے، میں کب تک زندہ رہوں گا۔ قائداعظمؒ مردِ دانا اور حقیقت پسند اور حقیقت میں انسان تھے۔ انہیں پتہ تھا کہ بطور وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خاںؒ اور بطور سیکرٹری جنرل حکومت پاکستان چودھری محمد علی کے فرائض میں یہ بات شامل ہے کہ وہ پتہ رکھیں کہ اس علالت کے سبب میں کب تک زندہ رہ سکتا ہوں، کیونکہ مملکت کا نظام جاری و ساری رکھنے کے لئے بلحاظ عہدہ قائداعظمؒ کے جانشین کے لئے غور کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ یہ انوکھی بات نہیں۔ دنیا میں ہر جگہ اور ہمیشہ یہ رہا ہے کہ سربراہ مملکت کی زندگی میں ہی بالخصوص جب وہ شدید علیل ہو اس کی جانشینی پر غور وخوض اعلیٰ عہدہ داروں کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اگر یہ دونوں رہنما قائداعظمؒ کی بیماری پر مشوش ہونے کے ساتھ یہ جائزہ بھی لے رہے تھے کہ وہ کب تک زندہ رہ سکتے ہیں تو یہ اپنا فرض نبھا رہے تھے۔ اور ایسے میں جب پاکستان جیسی ایک نوزائیدہ مملکت زبردست مسائل کا شکار تھی گورنر جنرل کے عہدہ پر قائداعظمؒ کی جانشینی بڑا احساس مسئلہ تھا۔ وہاں وہی شخص فائز کیا جا سکتا تھا جو پوری قوم میں محترم و معزز ہو۔ اس حقیقت کے باوجود لیاقت علی خاںؒ قائداعظمؒ کی بیماری پر سخت پریشان تھے۔ اوپر میں نے کرنل الٰہی بخش کا حوالہ دیا ہے۔ قائداعظمؒ کے ایک اے ڈی سی کے مشاہدات ملاحظہ ہوں:-

ریٹائرڈ بریگیڈیر (تب کیپٹن) این اے حسین 29 جون 48ء سے 11 ستمبر 48ء تک قائداعظمؒ کے ایک اے ڈی سی تھے، انہوں نے مجھے ایک انٹرویو میں بتایا:

''وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خاںؒ زیارت آئے، جہاں انہوں نے دورات قیام کیا۔ اس دوران انہوں نے قائداعظمؒ، محترمہ فاطمہ جناحؒ اور ڈاکٹروں سے ملاقاتیں کیں۔ باہر سے سپیشلسٹ بلانے کے لئے بہت زور لگایا، لیکن قائداعظمؒ اس کے لئے تیار نہ ہوئے، تو

وزیراعظم نے ان سے علاج کیلئے باہر جانے کی درخواست کی۔ قائدؒ نے اس بات سے بھی اتفاق نہ کیا۔ اب انہیں وزیراعظم نے کراچی تشریف لے آنے کی ترغیب دی کہ وہیں سے باہر سے ماہرین بلوا لیے جائیں گے۔ قائداعظمؒ نے ان کا یہ مشورہ بھی قبول نہ کیا۔ وزیراعظم مکمل طور پر مایوس ہو چکے تھے۔ وہ محترمہ فاطمہ جناحؒ کو قائدؒ کے کمرے سے باہر لے آئے، اور محترمہ سے جو کہا وہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں: ''محترمہ! قطع نظر اس سے کہ قائداعظمؒ آپ کے بھائی ہیں، وہ ہماری بھی متاع عزیز ہیں۔ ہمیں ان کے علاج معالجہ میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھنی چاہئے''۔ (''آتش فشاں'' دسمبر 1976ء۔ قائداعظمؒ نمبر۔ صفحہ 320)۔

یہ بات بھی اکثر دہرائی جاتی ہے کہ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ 11 ستمبر 1948ء کو جب کوئٹہ سے کراچی پہنچتے ہیں تو وزیراعظم لیاقت علی خاںؒ ان کے استقبال کے لئے نہیں آتے۔ یہ اعتراض اس لیے بودا ہے کہ پروٹوکول کا تقاضا یہی تھا کہ وزیراعظم گورنر جنرل کے استقبال کے لیے ایئرپورٹ پر موجود نہ ہوں، اس لیے کہ قائداعظمؒ کی اس آمد کو خفیہ رکھا گیا۔ دوسرے، اسے قائداعظمؒ کا پرائیویٹ وزٹ قرار دیا گیا۔ گورنر جنرل کے پرائیویٹ وزٹ پر وزیراعظم ان کا استقبال نہیں کرتا۔ اسی طرح ایمبولینس کا بھی قصہ ہے۔ چونکہ گورنر جنرل کی آمد کو خفیہ رکھا گیا اور یہ ان کی پرائیویٹ آمد تھی، اس لیے ان کے لیے ایمبولینس کا انتظام بھی خاموشی سے ہوا اور وہ ان کے ذاتی فزیشن کرنل رحمٰن نے کیا۔
اس ضمن میں بریگیڈیئر (ر) این اے حسین کہتے ہیں:

''13 اگست کی شام ہم زیارت سے کوئٹہ آ چکے تھے۔ 10 ستمبر کی رات کو ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش نے اگلے روز قائداعظمؒ کو کراچی لے جانے کے متعلق اچانک فیصلہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر نے ایسا گھبراہٹ میں کیا۔ چنانچہ مظہر اور میں نے قائدؒ کے ملٹری سیکرٹری کرنل نولز سے کراچی میں رابطہ قائم کرنے کے لیے کال بک کرائی۔ اس زمانے میں ٹیلی فون کا نظام آج کی طرح ترقی یافتہ نہیں تھا۔ محترمہ فاطمہ جناحؒ نہیں چاہتی تھیں کہ لوگ قائداعظمؒ کو سٹریچر پر دیکھیں، اس لیے انہوں نے ہمیں بلا کر خاص طور پر تاکید کی، ''ملٹری سیکرٹری کو بتا دیں کہ کراچی میں قائداعظمؒ کا یہ ورود (Arrival) پرائیویٹ ہوگا''۔ پرائیویٹ ورود میں ایئرپورٹ پر گورنر جنرل کا صرف پرسنل سٹاف استقبال کرتا۔ ملٹری سیکرٹری، کمانڈنٹ

گورنر جنرل باڈی گارڈ، اے ڈی سی، کمپٹرولر آف دی ہاؤس ہولڈ، پرائیویٹ سیکرٹری، اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری گورنر جنرل کا پرسنل سٹاف کہلاتا تھا۔ اس میں سے ہم دونوں اے ڈی سی، اور اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر فرخ امین قائداعظمؒ کے ہمراہ کوئٹہ سے کراچی آ رہے تھے۔

''کرنل نولز سے فون پر رابطہ قائم ہونے پر ہم نے انہیں اگلے روز یعنی گیارہ ستمبر کو کراچی آنے کے متعلق کہا۔ اور یہ بھی بتایا کہ محترمہ مس فاطمہ جناحؒ قائداعظمؒ کے کراچی درود کو سرکاری کے بجائے پرائیویٹ رکھنا چاہتی ہیں اور وہ نہیں چاہتیں کہ کراچی ایئرپورٹ پر گورنر جنرل کے پرسنل سٹاف کے علاوہ بھی کوئی موجود ہو۔ قائداعظمؒ کے وائی کنگ ایئر کرافٹ کے متعلق کرنل نولز نے کہا کہ کل صبح فون پر وہ اس کی تفصیل بتائے گا کہ قائداعظمؒ کو لینے کے لئے جہاز کراچی سے کوئٹہ کتنے بجے پہنچے گا۔

''اگلی صبح کرنل نولز سے فون پر رابطہ قائم ہوا تو انہوں نے بتایا، جہاز ایک بجے کے قریب کوئٹہ پہنچ رہا ہے۔ اس جہاز کے پائلٹ رائل ایئر فورس کے سکوڈرن لیڈر مسٹر ہیریسن تھے۔

''جہاز کوئٹہ ایئرپورٹ سے اڑا تو جس کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ کرنل نولز کو اس کی اطلاع کر دے، اسے یہ بھی کہا گیا کہ وہ ملٹری سیکرٹری کو کہہ دے کہ کراچی میں قائداعظمؒ کی آمد سراسر نجی ہے۔ جہاز سوا چار بجے کراچی ایئرپورٹ پر اترا۔ ایمبولینس روانہ ہوئی تو وزیراعظم خان لیاقت علی خاںؒ بھی پہنچ گئے۔ چونکہ محترمہ فاطمہ جناحؒ کی ہدایت پر کرنل نولز کو بار بار تاکید کی گئی تھی کہ قائداعظمؒ کی یہ آمد سرکاری نہیں، اس لیے میرے خیال میں کرنل نے آخری وقت تک وزیراعظم کو بھی اس کی اطلاع نہیں کی، اور جب جہاز کراچی پہنچنے والا تھا تو اس نے وزیراعظم کو بتایا ہوگا۔ اس لیے جب وزیراعظم وہاں پہنچے تو جہاز ایئرپورٹ پر اتر چکا تھا۔ ایمبولینس قائداعظمؒ کو لے کر ایئرپورٹ سے باہر نکل رہی تھی۔ اور جب ایمبولینس خراب ہوئی تو وزیراعظم بھی وہاں رکے رہے۔ ان سب واقعات کا میں چشم دید گواہ ہوں۔ لوگوں نے بعد میں بے پر کی بڑی اڑائیں کہ ہوائی اڈے پر قائداعظمؒ کے استقبال کے لیے وزیراعظم لیاقت علی خاںؒ کیوں نہیں گئے تھے۔ جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ محترمہ مس فاطمہ جناحؒ کی سخت تاکید پر قائداعظمؒ کا یہ ورود پرائیویٹ رکھا گیا۔ ایسے میں وزیراعظم کے لیے وہاں پہنچنا ضروری نہیں تھا، پھر بھی وزیراعظم وہاں پہنچے۔

''اب میں ایمبولینس کا ذکر کرنا چاہوں گا، جس کے متعلق بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے کہ کوئٹہ جاتے ہوئے قائداعظمؒ اپنے ہمراہ مختصر سا عملہ لے گئے تھے۔ وہ اپنے ذاتی معالج کرنل رحمٰن کو بھی کراچی میں چھوڑ گئے، اس لیے کہ کرنل صاحب لوگوں کا علاج معالجہ بھی کرتے تھے، اور قائدؒ نہیں چاہتے تھے کہ عوام ان کی وجہ سے تکلیف میں رہیں، کیونکہ ان دنوں کراچی میں اچھے ڈاکٹروں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔ جب ہم نے قائداعظمؒ کے پروگرام کے متعلق کراچی میں ان کے ملٹری سیکرٹری کو مطلع کیا تو صاف ظاہر ہے کہ ایمبولینس کے لیے اسے کرنل رحمٰن سے ہی رابطہ قائم کرنا تھا، جیسا کہ میں نے بعد میں تحقیق بھی کی۔ کرنل رحمٰن نے کراچی میں تمام اچھی ایمبولینسوں کا معائنہ کرنے کے بعد جو بہترین تھی وہ قائداعظمؒ کے لیے منتخب کی۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ جب قائداعظمؒ کو ماڑی پور کے ہوائی اڈے سے ایمبولینس کے ذریعے کراچی لایا جا رہا تھا تو اس وقت فالتو ایمبولینس ساتھ نہیں چل رہی تھی۔ جیسا کہ دستور تھا کہ قائداعظمؒ جب موٹر سے سفر کرتے تو ایک خالی موٹر پیچھے ہوتی، مبادا خرابی کی صورت میں ان کا سفر متاثر ہو جائے۔ اس زمانے کا کراچی شہر آج سے یکسر مختلف تھا۔ طبی سہولتیں بالکل پسماندہ علاقوں کی طرح تھیں۔ اندازہ کریں کہ تین لاکھ کی آبادی کے لیے صرف دو ایکسرے مشینیں تھیں۔ ایک ملٹری اور دوسری سول ہسپتال میں تھی۔ پھر بھارت سے لٹے پڑے مہاجرین کی آمد سے طبی سہولتیں اور سمٹ گئیں''۔ (پندرہ روزہ ''آتش فشاں'' لاہور۔ دسمبر 1976ء۔ قائداعظمؒ نمبر۔ صفحہ 321،320)۔

قائداعظمؒ کے ساتھ ان کے اختلافات کا الزام بھی بالکل لغو ہے۔ برسوں سے میں قائداعظمؒ پر کام کر رہا ہوں۔ مجھے تو ایسا مواد نہیں ملا جو ان کے درمیان اختلافات یا قائداعظمؒ کی ان سے ناراضی ظاہر کرتا ہو۔ البتہ ایسا مواد ضرور ملا ہے، جس سے قائداعظمؒ کا ان پر اعتماد عیاں ہوتا ہے۔ لیکن بعض لوگ کسی وجہ سے مسلسل اسے دہراتے رہے ہیں۔ 75ء میں مجھے سید شریف الدین پیرزادہ نے بتایا کہ قائداعظمؒ لیاقت علی خانؒ سے اس حد تک ناراض ہو چکے تھے کہ وہ انہیں وزارت عظمٰی سے ہٹانے والے تھے، لیکن زندگی نے یاوری نہ کی۔ میں نے پیرزادہ صاحب سے پوچھا کہ لیاقت علی خانؒ کو ہٹا کر وہ کسے لانا چاہتے تھے؟ ان کا جواب تھا: ''سردار عبدالرب نشترؒ کو''۔ پھر جب پیرزادہ صاحب چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر جنرل ضیاء الحق کی کابینہ کے رکن تھے، انہوں نے ایک جریدے کو انٹرویو دیا۔ اس میں یہ موضوع بھی

چھیڑا۔ یہ غالباً 80ء کی بات ہے۔ پھر اس بات کا بڑا چرچا ہوا۔ چودھری ظفر اللہ خاں جنہیں قائداعظمؒ نے وزیر خارجہ نامزد کیا تھا، جنوری 81ء میں میں نے ان سے انٹرویو کیا جو مئی 81ء کے آتش فشاں میں چھپا۔ چونکہ ان دنوں یہ موضوع گرم تھا، میں نے چودھری صاحب سے اس کا تذکرہ بھی کیا:

س۔ پچھلے دنوں شریف الدین پیرزادہ نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا کہ گورنر جنرل قائداعظمؒ وزیراعظم لیاقت علی خاںؒ سے ناراض تھے اور ان کی جگہ سردار عبدالرب نشترؒ کو لا رہے تھے۔

ج۔ پیرزادہ کو کس نے بتایا؟ WHAT WAS SHARIF-UD-DIN PIRZADA SOURCE OF COMING TO THAT (اس بارے میں شریف الدین پیرزادہ کا ذریعۂ معلومات کیا ہے؟)۔ وہ تو اس وقت کسی گنتی میں ہی نہ تھے۔ اس کا مطلب ہے وہ لیاقت علی خاںؒ کے مقابلے میں قائداعظمؒ کے زیادہ قریب تھے۔ تبھی تو ان کو معلوم ہوا۔ کس حیثیت سے ان کا تعلق تھا جناحؒ صاحب سے۔ آیا ان کے پاس کوئی ایسا سرکاری عہدہ تھا جس کے باعث وہ قائداعظمؒ کے قریب آئے، یا وہ وزیراعظم کے مقابلے میں قائداعظمؒ کے گہرے اور قریبی دوست تھے۔ لوگ سوچتے نہیں۔ فلاں نے کہہ دیا۔ فلاں خواہ بیٹھا ہوا ہو دو ہزار میل پر۔ شریف الدین پیرزادہ زندہ ہیں۔ اگر انہوں نے کہا تو پوچھنا چاہئے، آپ کو کیسے معلوم ہوا۔ قائداعظمؒ اس قسم کے آدمی نہیں تھے۔ اول تو وہ اپنے دل کی بات ہر کسی کے ساتھ، میرے خیال میں تو وہ خاص اپنے دل کی بات کسی کے ساتھ بھی نہیں کرتے تھے۔ جتنی ضرورت سمجھتے تھے اتنی کرتے تھے۔ اور اگر کوئی شخص کوشش بھی کرے تو اس پر جرح ورح کر کے TRY TO DEMONSTRATE THAT HE WAS BEING FOOLISH (اس کے احمقانہ خیال کی قلعی کھول دیتے)۔ اس کے باوجود کونسا موقع تھا یا ان کے ساتھ کون سے ذاتی تعلقات تھے۔ کیبنٹ میں تو وہ تھے نہیں۔ لیکن یہ بات کہ جناح صاحب چاہتے تھے کہ ان کو ہٹا کر نشتر صاحب کو بنا دیں، ان کو کیسے معلوم ہو گیا۔ پھر انہوں نے کیا کیوں نہیں؟ IF HE WANTED TO DO IT HE WOULD HAVE DONE IT. (اگر وہ ایسا کرنا چاہتے تو وہ کر گزرتے)۔

س۔ لیاقت علی خاںؒ میں کچھ خوبیاں تو تھیں۔ آخر یونہی تو قائداعظمؒ ان پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔

ج۔ یہ انڈین لیجسلیٹو اسمبلی میں جب الیکٹ ہو کے آئے ہیں تو جناح صاحبؒ کے بعد دوسرا نمبر ان کا تھا۔ تب سے لیاقت علی خاںؒ قائداعظمؒ کے بڑے معتمد اور رائٹ ہینڈ مین بنے رہے۔ قائداعظمؒ کو ضرورت تو نہیں تھی کہ کوئی خاص آدمی ان کا معتمد ہو، لیکن جس پر چاہتے اعتماد کر لیتے۔ لیکن جس پر وہ اعتماد کر سکتے تھے تو قدرتی طور پر وہ ان کے لیے مددومعاون ثابت ہوتا تھا۔ انہوں نے لیاقت علی خاںؒ کو

پورا اعتماد دیا۔ لیاقت علی خاںؒ قائداعظمؒ کی طرح ذہانت وفطانت اور فراست وبصیرت کی ان بلندیوں پر فائز نہیں تھے لیکن ایک قابلِ اعتماد اور قابلِ بھروسہ آدمی ضرور تھے۔ (''آتش فشاں'' مئی 1981ء۔ صفحہ 25، 26)۔

جنرل گل حسن قائداعظمؒ کے اولین تین اے ڈی سیز میں سے ایک تھے۔ وہ اپنا چشم دید یوں بیان کرتے ہیں:

''لیاقت علی خاںؒ ان کے وزیراعظم تھے۔ قائداعظمؒ لیاقت علی خاںؒ کو بہت پسند کرتے تھے، کیونکہ قائداعظمؒ کی پسند وناپسند کا معیار کام تھا۔ اگر آپ اپنا کام دلجمعی کے ساتھ کرتے ہیں تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ اگر آپ اپنے کام میں کوتاہی کرتے ہیں تو وہ سخت ناراض ہوتے تھے''۔ (''آتش فشاں'' مئی 1980ء۔ صفحہ 24۔ جنرل (ر) گل حسن سے منیر احمد منیر کا انٹرویو)۔

محمود اے ہارون کی دلیل: ''..... پھر آدمی کہتے ہیں کہ ان کا اور قائداعظمؒ کا جھگڑا ہو گیا تھا۔ کیسے جھگڑا ہوسکتا ہے۔ جن اشخاص کو خود کے لیے لالچ نہیں تھی ان کا آپس میں جھگڑا کیسے ہوسکتا ہے؟..... ''۔ (''آتش فشاں'' اکتوبر 1987ء۔ صفحہ 15 کالم 2)۔

قائداعظمؒ کا لیاقت علی خاںؒ پر اعتماد ہی تھا جو انہوں نے 30 مئی 1939ء کے اپنے وصیت نامے میں محترمہ فاطمہ جناحؒ اور محمد علی چائے والا کے ساتھ لیاقت علی خاںؒ کو بھی اپنا موصی (EXECUTRIX) اور عامل (EXECUTOR) اور ٹرسٹی مقرر کیا تھا۔ 25 اکتوبر 1940ء کو اس وصیت نامے کا تتمہ بروئے کار لایا گیا۔ اس میں بھی مذکورہ تینوں افراد کی حیثیت برقرار رکھی گئی: ''اب میں اس اختیار کو بروئے کار لاتے ہوئے اس وصیت کی رو سے وہ تمام رقوم اپنے عاملین کے نام کرتا ہوں کہ وہ اس رقم اور/یا اس سے حاصل ہونے والا منافع جس طرح مناسب سمجھیں کام میں لائیں''۔ (..... صرف مسٹر جناح۔ صفحہ 273)۔

اگر بعد کے ماہ وسال کے دوران میں قائداعظمؒ اور لیاقت علی خاںؒ کے مابین کشیدگی پیدا ہوئی ہوتی تو قائداعظمؒ جیسا قانون اور ضابطے کا شدید پابند انسان سب سے پہلے نئے وصیت نامے کی تیاری پر غور کرتا جس میں لیاقت علی خاںؒ کا نام نہ ہوتا۔ لیکن 30 مئی 1939ء کا یہ وصیت نامہ بھی دونوں کے درمیان پختہ اور پراعتماد تعلقات پر شاہد ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ اور بیگم رعنا لیاقت علی خاںؒ کے درمیان

کشیدگی پیدا ہوئی تو لیاقت علی خانؒ نے وزارتِ عظمیٰ سے استعفادے دیا، جسے قائداعظمؒ نے یہ کہہ کر مسترد کر دیا: ''لیاقت! میری بہن یا اپنی بیوی کو اپنے اور میرے درمیان حائل مت ہونے دیجئے''۔ اگر قائداعظمؒ لیاقت علی خانؒ سے ناراض ہوتے تو ان کا استعفیٰ فی الفور منظور کر لیتے۔

کسی سے اختلاف، ناراضی اور ناخوشی کی انسان جتنی مرضی پردہ پوشی کرتا پھرے وہ طرزِ عمل میں، گفتگو میں، تقریر میں، تحریر میں اگر چھلکتا نہیں تو جھلکتا ضرور ہے۔

11 اگست 1947ء۔ قائداعظمؒ کو پاکستان دستور ساز اسمبلی کا صدر (سپیکر) منتخب کیا گیا تو سب سے پہلے لیاقت علی خانؒ نے تقریر کی، جس میں انہوں نے کہا: ''قائداعظمؒ! میرے لئے یہ بات بے انتہا باعث مسرت ہے کہ میں آپ کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا صدر منتخب ہونے پر مبارک باد دے رہا ہوں۔ آپ کے لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ آپ پاکستان کے معمار ہیں اور یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس اسمبلی کا ہمیں آپ جیسا صدر میسر آیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی توجہ، لامحدود جوش، بے غرض خدمت اور غیر متزلزل عزم سے منزلِ مقصود کی طرف ہماری رہنمائی کریں گے..... یہ ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ ہمیں پاکستان کی حکومت کا ڈھانچہ تیار کرتے وقت آپ کی رہنمائی اور امداد حاصل ہوگی..... مجھے یقین ہے کہ اپنے بھاری فرائض کی ادائیگی میں آپ اس دیانتداری کو پوری طرح کام میں لائیں گے، جو آپ کی روح میں رچی ہوئی ہے۔ میں نے نہایت نازک مواقع پر بھی آپ کو جادۂ حق سے کتراتے ہوئے نہیں دیکھا....''۔

لیاقت علی خانؒ کو ایسی تقریر پر کسی نے مجبور نہیں کیا تھا۔ الفاظ کا چناؤ ان کا اپنا تھا۔ اگر قائداعظمؒ کے ساتھ انہیں کوئی ناراضی ہوتی تو تقریر میں وہ ضرور جھلکتی۔ یہی نہیں انہوں نے 12 اگست 1947ء کو اسی دستور ساز اسمبلی میں تحریک پیش کی کہ: ''یہ اسمبلی قرار دیتی ہے کہ مسٹر محمد علی جناح، صدر پاکستان دستور ساز اسمبلی اور نامزد گورنر جنرل آف پاکستان، کو 15 اگست 1947ء سے تمام سرکاری کاغذات، دستاویزات، مسودوں اور خط و کتابت میں ''قائداعظم محمد علی جناحؒ گورنر جنرل آف پاکستان'' لکھا جائے''۔ مشرقی بنگال سے ہندو ارکان اسمبلی نے ٹائٹل قائداعظم کی مخالفت کی۔ لیاقت علی خانؒ نے بھی اس مخالفت کا سخت جواب دیا اور یہ تحریک منظور کرا کے محمد علی جناح کے ساتھ قائداعظمؒ کا سابقہ استعمال کرنے کو آئینی اور قانونی شکل دلوائی۔ اگر لیاقت علی خانؒ کے ذہن میں قائداعظمؒ کے بارے میں کوئی منفی جذبہ ہوتا تو وہ اس حد تک قطعاً نہ جاتے۔

12 ستمبر 1948ء۔ قائداعظمؒ کی تدفین کے بعد دنیا بھر کے غمزدہ مسلمانوں سے ریڈیو پر وزیراعظم

پاکستان خان لیاقت علی خانؒ نے جو خطاب کیا اس میں بھی ناخوشی اور اختلاف کی کہیں جھلک تک نہیں ملتی بلکہ قائدؒ کے ساتھ ان کی عمر بھر کی محبت، عقیدت اور پیروی ان کے ایک ایک لفظ سے چھلکتی نظر آتی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں:

''..... خدائے تعالیٰ کو یہی منظور تھا کہ اس وقت جبکہ پاکستان بلکہ دنیا کے مسلمانوں کو قائداعظمؒ کی رہبری اور دانش کی اشد ضرورت تھی وہ ہم سے علیحدہ ہو جائیں''۔

''..... مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ تاریخ قائداعظمؒ کا شمار دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں کرے گی.....''۔

''..... قائداعظمؒ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جو دنیا میں کبھی کبھی پیدا ہوتی ہیں.....''۔

.....اب جبکہ قائداعظمؒ ہم میں نہیں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسی راستے، اسی صراط المستقیم پر چلیں جو وہ ہمیں دکھا گئے ہیں تا کہ ایک دن ہم اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکیں.....''۔

قوم کو قائداعظمؒ کی وفات سے جو صدمہ پہنچا ہے اور جو رنج سب پر طاری ہے اس کا میں خوب اندازہ کر سکتا ہوں، لیکن خود مجھے جو صدمہ ہوا ہے اور جس کرب میں میں مبتلا ہوں اس کا پورا اندازہ شائد کوئی اور نہیں کر سکتا''۔

''اپنے محبوب اور محترم قائداعظمؒ کے لئے اپنی عقیدت اور محبت کے اظہار کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ ہم اس نصب العین کو ایک لمحے کے لئے بھی نظر انداز نہ کریں جو قائداعظمؒ نے ہمارے سامنے رکھا ہے اور پاکستان کو ایسی شاندار مملکت بنائیں جیسی کہ وہ چاہتے تھے''۔

تقریر کے آخر میں قائد ملت خان لیاقت علی خانؒ نے قائداعظمؒ زندہ باد، پاکستان پائندہ باد کا نعرہ لگایا۔ اس کے بعد آرڈر کر دیا کہ ہر سرکاری تقریر کے آخر میں پاکستان پائندہ باد کے ساتھ قائداعظمؒ زندہ باد کا نعرہ ضرور بلند ہوگا۔ اور ایسا ہوتا رہا۔ وزیراعظم لیاقت علی خانؒ پر ایسی روایت قائم کرنے کے لئے کسی نے زور نہیں ڈالا تھا، نہ کوئی انہیں مجبور کر سکتا تھا۔ وہ تو ان کے اپنے جذباتِ عقیدت انہیں زور دے رہے تھے، انہیں مجبور کر رہے تھے، ان پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ جب پاکستان پائندہ باد کہا جائے تو ساتھ اس مملکت کے بانی کے لئے زندہ باد کے الفاظ کی گونج پیدا کی جائے۔ افسوس بعض دیگر اچھی روایات کی طرح

یہ نعرہ بھی ایوبی مارشل لا کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اپنے اور پوری ملت کے قائدؒ کے لئے لیاقت علی خاں کے یہ جذبات 12 ستمبر 1948ء کی تقریر ہی میں نہیں ملیں گے، 16 اکتوبر 51ء تک، جب وہ جامِ شہادت نوش فرماتے ہیں، ان کی زندگی کا یہی چلن، یہی وتیرہ، یہی روش رہی۔ جلوت اور خلوت کے کسی بھی مرحلے پر قائدؒ کے ساتھ ان کی عقیدت مندی، پیار اور پیروی میں دراڑ نظر نہیں آتی۔ جارج واشنگٹن کی امریکیوں کے لئے کتنی اہمیت ہے۔ وہ ان کا بابائے قوم ہے۔ لیاقت علی خاںؒ 50ء میں امریکہ جاتے ہیں۔ روایتی طور پر تو انہیں واشنگٹن کی ہی توصیف کرنی چاہئے تھی، جیسا کہ لوگ بالعموم کرتے ہیں، لیکن قائد کا یہ ساتھی، عقیدت مند، شاگرد، دوست اور تحریکِ پاکستان کی جاں گسل جنگ میں بقول قائداعظمؒ ان کا دستِ راست وہاں بھی واشنگٹن کے ذکر کے ساتھ اپنے قائدؒ کا ڈنکا بجادیتا ہے، جب وہ 18 مئی 1950ء کو لاس اینجلس (کیلی فورنیا) میں کہتا ہے:۔

> ''چند روز قبل میں نے اپنے وطنِ عزیز کی جانب سے آپ کے بابائے قوم جارج واشنگٹن کے سادہ لیکن پرشکوہ مزار پر عقیدت کے پھول چڑھائے۔ اس وقت میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ جارج واشنگٹن کے ذہن میں نوزائیدہ ریاست ہائے متحدہ سے متعلق وہی خیالات گشت کررہے ہوں گے جو پاکستان کی نئی مملکت کے قیام پر حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ذہن میں کارفرما تھے''۔

حقیقت یہ ہے کہ قائد ملت لیاقت علی خاںؒ آخیر دم تک قائداعظمؒ کو اپنا رہنما، لیڈر اور استاد تسلیم کرتے رہے۔ ان کی عمر بھر کی تقریریں، بیانات اور شیوہ اس پر شاہد ہے۔ قائدؒ کے ساتھ ان کے ایثار، پیار اور عقیدت کا اس سے بڑھ کر ٹھوس ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے کہ جب وہ اس دنیا سے گئے تو قائدؒ کی طرح ان کی زبان پر بھی پاکستان کا لفظ تھا۔

(روزنامہ ''پاکستان'' لاہور۔ 11 ستمبر 2001ء۔
روزنامہ ''خبریں'' لاہور۔ 11، 12 ستمبر 2001ء)



قائداعظمؒ

قائداعظمؒ
11 اگست 1947ء کی تقریر اور میثاقِ مدینہ

گزشتہ ماہ صدر مملکت جنرل پرویز مشرف نے گورنر ہاؤس میں اخبار نویسوں سے ملاقات کی۔ ''خبریں'' کے مطابق اس موقعہ پر پروفیسر ڈاکٹر مہدی حسن نے تجویز پیش کی: ''قائداعظم محمد علی جناحؒ نے 11 اگست 1947ء کو اسمبلی میں جو تقریر کی تھی اسے سنسر کے بغیر 14 اگست کو ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر نشر کیا جائے''۔ استاد محترم پروفیسر ڈاکٹر مہدی حسن صاحب سے بزرگ صحافی جناب شفقت تنویر مرزا نے کئی قدم آگے بڑھتے ہوئے کہا: ''اس تقریر کو پاکستان کے آئین کا حصہ بنا دیا جائے''۔ خبر کے مطابق صدر پرویز مشرف نے دونوں کو یقین دلایا کہ وہ ان تجاویز پر غور کریں گے۔

قائداعظمؒ نے بانی پاکستان، فادر آف دی نیشن (بابائے قوم)، پاکستان دستور ساز اسمبلی کے اولین صدر اور قائداعظمؒ کی حیثیت سے قوم کے لئے جو نقشِ راہ متعین کیا، حیرت ہے 56 برس بعد بھی اور قوم میں تشتت و افتراق کے حوالے سے تلخ تجربات کے باوجود ہم اپنے اس میگنا کارٹا کے نفاذ کے بارے میں ''غور کریں گے'' پر اڑے ہوئے ہیں۔

انگریز قوم نے اپنے میگنا کارٹا پر عمل کیا تو وہ ایک مردہ قوم سے زندہ قوم بنی اور وحشت و جانگلیت سے نکل کر دنیا میں تہذیب پھیلانے کی دعویدار ہوئی۔ اس کا میگنا کارٹا یعنی منشورِ عظیم اور منشور آزادی 15 جون 1215ء کو رنی میڈ کے مقام پر انگریز جاگیرداروں نے بادشاہ جان سے حاصل کیا جس کی رو سے انگریز قوم کو شخصی اور سیاسی آزادی حاصل ہوئی۔ اس کے اصطلاحی معنی یہ ہوئے، کوئی بھی آئین جو بنیادی، شخصی اور دوسرے حقوق کی ضمانت دے۔

لیکن ہمارا یہ میگنا کارٹا یعنی بانی پاکستان کی 11 اگست کی تقریر شروع دن سے ہی حکمرانوں کی دانستہ بے توجہی کا شکار رہی۔ ضیا دور میں اس کی اشاعت پر پابندی رہی۔ تقریر قائدؒ کا ذکر ہی کیا اس دور میں تو قرآنی آیات بھی سنسر ہوتی تھیں۔

قائداعظمؒ کی چالیس منٹ کی اس تقریر میں سے جو حصے حذف کرانے کی کوشش کی گئی اور جن سے

ہمارے جنرل محمد ضیاء الحق خوفزدہ رہے اور جن پر آج بھی بعض لوگ معترض ہیں وہی اس تقریر کی جان ہیں، اسی بنا پر وہ ہمارا سکنا کارنا ہیں، کیونکہ یہ میثاقِ مدینہ کی تابناک دستوری شقوں سے ہم آہنگ ہیں۔ مثلاً قائداعظمؒ نے فرمایا:

.....پاکستان میں تمام اقلیتوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ ان کو جائز حد تک زیادہ سے زیادہ آزادی دی جائیگی۔ اگر ہمیں پاکستان کی اس عظیم الشان ریاست کو خوش اور خوشحال بنانا ہے تو ہمیں اپنی تمام اور قطعی توجہ لوگوں کی فلاح و بہبود کی طرف لگا دینی چاہئے۔ خصوصاً عوام اور غریبوں کی طرف۔

''میں پاکستان کی اقلیتوں سے بھی یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر تم نے تعاون کے جذبہ سے کام لیا۔ ماضی کو بھلا دیا اور جھگڑوں کو بھلا دیا اور جھگڑوں کو دفن کر دیا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ تم میں سے ہر ایک چاہے تمہارا تعلق کسی بھی فرقے سے ہو، چاہے تمہارا رنگ، ذات اور عقیدہ کچھ بھی ہو، اول بھی اس ریاست کا باشندہ ہوگا اور دوئم بھی اور آخر میں بھی تمہارے حقوق، مراعات اور ذمہ داریاں برابر ہوں گی۔

''اگر آپ نے تعاون واشتراک کے جذبہ سے کام شروع کیا تو تھوڑے ہی دنوں میں اکثریت اور اقلیت، صوبہ داریت اور فرقہ بندی کی بندشیں ٹوٹ جائیں گے، فنا ہو جائیں گی۔ ہندوستان کی آزادی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹیں یہی تھیں۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو ہم بہت پہلے آزاد ہو گئے ہوتے۔ اگر یہ مجبوریاں نہ ہوتیں تو کوئی بھی چالیس کروڑ آدمیوں کی قوم کو زیادہ دن تک غلام نہیں رکھ سکتا تھا۔

''حکومت پاکستان میں آپ کو اپنے مندروں اور پرستش گاہوں میں جانے کی آزادی ہے۔ آپ کسی بھی مذہب کے مقلد ہوں یا آپ کی ذات اور عقیدہ کچھ بھی ہو، اس سے پاکستان کی حکومت کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

''یورپ خود کو مہذب کہتا ہے لیکن وہاں پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک خوب لڑتے رہے۔ آج بھی بعض ریاستوں میں وہاں مذہبی تمیزیں موجود ہیں۔ مگر ہماری ریاست کسی تمیز کے بغیر قائم ہو رہی ہے۔ ایک فرقے یا دوسرے فرقے میں کوئی تمیز نہ ہوگی، نہ ذات اور عقیدوں کی تمیزیں ہوں گی۔ ہم اس بنیادی اصول کے ماتحت کام شروع کر رہے ہیں کہ ہم ایک ریاست کے باشندے اور مساوی باشندے ہیں (پرجوش تالیاں)۔ ہمیں اس اصول

کو اپنا مطمح نظر بنالینا چاہئے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ ہندو ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے مذہب مٹ جائیں گے کیونکہ مذہب کو ماننا ہر شخص کا ذاتی عقیدہ ہے۔ میرا مطلب سیاسی تمیز سے ہے وہ سب ایک قوم کے افراد ہو جائیں گے''۔

اسلامی تاریخ میں میثاقِ مدینہ ایک بڑا ہی اہم معاہدہ تسلیم کیا جاتا ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود مدینہ کے ساتھ کیا۔ قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کے اس حصے کو میثاقِ مدینہ کی ان شقوں کی روشنی میں دیکھیں تو کوئی ابہام باقی نہیں رہتا۔ محمد حسنین ہیکل کی ''حیاتِ محمدؐ'' کے مطابق:

13۔ مشرکین مدینہ میں جو لوگ معاہدہ میں شریک ہیں ان میں سے کوئی شخص قریش مکہ میں سے کسی کے مال اور جان کو نہ تو پناہ دے گا اور نہ مسلمان کے مقابلہ میں مکہ کے کسی قریشی کی حمایت کرے گا۔

15۔ تمام مسلمان اس معاہدہ پر متفق ہیں اور وہ اس میں سے کسی دفعہ کا انکار نہیں کر سکتے۔ جس مسلمان نے اس معاہدہ کا اقرار کر لیا وہ خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔

18۔ اگر مسلمان جہاد میں اپنا مال خرچ کریں تو یہود کو بھی ان کے ساتھ اپنا مال خرچ کرنا ہوگا۔

19۔ قبیلہ بنی عوف کے یہود بھی اس معاہدہ میں شامل ہیں اگرچہ مسلمان اور یہودی ہر ایک اپنے اپنے مذہب پر قائم رہنے کا مستحق ہوگا لیکن مشترکہ مقاصد میں دونوں ایک جماعت کے حکم میں داخل ہوں گے۔

28۔ مسلمانوں کی لشکر کشی کی حالت میں یہود کو بھی ان کی مالی اعانت کرنا ہوگی کیونکہ حلیف کے لئے دفع مضرت اپنے نفس کی حفاظت کے مطابق کرنا چاہئے جب تک کہ اس کی جانب سے ضرر نہ پہنچے یا اس کے ذمہ کوئی جرم عائد نہ ہو۔

32۔ اگر مدینہ پر کوئی قوم حملہ کرے تو دشمن کی مدافعت میں سب کو مل کر حصہ لینا ہوگا۔

33۔ اگر مدینہ پر حملہ آور لشکر مسلمانوں سے صلح کرنا چاہے تو معاہدہ کے شرکا کو متفق ہو کر دشمن سے صلح کرنا ہوگی۔

34۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے سوا دوسرے شرکائے معاہدہ پر حملہ ہو اور وہ لوگ جن کی وجہ سے حملہ ہوا ہے دشمن سے صلح کرنا چاہیں تو مسلمان ان کے ساتھ اس معاہدہ کے پابند ہوں گے باستثنائے اس معاملہ کے جس میں شرکائے معاہدہ میں سے کسی کے دین پر زد پڑتی ہو۔ (حوالہ: حیاتِ محمدؐ۔ مؤلف: محمد حسنین ہیکل۔ اردو ترجمہ: ابو یحییٰ امام خاں۔ بار سوم 1987ء۔ صفحات: 268 تا 270۔ پبلشر: ادارہ

ثقافت اسلامیہ 2 کلب روڈ لاہور)۔

اس معاہدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے مؤلف محمد حسنین ہیکل رقمطراز ہیں:

''یہ تحریری معاہدہ ہے جس کی رو سے جناب محمد (صلوات اللہ تعالیٰ علیہ) نے آج سے تقریباً ساڑھے تیرہ سو سال قبل معاشرہ انسانی میں ایسا ضابطہ قائم کیا جس سے شرکائے معاہدہ میں سے ہر گروہ اور فرد کو اپنے اپنے عقیدہ میں آزادی کا حق حاصل ہوا۔ انسانی زندگی کی حرمت قائم ہوئی۔ اموال کے تحفظ کی ضمانت مل گئی۔ ارتکاب جرائم پر گرفت و مواخذہ نے اپنا دباؤ ڈالا اور معاہدین کی یہ بستی (شہر مدینہ) اس میں رہنے والوں کے لئے امن کا گہوارہ بن گئی۔ غور فرمائیے کہ سیاسی اور مدنی زندگی کو ارتقا کا کتنا بلند مرتبہ حاصل ہوا جس سیاست و مدنیت (دونوں) پر ابھی تک دستِ استبداد مسلط تھا اور دنیا فساد و ظلم کا معمل بنی ہوئی تھی''۔ (ایضاً۔ صفحہ: 270)۔

قائداعظمؒ 11 اگست 1947ء کی اس تقریر میں جب اپنے اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے تمام شہریوں کو برابر کا درجہ دیتے اور انہیں ایک قوم کے افراد قرار دیتے ہیں تو یہ چیزیں میثاقِ مدینہ کی درج بالا شق 19 سے بھی کس قدر مطابقت رکھتی ہیں۔

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی ''پیغمبر انسانیت'' میں میثاقِ مدینہ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''یہ بڑا اہم واقعہ اس لئے ہے کہ:

1۔ ایک اسلامی ریاست کی بنیاد پڑنے کی نشان دہی اسی معاہدے سے ہوتی ہے۔

2۔ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جو بین الاقوامی معاہدوں کی اساس ہے۔

3۔ اس معاہدے میں بڑی اعلیٰ اقدار ہیں۔ اس میں عمیق سیاست و حکمت کارفرما ہے، لیکن ابلیسی سیاست نہیں، بلکہ مسلمان قوم کے لئے مستقبل کے تمام معاہدوں میں روشنی کے مینار کا کام دیتی رہی اور دنیا کو پہلی بار درس ملا کہ احترامِ انسانیت کی بنیاد پر اعلیٰ مقاصد کو بروئے کار لانے میں کس طرح تعاون کیا جاتا ہے اور دوسری قوموں کو مذہب و ضمیر کی کتنی فراخ دلانہ آزادی دی جاتی ہے۔

4۔ فراخ دلی اور رواداری کے ساتھ اس معاہدے میں یہ حقیقت بھی مستور ہے کہ دین جبر سے نہیں پھیلایا جاتا اور دوسرے انسانوں سے مذہب کی بنیاد پر اتنی نفرت و عصبیت نہ برتنی چاہئے کہ اعلیٰ اقدار میں تعاون نہ ہو سکے۔ مذہب کا مقصد ہی اعلیٰ اقدار انسانی کا قیام ہے اور سنگ دلانہ تعصب و تفریق

کوئی اعلیٰ قدر نہیں۔ اگر مذہب محض رسم ہے تو بے معنی ہے اور اگر انسانی قدروں کا قیام مقصود ہو تو مذہبی تعصب دور ہو کر ہی باہمی قرب پیدا ہو سکتا ہے جس کا آخری نتیجہ وحدتِ انسانی ہے۔ جب مقصد اعلیٰ ہو تو چھوٹے چھوٹے اختلافات دور ہونے میں بڑی مدد ملتی ہے، اور اس کے بعد اگر فراخ دلی اور رواداری ہو تو بڑے اختلافات بھی دور ہو جاتے ہیں اور قبولِ حق میں روایاتی تعصب حائل نہیں ہوتا"۔ (حوالہ. پیغمبر انسانیت۔ مولف: مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی۔ صفحہ: 178، 179۔ طبع سوم: 1990ء۔ پبلشر: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ 2 کلب روڈ لاہور)۔

حیرت ہے کہ جن پروفیسر ڈاکٹر مہدی حسن صاحب اور بزرگ اخبار نویس جناب شفقت تنویر مرزا کو سرمایہ دارانہ اور جاگیردرانہ نظام کی استبدادی اور استحصالی خصوصیات کی مخالفت کے سبب کفر و الحاد کے القابات سے یاد کیا جاتا رہا، یہاں تک کہ ان کا استاذانہ تقدس مجروح کرنے سے بھی گریز نہ کیا گیا، آج انسانیت کے لئے مشعلِ راہ میثاق مدینہ کی پیروی میں کی گئی بانی پاکستان، بابائے قوم حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ کی رہنما تقریر کی بغیر سنسر کے اشاعت اور اسے آئین پاکستان کا حصہ بنانے کے مطالبے کا شرف بھی انہی کو حاصل ہوتا ہے۔ ایک ہم ہیں کہ جمعہ کی ہفتہ وار تعطیل کو اسلام کا نفاذ سمجھے بیٹھے ہیں۔

رہ گئی رسم اذاں روحِ بلالی نہ رہی

(روزنامہ "خبریں" لاہور 8 ستمبر 2003ء)



دینا جناح، قائداعظمؒ اور مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ

دِیناواڈیااور قائداعظمؒ

حالیہ پاک بھارت ون ڈے کرکٹ سیریز دونوں روایتی حریفوں کے درمیان باہمی دوستی کی خواہش کے حوالے سے بڑی پُر از اشتیاق، پُرشکوہ اور خوش منظر رہی۔ بھارت سے اہم شخصیات بھی یہ مقابلہ ومنظ دیکھنے کے لئے آتی رہیں۔ ان میں نمایاں ترین شخصیت بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی صاحبزادی دیناواڈیا بھی تھیں، جن کا اصل نام صوفیہ ہے، عرفیت دینا، اس لئے وہ دینا جناح کے نام سے معروف رہیں اور شادی کے بعد اپنے غیر مسلم خاوند کے حوالے سے دیناواڈیا کہلا رہی ہیں۔

مشہور ہے قائداعظمؒ اس شادی پر اتنے ناخوش تھے کہ عمر بھر اپنی بیٹی سے قطع تعلق کئے رکھا۔ یہ جملہ تو مدت سے زبان زدِ عام ہے، جب وہ شادی کے بعد قائداعظمؒ سے ملنے کے لئے آئیں تو انہوں نے کہا، تیرا باپ مر چکا ہے۔ میں نے یہ ''تاریخی'' جملہ سب سے پہلے 25 دسمبر 1959ء کو سکاچ مشن ہائی سکول سیالکوٹ میں یومِ قائداعظمؒ کی تقریب میں سنا، جو میرے کلاس فیلو جعفری نے اپنی تقریر میں بڑے جوش سے ادا کیا۔ جعفری کراچی سے آکر مشن ہائی سکول میں داخل ہوا تھا۔ وہ نواحی گاؤں بُڑ میں رہتا تھا۔

قائداعظمؒ کی صد سالہ سالگرہ کے حوالے سے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے 1976ء کو سال قائداعظمؒ ڈیکلیئر کیا۔ میں نے رسالہ ''آتش فشاں'' کا 332 صفحاتی قائداعظمؒ نمبر تیار کیا جو قائدؒ کے 87 ساتھیوں یا کسی موقعہ پر ان کے قریب رہنے والوں کے مشاہداتی انٹرویوز پر مبنی تھا۔ ان یادداشتوں میں بھی دینا جناح اور قائداعظمؒ میں قربت اور کشیدگی کا ذکر آیا۔ مالا بار (تیلی چری) کے حاجی عبدالستار حاجی اسحٰق سیٹھ 1920ء میں مسلم لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ 34ء سے 46ء تک وہ سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر، 37ء سے 47ء تک آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے رکن اور 36ء سے 47ء تک مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے چیف وہپ رہے۔ قیام پاکستان کے بعد مصر میں پاکستان کے سفیر ہوئے۔ انہوں نے مجھے بتایا: ''قائداعظمؒ کی بیوی کا انتقال ہوا تو ان کی بیٹی کم سن تھی۔ جس کی پرورش ننھیال نے اس طرح کی کہ اسے ایک پارسی کے طور پر پروان چڑھایا۔ جب اس کی شادی پارسی سے ہونے لگی تو

قائداعظمؒ نے یہ شادی روکنے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود۔ شادی ہوگئی تو ہندو نے بہت پروپیگنڈا کیا کہ اب مسلمان قائداعظمؒ سے خفا ہو گئے ہیں۔ اب قوم ان کی بات نہیں مانے گی۔ اس پروپیگنڈے کا جواب قوم نے اس طرح دیا کہ اس شادی کے واقعہ کے بعد قائداعظمؒ سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے دہلی تشریف لائے تو دہلی کے مسلمانوں نے ان کا پر جوش استقبال کیا اور بہت بڑا جلوس نکالا''۔

سید شریف الدین پیرزادہ، جن کا دعویٰ ہے کہ وہ قائداعظمؒ کے سیکرٹریٹ میں کام کرتے رہے ہیں، نے مجھے بتایا، ''26 جولائی 43ء کے روز رفیق صابر نامی ایک خاکسار ان پر حملہ آور ہوا۔ قائداعظمؒ اس کے باوجود کام میں مصروف رہے کہ اتنے میں ان کی بیٹی کی دستی چٹھی آئی جس میں اس نے فوری طور پر قائداعظمؒ کے پاس آنے کی خواہش کی تھی۔ قبل ازیں دینا کبھی قائداعظمؒ کے پاس نہیں دیکھی گئی تھیں۔ قائداعظمؒ نے اس کی چٹھی کا جواب نہیں دیا۔ ایک گھنٹے بعد وہ خود ہی آ گئی اور سیدھی ان کے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں تک ہم سن سکے وہ اکیلی ہی باتیں کرتی رہی۔ قائداعظمؒ اس سے شریک گفتگو نہیں ہوئے''۔

محمد حنیف آزاد جو پاکستانی فلم انڈسٹری میں آزاد کے نام سے آرٹسٹ بھی رہے، کے متعلق مشہور ہے، وہ بمبئی میں قائداعظمؒ کے ڈرائیور رہے تھے۔ مجھے انہوں نے بتایا، ایک دفعہ وہ گاڑی چلا رہے تھے۔ قائداعظمؒ پچھلی نشست پر بیٹھے تھے۔ سامنے سے ان کی بیٹی دینا کی گاڑی آ گئی۔ میں نے خاص طور پر شیشے میں سے قائداعظمؒ کا رویہ دیکھنا چاہا۔ جب دینا کی گاڑی قریب سے گزری، قائداعظمؒ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

جہاں تک شادی کے مسئلے پر بیٹی کے ساتھ ناراضی کا تعلق ہے، یہ ایک فطری امر ہے۔ لیکن یہ کہ انہوں نے عمر بھر بیٹی کے ساتھ تعلق توڑے رکھا، ریکارڈ اس کی تردید کرتا ہے۔

شریف الدین پیرزادہ کے بقول، انہوں نے 1941ء میں بہبے پراونشل مسلم لیگ کانفرنس کے موقعہ پر انگریزی میں PAKISTAN AT A GLANCE (پاکستان ایک نظر میں) کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا۔ قائداعظمؒ نے اسے پڑھا اور انہیں بلا بھیجا اور اپنے ہاں کام کرنے کو کہا۔ بقول پیرزادہ صاحب یہ 41ء کا واقعہ ہے۔ خاکسار رفیق صابر مزنگوی نے 26 جولائی 1943ء کو قائداعظمؒ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ جس کا پیرزادہ صاحب نے ذکر کیا ہے کہ یہ سن کر ان کی بیٹی آ میں لیکن قائدؒ نے اس سے بات نہ کی۔ ڈرائیور آزاد کا زمانہ ملازمت بھی 41ء سے 43ء کے لگ بھگ کا ہے۔ جبکہ قائداعظمؒ نے اپنا آخری وصیت نامہ 30 مئی 1939ء کو لکھا۔ جیسا کہ اس کی پہلی شق سے بھی ظاہر ہے کہ ''یہ میرا آخری

وصیت نامہ ہے۔ میں اپنے دیگر وصیت نامے منسوخ کرتا ہوں''۔انہوں نے اپنی بہن محترمہ فاطمہ جناحؒ، سولسٹر مسٹر محمد علی چاپئے والا اور نوابزادہ لیاقت علی خانؒ کو اس وصیت نامے کا موصی، عامل اور ٹرسٹی مقرر کیا۔شق نمبر(10) میں تحریر ہے:

''میں اپنے عاملین کو ہدایت کرتا ہوں کہ وہ -/200000روپے (دولاکھ یا(دوسو ہزار)مختص کر دیں جن سے 6فی صد کے حساب سے -/1000روپے، ایک ہزار روپے آمدنی ہوگی اور وہ اس سے جو بھی آمدنی ہو ہر ماہ میری بیٹی کو تاحیات ادا کریں اور اس کی وفات کے بعد دولاکھ کی مذکورہ رقم اس کے بچوں، لڑکے یا لڑکیوں میں برابر تقسیم کر دیں اور بےاولاد ہونے کی صورت میں وہ رقم میری بقیہ جائیداد کا حصہ شمار ہوگی''۔

(..... صرف مسٹر جناح۔صفحہ:272)۔

اگر قائداعظمؒ اپنی بیٹی سے قطع تعلق کیے ہوئے تھے تو انہوں نے اپنے وصیت نامے میں درج بالا شق کیوں رکھی؟ کسی شخصیت کے ساتھ عقیدت اور مخالفت میں تاریخ مسخ کرنا ہمارے ہاں عام ہے۔لیکن مذکورہ بالا واقعہ عقیدت سے زیادہ تاریخ مسخ کرنے کی ایک جاہلانہ کوشش ہے۔

''آتش فشاں'' کے قائداعظمؒ نمبر میں قائداعظمؒ کے ایک آخری اے ڈی سی کیپٹن این اے حسین کا انٹرویو بھی ہے۔قائداعظمؒ کی وفات پر وہ دیناواڈیا کی آمد کا حال صفحہ 322,321 پر یوں بیان کرتے ہیں.

''ان کی بیٹی مسز واڈیا کو اسی رات بمبئی میں مطلع کیا گیا۔وہ اگلی صبح بروقت کراچی پہنچ گئیں۔ وہ سیاہ لباس پہنے جنازے میں شریک تھیں، اور محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ساتھ قائداعظمؒ کی پسندیدہ سیاہ کار،ہمبر پُل مین میں تشریف فرما تھیں۔تدفین کے اگلے روز 13 ستمبر 1948ء کو محترمہ فاطمہ جناحؒ اور مسز واڈیا فلیگ سٹاف ہاؤس تشریف لے گئیں جسے نہ تو قائداعظمؒ نے خود تعمیر کرایا تھا، اور نہ ہی اس میں کبھی رہے تھے۔ان کی وہ ذاتی اشیا جو گورنر جنرل ہاؤس میں استعمال نہیں کی جاسکتی تھیں، اس بلڈنگ میں سٹور کر دی گئی تھیں۔ان میں عمدہ قسم کے قالین اور فرنیچر بھی شامل تھا۔مسز واڈیا فلیگ سٹاف ہاؤس کے کمروں میں گئیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔اس موقع پر انہوں نے بہت ساری اشیا شناخت کرلیں۔انہیں ان کی خریداری کا سال اور جگہ بھی یاد تھی۔انہیں ہر شے کے متعلق ہر وہ تعریفی جملہ بھی یاد آرہا تھا جو قائداعظمؒ نے اس چیز کے متعلق فرمایا تھا''۔

قائداعظمؒ نے شروع میں بیٹی کے ساتھ یقیناً ناراضی ظاہر کی تھی اور قطع تعلق بھی کیا ہوگا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ صورت نہ رہی اور پھر قائداعظمؒ اور دینا میں اخیر تک ملاقاتیں رہیں۔ اب تو وہ پیار بھرے خط بھی چھپ چکے ہیں جو بیٹی اپنے عظیم باپ کو لکھتی رہی۔ اب تک کے دستیاب ریکارڈ کے مطابق اس سلسلے کا آخری خط 1947ء میں لکھا گیا۔ شفقت پدری چیز ہی کچھ اور ہے۔ قائداعظمؒ آل انڈیا سٹیٹس مسلم لیگ کے صدر نواب بہادر یار جنگ کی بہت قدر کرتے تھے۔ نواب صاحب کہتے ہیں، ایک دفعہ وہ قائداعظمؒ کے ہاں گئے۔ قائداعظمؒ کسی دوسرے کمرے میں تھے۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد وہ بھی ادھر چل دیئے۔ دیکھا، قائداعظمؒ صندوق پر جھکے کوئی چیز دیکھ رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ نواب صاحب کہتے ہیں، میں متعجب ہوا۔ اس پر قائداعظمؒ نے بتایا کہ یہ میری بیٹی کے بچپن کے کپڑے ہیں۔ آج اس کی سالگرہ ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا نافرمان تھا، کافر تھا۔ ادھر پسر نوح سمیت کافروں کو نیست کرنے کے لئے طوفانی لہریں ٹھاٹھیں مار رہی تھیں تو ادھر حضرت نوحؑ کے سینے میں کافر بیٹے کے لئے بھی شفقت پدری پورے جوش میں تھی۔

(روزنامہ ایکسپریس لاہور۔ 28 مارچ 2004ء)

قائداعظمؒ
قدرتی موت یا قتل؟

28 دسمبر 2004ء۔روزنامہ ایکسپریس لاہور میں متحدہ قومی موومنٹ کے قائد الطاف حسین کا ایک بیان چھپا: ''مجھے پاکستان ٹیلی ویژن پر براہ راست (Live) اصل حقائق بیان کرنے کا موقعہ دیا جائے تو میں پاکستانی قوم کو ثبوت وشواہد کے ساتھ بتاؤں گا کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ سے محبت کی دعویدار اسٹیبلشمنٹ اور اسٹیبلشمنٹ کی تنخواہ پر کام کر کے قائداعظمؒ سے محبت کے دعوے کرنے والوں نے کس طرح انہیں خاموشی سے قتل کر ڈالا''۔

ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کا اس موضوع پر یہ پہلا اظہار خیال نہیں۔16 نومبر 2003ء کو انہوں نے متحدہ قومی موومنٹ لیبر ڈویژن کے زیر اہتمام خورشید بیگم میموریل ہال عزیز آباد کراچی میں منعقدہ افطار پارٹی سے لندن سے اپنے ٹیلی فونک خطاب میں کہا تھا: ''قائداعظمؒ کو ایک سازش کے تحت خاموشی سے قتل کیا گیا تھا، جس میں جاگیرداروں، جرنیلوں اور علمائے سوء کے ٹرائیکا نے گھناؤنا کردار ادا کیا تھا..... جاگیرداروں اور وڈیروں نے پاکستان کی محبت میں نہیں بلکہ صرف اپنی جاگیریں بچانے کے لئے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ قیام پاکستان کے بعد ان جاگیرداروں اور وڈیروں نے جرنیلوں کیساتھ مل کر پاکستان کے لئے جدوجہد کرنے والے اصل لیڈروں کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کیا، جس کے لئے سب سے پہلے قائداعظمؒ کو قتل کیا گیا۔ اس بات کو آج تک چھپایا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قائداعظمؒ طبعی موت نہیں مرے تھے بلکہ ان کو بغیر گولی یا چاقو کے ایک سازش کے ذریعے اس طرح قتل کیا گیا کہ ان کی موت پر کسی کو ان کے قتل کا گمان تک نہ ہو۔ چنانچہ جب قائداعظمؒ کو ناسازیٔ طبع کی وجہ سے کوئٹہ سے کراچی لایا جا رہا تھا تو انہیں ایک ایسی خراب ایمبولینس لینے بھیجی گئی جس میں صرف اتنا پٹرول ڈالا گیا تھا کہ وہ محض چند میل ہی چل سکے۔ چنانچہ قائداعظمؒ کی ایمبولینس کا ویرانے میں پٹرول ختم ہو گیا جہاں کئی گھنٹے وہ ایمبولینس کھڑی رہی۔ اس دوران قائداعظمؒ کی حالت بگڑ گئی جس کے نتیجے میں ان کا انتقال

ہوگیا۔ قائداعظمؒ کے قتل کے اس عمل میں فیوڈلز اور جرنیل شامل تھے''۔

(حوالہ: روزنامہ جنگ لاہور۔ 17 نومبر 2003ء۔ صفحہ: 12 کالم 4,3)۔

اس مہم میں الطاف حسین اکیلے نہیں، کئی دانشور طرز کے لوگ بھی ان کے شریک ہیں مثلاً جناب نذیر ناجی نے بھی اپنے کالم ''سویرے سویرے'' میں ''تاریخ کا قرض (1)'' کے عنوان سے روزنامہ جنگ لاہور 22 اکتوبر 2003ء میں لکھا: ''وہ کوئٹہ میں کن ذہنی صدمات اور عملی دشواریوں سے گزرے؟ اور پھر کراچی آکر ڈرگ روڈ پر کیسے حالات میں اللہ کو پیارے ہوئے؟ اس کے بارے میں ابھی تک کوئی مصدقہ تحقیقاتی رپورٹ دستیاب نہیں۔ قائدؒ کی اس ناگہانی موت کا نتیجہ یہ نکلا کہ پاکستان آئین اور قانون کی عملداری سے محروم ہوکر سیاسی عدم استحکام کی راہ پر چل نکلا اور دوبارہ پٹڑی پر نہیں چڑھ سکا''۔ پھر وہ 28 اکتوبر کے ''جنگ'' لاہور میں ''حساب ضرور ہوگا (آخری قسط)'' کالم 4 میں لکھتے ہیں:

میرے نزدیک یہ بھی ایک قتل تھا اور اس وقت تک اسے قتل ہی سمجھا جانا چاہئے جب تک پوری تحقیقات کے بعد حقائق مکمل جزئیات کے ساتھ سامنے نہیں آتے''۔

20 نومبر 2003ء کے کالم میں ناجی صاحب الطاف حسین کی تقریر مذکور سے اقتباس دہرا کر پھر اس پر تبصرہ کرتے ہیں۔

جناب نذیر ناجی اور الطاف حسین دونوں اس پر متفق ہیں کہ قائداعظمؒ کو قتل کیا گیا تھا۔ حالانکہ شواہد اس کی شدید تردید کرتے ہیں۔ قائداعظمؒ بالکل قدرتی موت کا شکار ہوئے تھے۔ وہ ایک عرصے سے بیمار تھے۔ جہاں انہیں قیام پاکستان کے مخالفین کے ساتھ چومکھی لڑنا پڑ رہی تھی وہاں اندرونی طور پر وہ بیماری سے بھی نبرد آزما رہے۔ جواب کو مزید طوالت سے بچانے کے لئے میں یہاں تین ذرائع پر زیادہ انحصار کر رہا ہوں۔ سید شمس الحسنؒ، مرزا ابوالحسن اصفہانیؒ اور مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ۔ قائداعظمؒ کے آخری ایام کے ایک معالج ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کی تصنیف WITH THE QUAID-I-AZAM DURING HIS LAST DAYS (قائداعظمؒ کے آخری ایام) اس لئے نظرانداز کر رہا ہوں کہ جب الزام یہ ہے کہ قائداعظمؒ کو قتل کیا گیا تھا تو ان کے آخری ایام کے فل ٹائم ڈاکٹر کا کردار بھی شبے سے پاک نہیں رہ سکتا۔

کون جانے سید شمس الحسنؒ کیا ہستی تھے۔ وہ فنافی المسلم لیگ اور فنافی القائداعظمؒ تھے۔ 1914ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی دفتر سے وابستہ ہوئے۔ انتھک محنتی، ذمہ دار، قابل بھروسہ، دیانتدار اور مخلص ہونے کے سبب انہیں آل انڈیا مسلم لیگ میں آفس سیکریٹری اور بعدازاں اسٹنٹ سیکریٹری مقرر

کیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ پاکستان مسلم لیگ میں بھی اسی عہدے پر کام کرتے رہے تا آنکہ پاکستان کے پہلے مسلمان کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں نے 7 اور 8 اکتوبر 1958ء کی شب دیگر جمہوریت کے ذریعے وجود میں آنے والے ملک سے جمہوریت کو دیس نکالا دیدیا۔

سید شمس الحسنؒ نے قائداعظمؒ کو پہلی بار 21 اگست 1916ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک کمیٹی جلسہ لکھنؤ میں دیکھا۔ پھر جو تعلق پیدا ہوا تو بڑھتا ہی چلا گیا۔ بقول ان کے: ''ایک مختصر سے درمیانی عرصہ کے علاوہ جبکہ انہوں نے لندن میں رہائش اختیار کر لی تھی، 1916ء سے لے کر قیام پاکستان کے بعد تک مجھے قائداعظمؒ کو خاصہ قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملتا رہا''۔ (حوالہ۔ رسالہ آتش فشاں لاہور۔ صفحہ 16۔ قائداعظمؒ نمبر۔ دسمبر 1976ء)۔

یہ مختصر سا درمیانی عرصہ جنوری 1931ء سے اخیر دسمبر 1933ء تک محیط ہے۔ جب گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد قائداعظمؒ نے لندن میں قیام کر لیا تھا۔ لیکن اس دوران میں بھی ہندوستان اور آل انڈیا مسلم لیگ کے حالات و واقعات سے آگاہی کے لئے ان کی سید شمس الحسنؒ کے ساتھ خط و کتابت رہی۔

سید صاحبؒ کے مطابق قائداعظمؒ نے 7 اگست 1947ء کے روز دہلی سے کراچی روانگی سے قبل انہیں اپنی رہائش گاہ 10 اورنگزیب روڈ پر بلایا۔ ٹاٹ کے تھیلوں کے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: ''ان میں میرے کچھ ذاتی خطوط اور کاغذات ہیں۔ یہ آپ لے جائیں''۔ میں نے پوچھا کہ ''میں انہیں تلف کر دوں یا سنبھال لوں''۔ جواب میں انہوں نے فرمایا: ''نہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ انہیں اس قتلِ عام میں تلف ہونے سے بچائیں۔ آپ انہیں اپنی ذاتی تحویل میں رکھیں''۔ چنانچہ وہ تھیلے میں اپنے گھر لے آیا۔ (حوالہ:..... صرف مسٹر جناح۔ تالیف: سید شمس الحسنؒ۔ صفحہ 18۔ اپریل 1995ء۔ پبلشرز: آتش فشاں لاہور)۔

سید صاحب دہلی سے کراچی آتے ہوئے کوئی ذاتی چیز ساتھ نہ لائے۔ انہیں اگر فکر تھی تو قائداعظمؒ کی اس مقدس امانت کو بحفاظت کراچی لے آنے کی۔ اکتوبر 1947ء۔ لاہور کے گورنر ہاؤس میں قائداعظمؒ کے ساتھ ان کی ملاقات ہوئی۔ سید صاحب لکھتے ہیں: ''جیسے ہی میں نے ان سے اجازت چاہی انہوں نے ان کاغذات کے متعلق دریافت فرمایا جو انہوں نے میرے سپرد کئے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہی واحد اسباب میں دہلی سے یہاں لا سکا ہوں۔ ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے فرمایا: '' کچھ عرصہ انہیں روکے رکھنا۔ یہی کوئی بیس برس۔ پھر انہیں شائع کر دینا۔ مسلمانوں کو ان مشکلات

کا علم ہونا چاہئے جوانہیں منظم کرتے وقت ہمیں پیش آئیں اور ان تفصیلات کا بھی کہ پاکستان کی جنگ کس طرح لڑی اور جیتی گئی''۔(ایضاً۔صفحہ:19)۔

سید صاحب نے 1976ء میں ان میں سے کچھ خطوط پر مشتمل'' پلین مسٹر جناح'' مرتب کی۔میں نے اس کا ترجمہ کرکے'' صرف مسٹر جناح'' کے عنوان سے شائع کیا۔اس میں قائداعظمؒ کی بیماری کے متعلق بھی کچھ تفصیل ملتی ہے اور اس ضمن میں ڈاکٹروں کے ساتھ قائداعظمؒ کی خط و کتابت بھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے، قائداعظمؒ ایک عرصے سے بیمار تھے۔ مثلاً سید شمس الحسنؒ لکھتے ہیں:'' قائدؒ دوسرے امور میں تو محتاط تھے لیکن صحت کے معاملے میں احتیاط نہیں برتتے تھے۔دہلی کی سردی ان کے موافق نہیں ہوتی تھی۔وہ اکثر ٹھنڈ اور فلو کے شدید حملوں کا شکار ہو جاتے۔لیکن کمزور صحت کے باوجود وہ اسمبلی اجلاس میں شرکت کرتے۔مباحث میں حصہ لیتے اور اپنا زیادہ تر وقت اور قوت سیاسی سرگرمیوں کے لئے وقف رکھتے۔ان دنوں اگر وہ بیمار پڑ جاتے تو ڈاکٹر انصاری سے علاج کرواتے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ایک دفعہ ڈاکٹر انصاری نے ان کے لئے بنگال کیمیکلز کی تیار کردہ دوائی لیسی وین(LECIVAN) تجویز کی تھی۔اس سے قائدؒ کی صحت خاصی بہتر ہوگئی۔یہ دوائی کئی برس تک ان کے زیر استعمال رہی.....لیگ کی تنظیم نو کے لئے انہیں حد سے زیادہ کام کرنا پڑا۔ان کی صحت برباد ہوگئی۔ 1943ء کے بعد وہ شاذ ہی تندرست رہے۔اس زمانے میں وہ ڈاکٹر کرنل رحمٰن کے زیر علاج رہے۔ تقسیم کے بعد کرنل رحمٰن گورنر جنرل پاکستان کے اعزازی مشیر نامزد ہوئے۔ان کی غیر موجودگی میں قائدؒ دوسرے فزیشنز سے مشورہ کرتے..... ستمبر 1944ء میں قائدؒ نیچر کیور کلینک اینڈ سینی ٹوریم پونا کے ڈاکٹر ڈی کے مہتہ کے زیر علاج رہے۔ڈاکٹر مہتہ نے گاندھی جی کا بھی علاج کیا تھا۔شاید گاندھی جی کے مشورے سے قائدؒ اس کے زیر علاج رہے۔کیونکہ یہ عرصہ وہی ہے جب گاندھی جناح بات چیت ہوئی''۔ (ایضاً۔صفحات:93,92)۔

جب قائداعظمؒ گاندھی کے معالج ڈاکٹر مہتہ کے زیر علاج تھے انہیں آرام کی غرض سے ماتھیران جانا پڑا۔ماتھیران بمبئی کے نزدیک صحت افزا مقام ہے۔قائداعظمؒ نے وہاں تین ماہ تک قیام کیا۔اس دوران میں ان کی ڈاکٹر مہتہ کے ساتھ خط و کتابت بھی رہی۔

سید شمس الحسن لکھتے ہیں:''مارچ 1945ء میں قائدؒ دہلی میں بیمار پڑ گئے۔ان کا علاج 6انڈر ہل روڈ کے ڈاکٹر البرٹ بٹی(ALBERT BATTY) نے کیا۔اپریل کے دوسرے ہفتے صحت یاب ہوکر قائدؒ بمبئی چلے گئے۔ان کی بمبئی روانگی کے متعلق ''ہندوستان ٹائمز'' دہلی نے 12اپریل 1945ء کے شمارے

میں یہ خبر شائع کی:

مسٹر جناح رُو بہ صحت ہیں

نئی دہلی۔ بدھ وار: آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر مسٹر ایم اے جناح آج صبح بمبئی روانہ ہو گئے۔ دہلی قیام کے دوران میں وہ ڈاکٹر رحمٰن کے زیرِ علاج رہے اور اب رُو بہ صحت ہیں۔ ڈاکٹر نے انہیں سفر کرنے کی اجازت دے دی، لیکن مکمل آرام کرنے اور علاج جاری رکھنے کی سخت ہدایت کی ہے۔ اے پی آئی۔ (ایضاً۔ صفحہ 98)۔

''بعض اوقات قائدؒ کے لئے گھریلو نسخے تجویز کئے گئے۔ صدر شعبۂ معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی کے پروفیسر الیاس برنی نے 14 اپریل 1945ء کو حیدر آباد سے قائدؒ کو لکھا:

آپ کی موجودہ کمزور صحت نے مجھے مشورہ دینے پر اکسایا ہے۔ علاج اس طرح ہے: زیتون کا تیل (چائے کا ایک چمچہ) لیں اور اسے بارلکس مالٹڈ مِلک (بڑا چمچہ) میں ملالیں۔ پھر اس میں گرم پانی ڈالیں۔ پہلے لئی بنائیں، اور پھر اسے اس قدر سیال حالت میں لے آئیں جو آپ کے لئے ذائقہ دار رہے۔ اس کی ایک ایک خوراک ہر صبح، شام لیں۔ کھانے سے کم از کم ایک گھنٹہ پہلے یا بعد۔ اگر پسند فرمائیں تو خوراک کی مقدار میں اضافہ کر سکتے ہیں''۔ (ایضاً۔ صفحات: 101، 102)۔

قائداعظمؒ کے ساتھ حسن اصفہانیؒ کی قربت 1920ء سے شروع ہو کر تا دمِ آخر رہی۔ اس دوران میں قائداعظمؒ نے انہیں آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی میں بھی لیا۔ قیام پاکستان کے بعد وہ امریکہ میں پاکستان کے پہلے سفیر مقرر ہوئے۔ وہ لکھتے ہیں:

''قائداعظمؒ سخت محنت کرتے تھے اور انہوں نے حقیقی معنوں میں اپنے آپ کو ایک بے وقت موت کی جانب دھکیل دیا۔ جب وہ کام کر رہے ہوتے تھے تو وہ بھوک تک کی بھی پروا نہ کرتے تھے اور نہ اس کا خیال کرتے تھے کہ کچھ لوگ جنہیں ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہونا ہے ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ وہ بے انتہا انہماک سے کام کرتے تھے اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ وقت بہت تیزی سے ختم ہو رہا ہے اور ہمارے پاس ضائع کرنے کو کوئی وقت نہیں ہے۔ بالخصوص 1946ء اور 1947ء کے دوران میں فکر، تشویش اور اضطراب کے ساتھ ساتھ شدید محنت کے ہیبت ناک زور نے گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں منتقلی کے فوراً بعد ان کی صحت کے پرخچے اڑا دیئے۔ شدید بیماری نے انہیں

فروری 1948ء میں گرفت میں لیا۔ جب جولائی 1948ء میں انہوں نے سٹیٹ بینک کا افتتاح کیا تو وہ بہت دبلے اور بیمار نظر آ رہے تھے۔ اس روز سے ان کی صحت مسلسل بگڑتی چلی گئی اور ہر مہینے کے گزرنے پر صحت کی بحالی کا امکان اور بھی کم ہوتا چلا جاتا تھا۔

.....جب ان کی صحت کی خرابی نے خطرناک صورت اختیار کر لی تو قائداعظمؒ ایک عوامی فریضہ ادا کرنے کے لئے ڈاکٹروں کے مشورے کے خلاف زیارت سے کراچی آئے۔ ان کے نزدیک اپنے فرائض کی ادائیگی ہمیشہ صحت یا آرام و آسائش پر مقدم تھی۔ انہیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ اپنی مالی اور اقتصادی حکمت عملی کے لئے پاکستان ریزور بینک آف انڈیا پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ چاہتے تھے کہ اپنے انتقال سے پہلے پاکستان کو مالی اور اقتصادی آزادی کے راستے پر گامزن ہوتا دیکھ لیں.....

.....بظاہر گویا انہیں اس آخری عوامی کام کی، جس کا مقصد پاکستان کی بنیاد کو مضبوط کرنا تھا، ترغیب اس لئے ہوئی کہ انہیں اپنی موت کے قریب ہونے کا پہلے سے احساس ہوگیا تھا۔ ہم پاکستانیوں کے لئے ان کا شکریہ ادا کرنے اور ان کی یاد کو خراجِ تعظیم پیش کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہم اس ''اقتصادی نظام'' کی نشوونما کریں اور وہ ''مثالی معاشرتی ڈھانچہ'' تعمیر کریں جس کی انہیں آرزو تھی۔

''جس زمانے میں قائداعظمؒ زیارت میں خطرناک طور پر بیماری اور کمزوری کی حالت میں صاحبِ فراش تھے تو اس وقت بھی وہ اپنے سرکاری کام میں مصروف رہتے تھے۔ مجھے ہماری وہ گفتگو ابھی تک یاد ہے جو میرے کراچی سے زیارت آنے پر ایک روز صبح کے وقت ہوئی تھی۔ جب میں نے ان پر زور دیا کہ وہ فائلوں اور حکومت کے روزمرہ کے کاموں کی فکر نہ کریں بلکہ مکمل آرام کریں، کیونکہ، بقول ان کے معالج کرنل الٰہی بخش، آرام صحت کی بحالی کے لئے بہت ضروری تھا، تو انہوں نے میری بات نہ سنی۔ میں نے لجاجت سے یہ کہا کہ ہماری نوزائیدہ خودمختار ریاست کے لئے ان کی جان ہر چیز سے زیادہ اہم ہے اور یہ کہ ہماری زندگی کے اس نازک مرحلے پر ان کی جدائی ہمارے لئے ایک بڑا اور خوفناک المیہ ہوگا۔ اس پر وہ مسکرائے اور کہنے لگے: ''بیٹا، تقسیم کے فوراً بعد اور 1948ء کے شروع تک ایک ایسا وقت ضرور آیا تھا کہ جب مجھے یہ فکر لاحق تھی کہ آیا پاکستان ان بہت سے غیر متوقع صدموں سے جانبر ہو سکے گا جو ہندوستان سے ہماری جدائی کے ذرا ہی دیر بعد ہمیں اس کے ہاتھوں پہنچے تھے۔ لیکن ہم نے انہیں برداشت کر لیا اور آئندہ کبھی کوئی چیز ہمیں اتنا پریشان نہ کرے گی۔ مجھے اب کوئی خوف نہیں رہا۔ آدمی آتے رہیں گے اور جاتے رہیں گے، لیکن پاکستان صحیح طور پر مضبوطی سے قائم ہو چکا ہے اور اللہ کے فضل و کرم

سے ہمیشہ باقی رہے گا''۔

.....جب ان سے زیارت میں ملاقات کے بعد جہاں وہ بہت بیماری کی حالت میں پڑے تھے، میں واشنگٹن واپس آیا تو میں نے ایک سے زائد مرتبہ ان کی خیریت دریافت کرنے کی غرض سے انہیں خط لکھا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ مجھے ان کی صحت کے بارے میں اتنا ہی زیادہ خیال تھا جتنا ان کے خاندان کے کسی فرد کو۔ انہیں میری محبت، عقیدت اور احترام کا علم تھا اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ وہ یہ بھی بخوبی جانتے تھے کہ وہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں اور ان کا سفر زندگی تیزی سے اپنے خاتمے کے قریب آ رہا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ مجھے افسردہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اس سے ان کے کردار کی ایک ایسی شرافت اور انسانی ہمدردی ظاہر ہوتی ہے جو عموماً دیکھنے میں نہیں آتی''۔ (حوالہ: قائداعظم جناحؒ -- جیسا میں انہیں جانتا ہوں۔ صفحات: 386 , 390 تا 394۔ جون 1994ء۔ پبلشر آتش فشاں لاہور)۔

قائداعظمؒ کو مرحوم حسن اصفہانیؒ نے 17 اگست 1948ء کو جو خط لکھا کتاب میں اس کا جواب بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس پر یکم ستمبر 1948ء کی تاریخ ہے۔ اس کے متعلق حسن اصفہانیؒ لکھتے ہیں:

''ان خطوں میں جو انہوں نے کبھی مجھے لکھے تھے یہ سب سے مختصر تھا۔ یہ مجھے 13 ستمبر کو ان کے انتقال کے دو روز بعد ملا۔ ان کے دستخط سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ قائداعظمؒ کی طاقت کم ہوتی جا رہی تھی اور قوتِ حیات بعجلت رخصت ہو رہی تھی''۔ (ایضاً۔ صفحہ: 395)۔

''اگرچہ میں نے یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی کہ درحقیقت میرے رہنما کو کیا شکایت تھی، لیکن مجھے کامیابی نہ ہوئی۔ ڈاکٹر الٰہی بخش جو سینئر نگران ڈاکٹر تھے، مجھے بتانا نہیں چاہتے تھے۔ مجھے تپ دق کا شبہ نہ ہوتا تھا اگرچہ وہ اس موذی مرض کا شکار ہو جانے کے لئے موزوں معلوم ہوتے تھے۔ میرا خیال یہ تھا کہ ان کی بیماری محض تھکن کی وجہ سے تھی جس کا سبب ان کی محدود قوتِ جسمانی پر برسوں کا مسلسل بوجھ، لامتناہی افکار، ناکافی غذا کھانا اور یقینی بدخوابی تھی''۔ (ایضاً۔ صفحہ: 396)۔

اس تفصیل کے بعد بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ قائداعظمؒ کی موت بالکل طبعی تھی۔ وہ ایک عرصے سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ مجھے یہ واقعہ چودھری محمد حسین چٹھہ مرحوم نے قائداعظمؒ کے آخری ایام کے ایک معالج کرنل ڈاکٹر الٰہی بخش کے حوالے سے بتایا، جو ان کی کتاب میں درج نہیں کہ جب انہوں نے قائداعظمؒ کی تشخیص کی اور انہیں بتایا کہ آپ کو ٹی بی ہے تو انہوں نے جواب دیا، ''ڈاکٹر! یہ تو میں بارہ برس سے جانتا ہوں۔ صرف اس لئے ظاہر نہ کیا کہ ہندو میری موت کا انتظار نہ کرنے لگے''۔

پاکستان بنانے کی دھن میں قائداعظمؒ اپنی بیماری کو اتنی اہمیت بھی نہ دیتے تھے۔ان کی بیماری کے متعلق مادرِملت محترمہ فاطمہ جناحؒ لکھتی ہیں:

''زندگی کے آخری دس برس کے دوران ان کی سیاسی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا۔جبکہ وہ بڑھاپے کی سرحدوں میں پہلے ہی داخل ہو چکے تھے۔ڈاکٹروں کے مشورے اور چھوٹی بہن کی التجاؤں کے باوجود انہوں نے اپنا کوئی خیال نہ رکھا۔وہ آرام کرنے یا اپنے کام کی رفتار میں کمی کرنے سے مسلسل انکار کرتے رہے۔وہ زندگی کی توانائی کے باقی ماندہ ذخیرے کو کسی کھلنڈرے بچے کی طرح بے دریغ لٹاتے رہے۔ان کی خرابیٔ صحت سے خوفزدہ ہوکر میں جب کبھی ان سے طویل اوقات میں اتنا زیادہ کام نہ کرنے کی التجا کرتی یا ہندوستان بھر کے مسلسل طوفانی دوروں کا پروگرام کچھ عرصے کے لئے ملتوی کردینے کا مشورہ دیتی تو وہ کہتے:''کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ کسی جنرل نے چھٹی کی ہو جب اس کی فوج میدانِ جنگ میں اپنی بقا کی جنگ لڑ رہی ہو؟''انہیں کمال حاصل تھا کہ بنا بنایا مقدمہ ایک جملے میں اڑا دیتے۔میری بھلا کیا حیثیت کہ انہیں قائل کرسکتی۔ایسے مواقع پر میں عموماً دلائل کی بجائے جذبات کا سہارا لیا کرتی تھی۔میں کہتی:''آپ کی زندگی قیمتی ہے اور آپ کو اس کی مناسب دیکھ بھال کرنی چاہئے''۔ ان کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھرتے۔وہ کہتے:''فردِ واحد کی صحت کیا حیثیت رکھتی ہے جبکہ میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کی بقا کے بارے میں پریشان ہوں۔کیا تم جانتی ہو کہ (مسلمان قوم کا) کیا کچھ خطرے میں ہے؟''ان کا یہ کہنا جذبات کو خاموش کردینے کے لئے کافی ہوتا۔اور اس کے بعد وہ اپنی صحت کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے سیاست کے تلاطم خیز سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتے۔(''میرا بھائی''صفحہ 66)۔

1940ء میں جب سے مسلم لیگ نے لاہور میں اپنی قرارداد منظور کی تھی جو قراردادِ پاکستان کے نام سے معروف ہوئی،تب سے کام کی زیادتی کے باعث وہ اپنی گرتی ہوئی صحت کا بھی خیال نہ رکھتے۔ ان کی واحد قوت ان کے منتشر اور غیرمنظم پیروکار تھے۔ انہوں نے اس برس (1940ء) سے انسانی تاریخ کے ایک عظیم باب کی حیثیت سے قیامِ پاکستان کے مطالبے کو عملی شکل دینے کا بیڑا اٹھایا۔ایک سیاستدان کو اپنی جدوجہد کے دوران بے پناہ سفر کرنا پڑتا ہے،طویل اور تکلیف دہ حالات میں سخت محنت کرنا پڑتی ہے اور یہ امور ان کی صحت پر بہت گراں تھے۔مگر انہوں نے ان سب مصائب ومشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ پانچ فٹ ساڑھے دس انچ ("½10-'5) قد کے ساتھ ان کا معمول کا وزن 112 پونڈ تھا۔مگر اب وہ ایک ایک اونس کرکے اپنا وزن کھو رہے تھے۔وہ اپنی

صحت اور اس قسم کے دیگر ذاتی معاملات سے قطعی بے نیاز ہو چکے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس قسم کے نجی معاملات ان کے کام میں حائل ہوں۔ میں نے ایک بار پھر انہیں دلائل سے اور التجاؤں کے ذریعے قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ قابل ڈاکٹروں سے مشورہ کریں اور اپنی صحت کی جانب کچھ نہ کچھ توجہ ضرور دیں۔ مگر میں ان کی مضبوط قوتِ ارادی کے سمندر کے سامنے بند باندھنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکی جو ان تمام رکاوٹوں کو بہالے جانا چاہتا تھا جو ان کی قوم کی راہ میں حائل تھیں۔

''صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے اپنے فرائض اور ذمہ داریاں پوری کرنے کے علاوہ انہیں سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی (مرکزی مجلسِ قانون ساز) میں مسلم لیگ پارٹی لیڈر کی حیثیت سے بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ گزشتہ کئی روز سے انہیں بخار آ رہا تھا، اس کے باوجود ہم (اوائل نومبر 1940ء) میں اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لئے بمبئی سے دہلی روانہ ہوئے۔ وہ رات کا کھانا کھا چکے تھے اور ٹرین تاروں بھرے صاف شفاف آسمان کے نیچے تیزی کے ساتھ دہلی کی طرف رواں تھی۔ وہ بستر میں لیٹے ہوئے تھے کہ اچانک زور سے چلّا اٹھے۔ جیسے کسی نے لوہے کے (آگ میں تپائے ہوئے) سرخ دہکتے ہوئے ٹکڑے سے ان کا جسم داغ دیا ہو۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچی اور ان کے اس طرح بلبلا اٹھنے کی وجہ دریافت کی۔ درد کی شدت نے ان کی قوت گویائی سلب کر لی تھی۔ چنانچہ کچھ کہنے کی بجائے وہ انگلی سے ریڑھی کی ہڈی کے نیچے دائیں جانب صرف اشارہ کر کے رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ درد ناقابلِ برداشت تھا اور یہ بھی واضح تھا کہ چلتی ہوئی گاڑی میں طبی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے درد کم کرنے کے خیال سے ان کے جسم کے متاثرہ حصے کو آہستہ آہستہ ملنا شروع کیا۔ مگر ایسا کرنے سے ان کی تکلیف میں اور بھی اضافہ ہونے لگا۔ مایوس ہو کر میں نے یہ کوشش بھی ترک کر دی۔ مجھے امید تھی کہ ٹرین کسی سٹیشن پر رکے گی تو متاثرہ حصے کی ٹکور کرنے کے لئے گرم پانی کی بوتل کا انتظام کیا جا سکے گا۔ لمحے بوجھل قدموں کے ساتھ آہستہ آہستہ گزرتے رہے۔ یہاں تک کہ ٹرین کی بریکوں کی چرچراہٹ سنائی دینے لگی اور بالآخر گاڑی ایک سٹیشن پر رک گئی۔ میں نے گارڈ سے کہا کہ وہ فوراً گرم پانی کی بوتل کا بندوبست کرے اور اسے ہمارے کمپارٹمنٹ میں بھجوا دے۔ بوتل آ گئی تو میں نے اسے ایک نیپکن میں لپیٹ کر درد والی جگہ پر آہستہ آہستہ ٹکور کرنا شروع کی اور یہ جان کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ اس سے درد کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔

''ٹرین علی الصبح دہلی پہنچی اور جلد ہی ہم اپنی رہائش گاہ، 10 اورنگزیب روڈ پہنچ گئے۔ میں نے اپنے بھائی کو کار سے بستر تک جانے میں ان کی مدد کی۔ میں نے ٹیلی فون پر فوراً ڈاکٹر کو بلایا۔ تفصیلی معائنے کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ قائداعظمؒ کے پھیپھڑے کی جھلی پر ورم آ گیا ہے اور انہیں کم از کم دو ہفتے تک لازمی طور

پرآرام کرنا چاہئے۔ جونہی ڈاکٹر گیا میرے بھائی نے مجھ سے کہا،''کس قدر بدقسمتی کی بات ہے، یہ اجلاس بہت اہم ہے، میری وہاں موجودگی نہائت ضروری ہے اور ایک میں ہوں کہ بستر میں جبری آرام کے تعیش کا پابند کردیا گیا ہوں''۔ وہ دو روز تک تو بستر میں رہے مگر اس کے بعد دوبارہ کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ ایک انتھک اور بے چین شخص تھے جو اپنی قوم کی تاریخ کے پریشان دور میں پیدا ہوئے تھے۔

قائداعظمؒ تقریباً ایک گھنٹہ بولے اور وہ بدستور کھڑے تھے۔ جبکہ میں ان کی صحت کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھی جو ہرگز اطمینان بخش نہیں تھی......۔

......جب ہم اسمبلی سے بذریعہ کار گھر کی جانب روانہ ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور ان کی انگلیاں سگریٹ کو بمشکل تھامے ہوئے تھیں۔ گھر پہنچتے ہی وہ سیدھے جا کر بستر میں لیٹ گئے۔ یہاں تک کہ ان میں لباس تبدیل کرنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی۔

''میرے خیال میں پھیپھڑے کی جھلی پر ورم کا حملہ بالآخران کے لئے مرض الموت ثابت ہوا۔ وہ اس مرض پر قابو پاسکتے تھے بشرطیکہ وہ احتیاطی تدابیر اختیار کرتے۔ اگر ان کے کام کرنے کے اوقات معین اور منظم ہو جاتے۔ اگر وہ آندھیوں اور بارشوں میں باہر نکلنے میں احتیاط کرتے۔ مگر وہ تو برعظیم کے تقریباً مسلسل دورے پر رہا کرتے تھے۔ اس مرض کے بعد وہ سردی سے الرجک ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ سردی کے معمولی سے حملے سے بھی وہ کئی کئی روز بخار اور کھانسی کی اذیت میں مبتلا رہتے تھے۔

''چند ماہ بعد اپریل 1941ء میں ہم بمبئی سے مدراس جارہے تھے جہاں انہیں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرنا تھی۔ ہماری ٹرین ابھی مدراس سے چند گھنٹے کی مسافت پر تھی کہ وہ اپنی سیٹ سے اٹھ کر غسل خانہ میں گئے۔ یہ دیکھ کر صدمے سے میرا براحال ہو گیا کہ وہ چند قدم چلنے کے بعد ٹرین کے چوبی فرش پر نڈھال ہو کر گر گئے۔ میں لپک کر ان کے پاس پہنچی اور ان سے پوچھا،''جن! کیا بات ہے؟''ایک روکھی پھیکی اور تھکی ہوئی مسکراہٹ ان کی لبوں پر نمودار ہوئی:''میں بے حد کمزوری اور تھکاوٹ محسوس کررہا ہوں''۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر خود کو اٹھایا اور لڑکھڑاتے ہوئے اپنی برتھ کی جانب بڑھے۔ خوش قسمتی سے ٹرین چند ہی منٹ کے دوران کسی اہم جنکشن پر پہنچ کر رک گئی، جہاں ہزاروں جوشیلے مسلم لیگی کارکن''قائداعظمؒ زندہ باد'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے آہستگی سے اپنے کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور چلا کر کہا،''شورمت مچایئے، قائداعظمؒ تھکاوٹ اور بخار کے باعث بستر پر ہیں۔ دوڑ کر کسی ڈاکٹر کو بلا لایئے''۔ چند ہی منٹ کے اندر ڈاکٹر آ گیا جس نے قائداعظمؒ کا معائنہ کیا اور بولا،''جناب آپ کو معمولی نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں، مگر میں آپ کو کم ازکم

ایک ہفتہ تک کسی بھی قسم کی سرگرمی میں حصہ نہ لینے کا مشورہ دوں گا۔ آپ کو ایک ہفتے تک بستر میں مکمل آرام کرنا چاہئے''۔

''اب ہم مدراس میں تھے جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے ہزاروں مندوبین جمع تھے۔ قائداعظمؒ اس قدر کمزور تھے کہ پہلے روز کے عام اجلاس سے خطاب نہ کر سکے مگر دوسرے روز انہوں نے صدارتی خطبہ دینے پر اصرار کیا۔ میں نے انہیں اس کے برعکس مشورہ دیا مگر وہ اپنے فیصلے پر مصر رہے۔ اس پر میں نے ان سے مختصر تقریر کرنے کی استدعا کی۔ انہوں نے یقین دلایا ''ہاں، یہ (تقریر) بہت مختصر ہو گی''۔

''جونہی وہ خطاب کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو اجلاس پر گہری خاموشی چھا گئی۔ انہوں نے نوٹس کے بغیر فی البدیہہ تقریر کی۔ انہوں نے ہر نکتے کو وضاحت سے استوار کیا اور انہیں ایسی آسان اور شستہ زبان میں بیان کیا کہ انہیں عام شخص بھی بآسانی سمجھ سکتا تھا، خواہ وہ اس دور کی ہندوستانی سیاست کی پیچیدگیوں اور باریکیوں سے یکسر نابلد ہی کیوں نہ تھا۔ انہوں نے ایک ایسے لیڈر کے انداز میں اپنے خیالات حاضرین تک پہنچائے جو نہ صرف اپنے ذہن کو سمجھتا تھا بلکہ اپنے پیروکاروں کے جذبات سے بھی بخوبی آگاہ تھا۔ ان کا خطاب اختصار سے بہرحال کوسوں دور تھا کیونکہ وہ مسلسل دو گھنٹے تک تقریر کرتے رہے۔ یہ رہنما جو صاحبِ فراش ہونے کے باوجود اپنے عوام کے پاس جانے کے لئے بے قرار تھا، ہندوستانی مسلمانوں کی منزلِ مقصود کی انتہائی جرأت کے ساتھ وضاحت کر رہا تھا..... ۔

(ایضاً۔ صفحات 68تا72)۔

''مجھے ان کی کارکردگی پر فخر تھا، مگر اس فخر کے پیچھے ان کی خرابیٔ صحت کا خدشہ بھی منڈلا رہا تھا۔ تاہم اس عظیم اجتماع کے بے پناہ جوش و خروش نے ان کے تھکے ماندے جسم کو انتہائی طاقتور ٹانک فراہم کر دیا تھا۔ وہ کام کے رش میں، جسے انہوں نے برضا و رغبت قبول کر رکھا تھا، اپنی کمزوری، تھکن اور بخار کو بھول گئے۔ قیام پاکستان سے پہلے کے سات برس ان کی زندگی کا مصروف ترین اور انتہائی ہنگامہ خیز دور تھا۔ انہوں نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے انتھک اور مسلسل جدوجہد کی اور اس کے جواب میں مسلمانوں نے انہیں اپنی خوش دلی سے وفاداری اور تعاون دیا۔ مسلمانوں نے انہیں محبت سے ''قائداعظم''۔۔دی گریٹ لیڈر۔۔ کے نام سے پکارا۔ اب قائدؒ بھی ہندوستانی مسلمانوں کی نجات کی جدوجہد میں اپنے کردار کے بارے میں پہلے سے کہیں زیادہ آگاہ ہو چکے تھے۔ میں، جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہی، دیکھتی کہ وہ بمشکل بسترِ علالت سے اٹھتے۔ ان کے چہرے پر تھکن اور اضمحلال کے آثار نمایاں

ہوتے۔ حالانکہ وہ خاصا سمارٹ لباس پہنتے تھے۔ ہم مسلمانوں کے عام جلسوں سے خطاب کرنے کے لئے اپنی کار میں روانہ ہو جاتے۔ سارا راستہ وہ نہایت خاموش رہتے۔ اس خاموشی کا مقصد خیالات کو مجتمع کرنا نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اپنی توانائی کا ایک ایک اونس بچا کر رکھنا چاہتے تھے۔ وہ پیروکاروں اور مداحوں کی صفوں میں پہنچتے تو ان کی نگاہوں میں تھکاوٹ اور اداسی ہوتی تھی اور وہ دونوں طرف باری باری قدرے جھک جھک جاتے اور اپنی پارٹی کے لوگوں کے سلام قبول کرتے اور انہیں پُر جوش جوابی سلام کرتے چلے جاتے۔ ان کے قدم مضبوط ہوتے تھے اور ان کی آنکھیں امید کی روشنی سے جگمگاتی تھیں۔ وہ ڈائس پر چلے جاتے۔ قرآن حکیم کی چند ایک آیات کی تلاوت اور مقامی رہنماؤں کی تقاریر کے بعد وہ چند قدم چل کر مائیک کے سامنے تشریف لے جاتے۔ اب وہ ننگی زمین پر بیٹھے ہوئے لاکھوں پرجوش لوگوں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالتے اور اس کے بعد وہ ایسے لب و لہجے اور آواز میں ان سے خطاب کرنے کا آغاز کرتے گویا ان پر بڑھاپا یا خرابی صحت مطلق اثر انداز ہی نہ ہوئی ہو۔ ہر وقفے کے دوران حاضرینِ جلسہ ''قائداعظمؒ زندہ باد'' کے نعرے لگاتے۔ وہ اپنی آواز کو عوام کے دلوں میں پیدا ہونے والی امیدوں، امنگوں اور مسرتوں کے ساتھ ساتھ بلند سے بلند تر کرتے چلے جاتے جواب تک خود کو کھلے آسمان تلے ہولناک اندھیرے کی قید میں محسوس کر رہے ہوتے تھے۔ قائداعظمؒ کی قوم ہرگز نہیں جانتی تھی کہ اس کا لیڈر کس قدر تھکا ماندہ، مضمحل اور جسمانی طور پر کمزور اور بیمار ہے۔ وہ اپنی قوم کے ہیرو تھے اور ہیرو کے ہیرو پن کو بھلا کون الزام دے سکتا ہے؟

''گھر واپسی پر اپنے کمرے کی مقدس تنہائی میں وہ بے سُدھ اور بے جان سے ہو کر لیٹ جاتے اور ہانپتے ہانپتے سانس لیتے۔ تاریخ کے دوسرے بہت سے مشاہیر کی طرح وہ تنہائی میں زیادہ آرام محسوس کرتے تھے مگر ان کے اندر دہکتی ہوئی آگ اپنی قوم کے دلوں کو دور سے بھی گرمائے رکھتی تھی۔

.....وہ ایک ایسی روح تھے جو خدمت کے لئے بے قرار تھی اور وہ روح ایک ایسے جسم میں تھی جو کام اور خرابی صحت سے ٹوٹ چکا تھا۔ کئی سال تک ان پر بخار کی سی کیفیت طاری رہی۔ بخار کے بار بار کے بلّوں نے ان کے جسم کو لاغر کر دیا تھا۔

''قیامِ پاکستان کا مطالبہ تسلیم کیا جا چکا تھا اور پاکستان 14، 15 اگست کی درمیانی شب معرضِ وجود میں آ چکا تھا۔ جونہی ہم گاڑی میں کراچی کی مختلف سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے گورنر جنرل ہاؤس کی جانب جا رہے تھے تو لوگوں کے انتہائی خوش اور پر جوش ہجوم کو ہرگز خبر نہیں تھی کہ قائداعظمؒ کس قدر شدید علیل تھے۔ ان کی قوم کے لئے یہ آزادی کا دن تھا اور خود قائدؒ کے لئے یہ تکمیل کا ایک لمحہ تھا۔ منزل آ گئی تھی مگر

سفر ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ دنیا کے سیاسی نقشے پر ابھرنے والی اس مملکت کو بھی کئی بڑے بڑے اور سنگین مسائل کا سامنا تھا۔ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے پاکستان کی تقدیر کی کشتی کو ایک محفوظ ساحل تک لے جانے کا کام ان کے ہاتھوں میں تھا اور وہ کام کی کثرت سے تھک چکے تھے۔

''میں نے انتہائی افسوس اور کرب کے ساتھ دیکھا کہ کامیابی کے اس عظیم لمحے میں قائداعظمؒ کی جسمانی صحت کسی بھی لحاظ سے اطمینان بخش نہیں تھی۔ ان کی بھوک برائے نام رہ گئی تھی بلکہ بالکل ہی ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ انتہائی توجہ اور محبت سے بنائے گئے کھانے بھی انہیں کھانے کی طلب پر آمادہ نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی بھر کی اپنی مرضی سے سو جانے کی عادت اب عنقا ہو چکی تھی اور وہ مسلسل کئی کئی راتوں تک بے خوابی کے عالم میں تکیوں پر کروٹیں بدلتے اور جاگتے رہتے تھے۔ ان کی کھانسی میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ حرارت بھی اب زیادہ رہنے لگی تھی۔ پاکستان کی سرحد کے اس پار سے مسلمانوں کے قتل عام، آبروریزی، آتش زنی اور لوٹ مار کے خوف زدہ کر دینے والے واقعات نے قائداعظمؒ کے ذہن پر شدید اثرات مرتب کئے تھے۔

''جب بھی وہ ناشتے کی میز پر مجھ سے اس قدر وسیع پیمانے پر کئے جانے والے قتل عام کا ذکر کرتے تو ان کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہو جاتیں۔ ہندوستان سے اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان آنے والے مہاجرین کے مصائب نے ان کے ذہن پر افسردگی طاری کر رکھی تھی......

(ایضاً: صفحات: 79,76,75)۔

''ہماری کراچی میں آمد کے چند روز بعد ان کے اعزاز میں کراچی کلب میں ایک عشائیہ دیا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے کہا،

''مس فاطمہ جناح میرے لئے مسلسل امداد اور حوصلہ افزائی کا ذریعہ رہی ہیں۔ ان دنوں میں جب مجھے اندیشہ تھا کہ برطانوی حکومت مجھے گرفتار کر لے گی، یہ میری بہن ہی تھی جس نے مجھے حوصلہ دیا اور بہت سی امید افزا باتیں کہیں جبکہ انقلاب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔ انہوں نے میری صحت کا مستقل خیال رکھا''۔

''اس وقت بھی ان کے سامعین کو ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ ان کے لیڈر کی صحت کس حد تک خراب ہو چکی ہے۔

.... علالت کے عفریت نے ان کی بہت سی جسمانی طاقت زائل کر دی تھی لیکن ان کے نہ دبنے والے جذبے نے آزادی کے ساتھ آنے والے مسائل کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کا سر بلند رکھا۔ وہ ان

مسائل کا سامنا عزم و ہمت سے کرنا چاہتے تھے تاکہ انہیں حل کرنے کی کوشش کرسکیں''۔(ایضا:صفحہ 80)

''انہوں نے اپنی صحت کی جانب توجہ دینا بالکل ترک کردیا تھا۔ان کی کھانسی اور ہلکے بخار نے مجھے اور بھی زیادہ پریشان کرنا شروع کردیا تھا۔میرے اصرار پر وہ اپنے ذاتی فزیشن ڈاکٹر کرنل رحمٰن سے معائنہ کرانے پر رضامند ہوگئے۔وہ ڈاکٹر کی دواؤں سے غیر معمولی طور پر اجتناب کرتے رہے۔میں کبھی اس بات کی وجہ نہ جان سکی کہ آخران کی زندگی بھر کی اس عادت کی وجوہ کیا تھیں۔معائنے کے بعد کرنل رحمٰن نے بتایا کہ انہیں معمولی ملیریا ہے اور وہ اسی تشخیص کی بنیاد پر ان کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔قائداعظمؒ نے اپنے ڈاکٹر سے متعدد سوالات اور استفسارات کئے جیسے وہ کمرۂ عدالت میں کسی گواہ پر جرح کر رہے ہوں۔ڈاکٹر کی وضاحت سے مطمئن نہ ہونے کے باعث انہوں نے اس کی تجویز کردہ ادویات استعمال کرنے سے انکار کردیا:''مجھے ملیریا نہیں ہے، مجھے کام کی کثرت نے نڈھال کررکھا ہے''۔اس قسم کی صورت حال میں ظاہر ہے کہ آرام ہی سب سے بہترین دوا تھی۔مگر آرام وہ کرنہیں سکتے تھے۔ابھی انہیں بہت سا کام کرنا تھا۔انہوں نے مجھ سے کہا،''میں اپنی جسمانی طاقت کی کان کھود کرتوانائی کا آخری اونس تک ڈھونڈ نکالوں گا اور اسے اپنی قوم کی خدمت میں صرف کردوں گا۔اور جب وہ بھی ختم ہوجائے گا تو میرا کام مکمل ہوچکا ہوگا۔پھر زندگی نہیں رہے گی''۔(ایضا:صفحہ 82)

''پشاور میں منعقد کئے جانے والے جلسہ ہائے عام میں سے ایک کے دوران آسمان پر گھرے سیاہ بادل چھا گئے۔جلسہ شروع ہوا تو بوندا باندی ہونے لگی مگر بارش ہونے کے اندیشے سے بے نیاز ہزاروں لوگ اپنی اپنی جگہوں پر اسی طرح بیٹھے رہے۔میرے بھائی ان لوگوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے حالانکہ میں نے، جو ان کے برابر ہی بیٹھی تھی، انہیں مشورہ دیا کہ ہمیں اب لازماً چلنا چاہئے۔وہ بارش سے بری طرح بھیگ گئے اس کے باوجود وہ جلسے کی مکمل کارروائی کے دوران اسی طرح بیٹھے خراب موسم کا مقابلہ کرتے رہے۔اس رات انہیں زکام ہوگیا، سردی لگ گئی اور کھانسی کے ساتھ شدید بخار ہوگیا۔انہوں نے ڈاکٹر کو بلانے کا میرا مشورہ مسترد کرتے ہوئے کہا،''کچھ بھی تو نہیں ہے۔بس ذرا سردی لگ گئی ہے۔میں اس پر قابو پالوں گا''۔

''مگر وہ اس پر کبھی قابو نہ پاسکے۔جب ہم کراچی واپس پہنچے تو ان کی کھانسی نے مسلسل صورت اختیار کرلی تھی۔اور جب اصرار کرکے ایک ڈاکٹر کو ان کا معائنہ کرنے کے لئے کہا گیا تو پتہ چلا کہ ان پر برونکائٹس (نرخرے، حلق کا ورم) کا معمولی حملہ ہوا ہے۔اگرچہ اس کے باعث وہ چند روز تک بستر میں پڑے رہے مگر اس کے باوجود وہ ان فائلوں کا باقاعدگی سے مطالعہ بھی کرتے رہے جو انہیں بھیجی جاتی

تھیں''۔(ایضاً۔صفحات:91,90)

سٹیٹ بینک آف پاکستان کا انہوں نے یکم جولائی 1948ء کو افتتاح کیا۔اس مقصد کے لئے وہ کوئٹہ سے کراچی آئے۔محترمہ لکھتی ہیں:

''تقریب میں موجود ہر شخص نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ قائداعظمؒ کی صحت خراب ہو چکی تھی۔ان کی آواز بمشکل سنی جا سکتی تھی۔جونہی وہ تقریر کرتے جا رہے تھے، وہ رکتے رہے، کھانستے رہے۔جب ہم تقریب سے فارغ ہو کر واپس گورنر جنرل ہاؤس پہنچے تو قائد کپڑوں اور جوتوں سمیت بستر میں لیٹ گئے۔مگر ان کے ناتواں جسم میں نظر کو چندھیا دینے والی ذہانت کا شعلہ اب بھی اسی طرح روشن تھا''۔(ایضاً:صفحہ 97)

''اب تک وہ اپنا تفصیلی معائنہ کرانے اور خود کو مکمل طور پر ڈاکٹروں کے رحم و کرم پر چھوڑنے سے انکار کرتے آئے تھے۔ان کا خیال تھا کہ وہ صحت کو اپنی مرضی کے تابع رکھ سکتے ہیں، مگر اب انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کی یہ کوششیں ناکامی سے دوچار ہوں گی اور اس طرح پہلی بار ان کی صحت نے خود انہیں خطرے کا الارم دینا شروع کیا۔ایک روز علی الصبح جب انہوں نے رضامندی ظاہر کی کہ اب انہیں اپنی صحت کے بارے میں مزید خطرات مول نہیں لینے چاہئیں، انہیں مناسب طبی مشورے اور دیکھ بھال کی ضرورت ہے، یہ سن کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔میں نے وقت ضائع کئے بغیر قائداعظمؒ کے پرائیویٹ سیکرٹری مسٹر فرخ امین سے کہا کہ وہ کابینہ کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کریں اور ان سے کہیں کہ وہ لاہور کے نامور فزیشن ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش کو فوری طور پر بذریعہ ہوائی جہاز زیارت بھجوانے کا انتظام کریں۔یہ 21 جولائی 1948ء کا واقعہ ہے''۔(ایضاً۔صفحہ:99)۔

''جب کرنل الٰہی بخش قائداعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے غیر ضروری تشویش سے خالی لہجے میں کہا،''سر! مجھے اندیشہ ہے کہ کلینکل ٹیسٹوں کے نتائج کے مطابق آپ کے پھیپھڑوں میں انفیکشن ہو گیا ہے''۔قائداعظمؒ نے یہ خبر خاموشی سے سنی اور چند منٹ کے بعد انہوں نے کہا،''اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ٹی بی ہے''۔کرنل الٰہی بخش ان کی بات سن کر خاموش رہے۔''ڈاکٹر ذرا بتایئے کہ مجھے یہ شکایت کتنے عرصے سے ہو سکتی ہے''؟ قائداعظمؒ نے استفسار کیا۔

''سر! میرا خیال ہے یہ مرض کم از کم دو برس پرانا تو ضرور ہے، مگر اس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے پہلے میں آپ کے سینے کا ایکسرے کرنا چاہتا ہوں۔تاہم میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں سر، مرض زیادہ سنگین نہیں ہے۔ہم اپنی سی بہترین کوشش کریں گے اور اگر آپ کا جسمانی نظام علاج سے ہم

آہنگ ہو گیا تو آپ جلد ہی بالکل تندرست وتوانا ہو جائیں گے''۔

''اپنے بھائی کے زرد ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ جواب بے پناہ تھکن اور پژمردگی کی غمازی کرتا تھا، ان کی دلجوئی کرنے کے لئے میں تنہا تھی۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائے اور کہا:''فاطی! تم نے دیکھا، تم درست ہی کہا کرتی تھی..... مجھے سپیشلسٹ سے بہت پہلے مشورہ کرنا چاہئے تھا..... مگر مجھے کوئی افسوس نہیں ہے، آدمی صرف جدوجہد کر سکتا ہے..... تقدیر کی زبان ہمیشہ گونگی ہوا کرتی ہے..... میں اپنے فرائض اس وقت تک انجام دیتا رہوں گا جب تک میں انہیں ادا کرنے کے قابل ہوں..... تم جانتی ہو میرا ہمیشہ سے اصول رہا ہے..... کہ میں کبھی آنکھیں بند کر کے..... دوسروں کے مشورے قبول نہیں کیا کرتا..... میں نے ہمیشہ..... اپنی سوچ اور مرضی کے مطابق عمل کیا ہے..... اور میں نے زندگی کو شدید مشکلات سے سیکھا ہے''۔(ایضاً۔صفحات:103,102)۔

''اگست کے آخری دنوں میں قائداعظمؒ اچانک ہر چیز سے بے نیاز نظر آنے لگے اور ایک روز انہوں نے انہماک سے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:''فاطی! مجھے اب مزید..... زندہ رہنے سے..... کوئی دلچسپی نہیں..... میں جتنی جلدی چلا جاؤں..... اتنا ہی بہتر ہوگا''۔

''یہ بدشگونی کے الفاظ تھے۔ میں لرز اٹھی، جیسے میں نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ مگر میں نے خود کو پرسکون رکھتے ہوئے کہا:''جن! آپ جلد ہی اچھے ہو جائیں گے، ڈاکٹر پرامید ہیں''۔ وہ مسکرائے، ایک مردے کی سی مسکراہٹ:''نہیں..... میں اب زندہ نہیں رہنا چاہتا''۔

''یکم ستمبر کو ڈاکٹر الٰہی بخش نے مجھ سے مایوس لہجے میں کہا:''قائداعظمؒ پر ہیمبرج کا حملہ ہوا ہے۔ میں پریشان ہوں۔ ہمیں انہیں کراچی لے جانا چاہئے۔ کوئٹہ جیسے شہر کی بلندی ان کے لئے موزوں نہیں ہے''۔ ان کی حالت خراب ہونا شروع ہو گئی اور 5 ستمبر کو ان کے تھوک کے معائنے سے ڈاکٹروں کو معلوم ہوا کہ ان پر نمونئے کے حملے کے آثار نمایاں ہیں۔ خون کے معائنے سے یہ بھی پتہ چلا کہ انہیں شدید انفیکشن ہو چکا ہے۔ انہیں اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اور سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اس پر ڈاکٹروں نے انہیں آکسیجن دینا شروع کر دی۔ 7 ستمبر کو میں نے واشنگٹن میں مسٹر اصفہانی کے نام تار دیا کہ فوراً امریکہ سے اس سپیشلسٹ کو بھجوائیں جس کا نام ڈاکٹر ریاض نے تجویز کیا تھا۔ اس سے اگلے روز میں نے کراچی کے ڈاکٹر محمد علی مستری کو فون کیا کہ وہ کوئٹہ پہنچیں۔ ڈاکٹروں نے ایک بار پھر باہم صلاح مشورہ کیا اور صورت حال کے منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد انہوں نے فیصلہ کیا کہ انہیں فوراً کراچی لے جانا ضروری ہے کیونکہ ان کے کمزور دل کے لئے کوئٹہ کی بلندی نامناسب ہے۔ انہوں نے بادل نخواستہ مجھے آگاہ کیا کہ اب امید کی کوئی کرن باقی نہیں ہے اور صرف کوئی معجزہ ہی قائدؒ کی

زندگی بچا سکتا ہے۔ جب میں نے اپنے بھائی کو ان کے ڈاکٹروں کے اس مشورے کے متعلق بتایا کہ کوئٹہ کی بلندی سے بچنے کے لئے انہیں کراچی لے جایا جائے تو انہوں نے کہا، "ہاں..... مجھے کراچی لے چلئے..... میں وہیں پیدا ہوا تھا..... میں وہیں..... دفن ہونا چاہتا ہوں''۔

''ہم نے انہیں ان سیٹوں پر آرام سے لٹا دیا جنہیں ایک عارضی بستر کی شکل میں کیبن کے سامنے کھول دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر مستری، سسٹر ڈنہام اور میں ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پائلٹ نے خبردار کیا کہ اسے کچھ وقت کیلئے سات ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کرنا پڑے گی مگر جونہی وہ بلوچستان کے پہاڑوں سے آگے نکل جائے گا تو طیارہ پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر پرواز کر سکے گا۔ آکسیجن سلنڈر اور گیس ماسک تیار رکھے گئے اور زیادہ بلندی پر قائدؒ کو آکسیجن دینے کا فرض میرے ذمے تھا۔ ہم فضا میں بلند ہو چکے تھے۔ وائی کنگ بلند سے بلند تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ قائدؒ کو سانس لینے میں دشواری محسوس ہونے لگی تھی۔ چنانچہ میں نے گیس ماسک ان کے منہ سے لگا دیا۔ وہ کچھ دیر تک آکسیجن لیتے رہے اور پھر ماسک منہ پر سے ہٹا دیا جیسے مجھ سے کہہ رہے ہوں،

''اس کی ضرورت نہیں، سب کچھ ختم ہو چکا ہے''۔(ایضاً:صفحات:112,111)۔

چودھری ظفر اللہ خاں، جنہیں قائداعظمؒ نے پاکستان کا وزیر خارجہ نامزد کیا تھا، مجھے ایک انٹرویو میں بتایا:''اگست 47ء میں ہی ان کی صحت کا یہ حال تھا اور انہیں یقیناً اس کا علم تھا کہ ان کی یہ بیماری انہیں موت تک لے جائے گی۔ چنانچہ ایک دفعہ میں نے مس جناحؒ کے ساتھ بات کی کہ ان کی صحت کے متعلق خیال رکھنا چاہئے، آپ ہی قریب رہتی ہیں، جو ڈاکٹر کہیں آپ اصرار سے اس پر عمل کرائیں۔ محترمہ نے کہا،''میری بھی نہیں مانتے''۔ میں نے خود بات کی تو فرمایا:''صحت کے اتار چڑھاؤ ہیں جو عارضی ہیں''۔ میرے خیال میں وہ اس سے بخوبی آگاہ تھے اور ہم سب جانتے تھے کہ یہ عارضی نہیں، کیونکہ ہر اتار چڑھاؤ کے بعد ان کی صحت اور گر جاتی تھی۔(''آتش فشاں''۔مئی 1981ء۔صفحہ 21)۔

سٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے لئے جب قائداعظمؒ کوئٹہ سے کراچی پہنچے اس وقت کے وزیر داخلہ و اطلاعات خواجہ شہاب الدین کہتے ہیں:''جب ہم ماڑی پور کے ہوائی اڈے پر ان کے استقبال کے لئے پہنچے تو بیماری کی وجہ سے ان کا چہرہ سفید ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دس کروڑ مسلمانوں کی کشتی کا یہ ناخدا صرف قوتِ ارادی کے بل پر چل رہا ہے''۔(آتش فشاں، دسمبر 1976ء۔ قائداعظم نمبر۔صفحہ 84، کالم 2)۔

کیپٹن این اے حسین 29 جون 1948ء سے 11 ستمبر 1948ء تک قائداعظمؒ کے اے ڈی سی

رہے۔ ان کا کہنا ہے: ''ان کی وفات کے بعد ان کے ذاتی معالج کرنل رحمٰن نے ایک روز مجھے کراچی میں بتایا کہ قائداعظمؒ نے دسمبر 1947ء میں لاہور جانا تھا، کہ وہ کھانسی اور زکام کے باعث بیمار پڑ گئے۔ ایکسرے لیا گیا تو ان کے پھیپھڑوں پر دھبے تھے، جو پورے سسٹم میں پھیل چکے تھے۔ میں نے ان سے عرض کی کہ آپ آرام فرمائیں۔ کسی سپیشلسٹ کو بلاتے ہیں۔ یہ سن کر انہوں نے ایکسپرے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا: ''میں نہیں چاہتا کہ سپیشلسٹ مجھ پر تجربے کریں''۔

(آتش فشاں۔ قائداعظمؒ نمبر۔ دسمبر 1976ء۔ صفحہ 320 کالم 1)۔

مادرملت محترمہ فاطمہ جناحؒ سٹیٹ بینک آف پاکستان کی افتتاحی تقریب کے ذکر میں لکھتی ہیں: ''تقریب میں موجود ہر شخص نے یقیناً محسوس کیا ہوگا کہ قائداعظمؒ کی صحت خراب ہو چکی ہے''۔

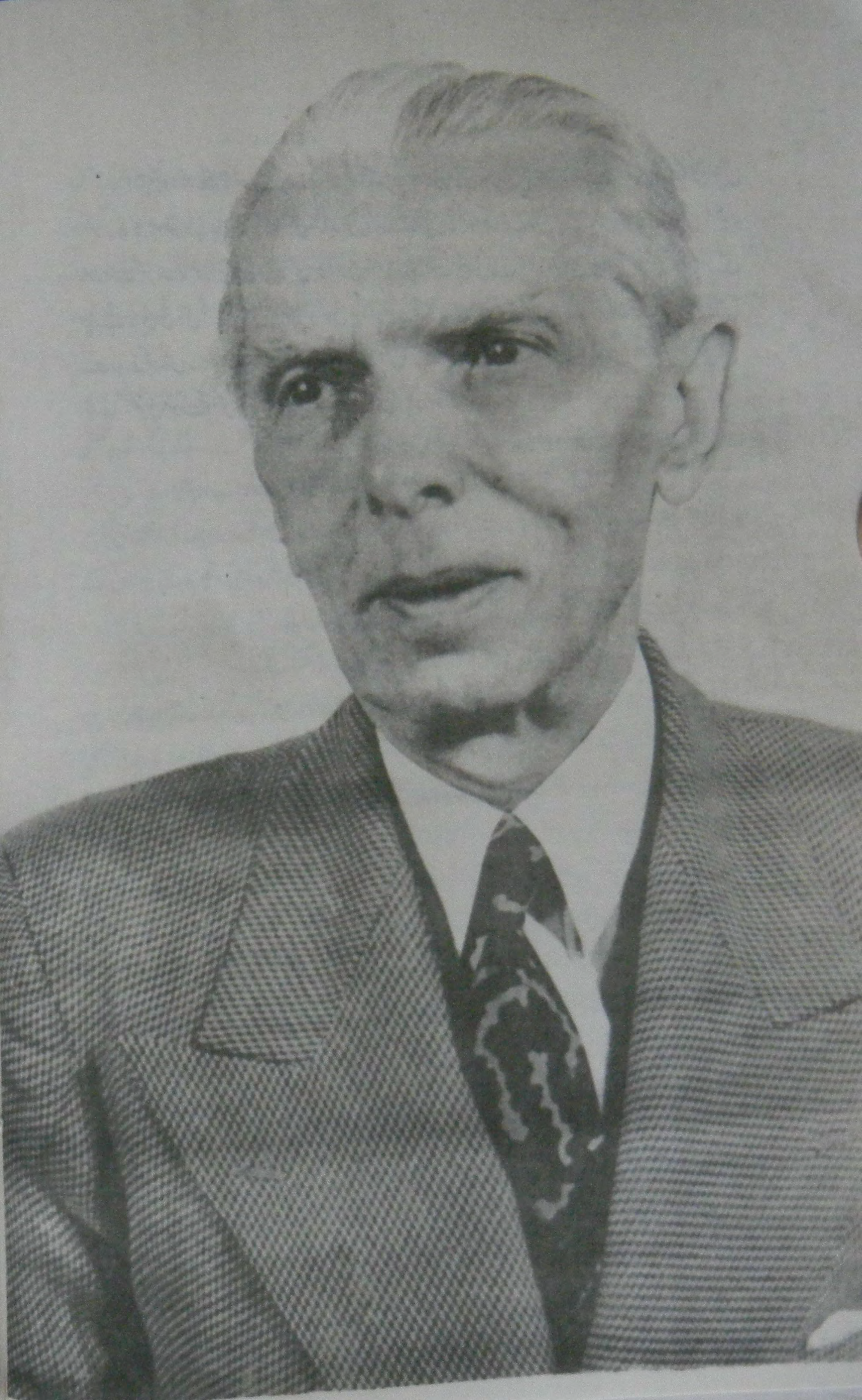
مجھے مرحوم خالد شمس الحسن نے اپنا یہ چشم دید واقعہ بتایا، جب قائداعظمؒ سٹیٹ بینک کی افتتاحی تقریر کر رہے تھے کہ عین اس دوران میں یوں لگا کہ وہ گر جائیں گے۔ لیاقت علی خانؒ وغیرہ کے چہروں کے رنگ اڑ گئے۔ لیکن قائداعظمؒ نے قوت ارادی سے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

ان حقائق کی روشنی میں قائداعظمؒ کی موت کو کیسے غیر طبعی کہا جا سکتا ہے۔

نذیر ناجی نے لکھا تھا: ''وہ کوئٹہ میں کن ذہنی صدمات اور عملی دشواریوں سے گزرے؟ اور پھر کراچی آ کر ڈرگ روڈ پر کیسے حالات میں اللہ کو پیارے ہوئے؟'' قائداعظمؒ اگر کوئٹہ میں ذہنی صدمات اور عملی دشواریوں میں سے گزر رہے ہوتے تو کیا خیال ہے مادرملتؒ اس کا نوٹس نہ لیتیں؟ ناجی صاحب نے ڈرگ روڈ کا ذکر کیا۔ تب ڈرگ روڈ والا نہیں بلکہ ماڑی پور ائرپورٹ تھا۔ بہر حال، ان کا موقف ہے کہ قائداعظمؒ ائرپورٹ سے گورنر جنرل ہاؤس تک جاتے ہوئے سڑک پر ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ یہ بھی غلط۔ ان کی ایمبولینس رک ضرور گئی تھی۔ وہاں ان کا انتقال نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ ایمبولینس کا رکنا ایک اتفاق تھا، سازش نہیں۔ اگر اسے ایک سازش فرض کر لیا جائے تو بھی اس سازش کے نتیجے میں قائداعظمؒ کی موت واقع نہیں ہوئی تھی۔ الطاف حسین کا بھی یہ موقف درست نہیں کہ ان کی ایمبولینس کئی گھنٹے وہاں کھڑی رہی۔ کیونکہ مادرملتؒ اس سے بھی اختلاف کرتی ہیں: ''ہم نے وہاں ایک گھنٹہ سے بھی زیادہ دیر تک انتظار کیا''۔ (''میرا بھائی''۔ صفحہ: 114)۔ جب ایمبولینس قائداعظمؒ کو لے کر گورنر جنرل ہاؤس پہنچ گئی تو اس کے بعد کا احوال بیان کرتے ہوئے مادرملتؒ رقم طراز ہیں: ''ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا اور کہا کہ ہوائی سفر اور ایمبولینس کی تکلیف دہ واقعہ کے باوجود ان کی صحت پر کوئی برے اثرات مرتب نہیں ہوئے''۔ (ایضاً)۔

ایم کیو ایم کے قائد نے کہا ہے کہ اگر انہیں پاکستان ٹیلی ویژن پر براہ راست (LIVE) حقائق پیش کرنے کا موقعہ دیا جائے تو وہ عینی شاہد پیش کر سکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ان کے پاس قائد اعظمؒ کی ہمشیرہ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ سے بھی بڑا کوئی عینی شاہد ہو۔ پی ٹی وی کو ضرور ان کی پیش کش قبول کر لینی چاہیے۔ پی ٹی وی آگے نہیں بڑھتا تو کوئی پرائیویٹ چینل ہی ایسا کر دکھائے۔ یا پھر الطاف حسین خود اس سے رابطہ کر لیں۔ بہر حال، یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ مادر ملتؒ نے اپنے کسی بیان، تحریر یا تقریر میں قائد اعظمؒ کی موت کو کبھی غیر طبعی یا سازش قرار نہیں دیا۔

(روزنامہ ایکسپریس لاہور۔ 16 تا 20 جنوری 2005ء)۔



مقامِ قائداعظمؒ
اور
ذوالفقار علی بھٹو

لاہور۔2 جنوری 2005ء۔''بے نظیر بھٹو۔بیٹی سے قائد تک''۔پیپلز پارٹی جاپان کے صدر سید غیور عباس بخاری کی اس تصنیف کی تقریب رونمائی کے موقعہ پر سینیٹر اور پاکستان پیپلز پارٹی کے مرکزی رہنما لطیف کھوسہ نے خطاب کرتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو کو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ سے بڑا لیڈر قرار دیا۔ان بنیادوں پر:۔

(1) قائداعظمؒ ملک کو ایک متفقہ آئین نہیں دے سکے۔انہوں نے پاکستان کو 1935ء کے ایکٹ کے تحت چلایا۔

(2) قائداعظمؒ کے پاس سیاسی قوت نہیں تھی،بھٹو کے پاس سیاسی قوت تھی۔

(3) قائداعظمؒ کبھی جیل نہیں گئے،بھٹو جیل گئے اور پھانسی چڑھ گئے۔قائداعظمؒ نے کبھی صعوبتیں اور مظالم برداشت نہیں کئے۔

(4) بھٹو صاحب نے جمعہ کی چھٹی کی۔

(5) ایٹمی پروگرام کی بنیاد رکھی۔

آخر میں لطیف کھوسہ فرماتے ہیں:''اس لئے میں پورے اعتماد اور وثوق سے کہتا ہوں کہ ذوالفقار علی بھٹو قائداعظمؒ سے بڑے لیڈر تھے''۔

ہم لطیف کھوسہ کے اس مؤقف کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں:۔

(1) ہندو کانگریس اور انگریز حکمران کسی صورت قیام پاکستان کے حق میں نہ تھے۔جب قائداعظمؒ کے سامنے ان کی کوئی پیش نہ گئی تو وہ اس امید پر تقسیم ہند پر راضی ہوئے کہ پاکستان چھ ماہ سے زیادہ قائم

نہیں رہ سکے گا۔ جلد ہی مسلمان دوبارہ ہندوستان کا حصہ بن جانے کی درخواست کریں گے۔ اپنی اس امید کی برآوری کے لئے سرحدوں میں ردّوبدل کر کے پاکستان کو کئی علاقوں سے محروم کر دیا گیا جو اس کا حصہ بنتے تھے۔ اس کے حصے کا 55 کروڑ روپیہ روک لیا گیا۔ پاکستان سے ہندوؤں سکھوں کو بھارت نقل مکانی پر آمادہ کیا گیا کیونکہ جو تھوڑی بہت انڈسٹری پاکستانی علاقوں میں تھی وہاں کے مالک اور کاریگر زیادہ تر ہندو تھے۔ مقصد پاکستان پر معاشی دباؤ بڑھانا تھا۔ اور اسی مقصد کے لئے فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دی گئی۔ نتیجتاً لاکھوں مسلمان بھارتی علاقوں سے پاکستان ہجرت پر مجبور ہوئے۔ یہ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی ہجرت تھی۔ ممالک غیر میں یہ تاثر عام تھا کہ مہاجرین کے دباؤ تلے ہی یہ ملک ختم ہو جائے گا۔ ایسا نہ ہوا۔ کیونکہ قائداعظمؒ اور ان کے رفقائے کار کی ساری توجہ ملک مستحکم کرنے پر رہی۔ ایسے میں آئین کا ثانوی حیثیت اختیار کر جانا فطری امر تھا۔ کیونکہ ضروری تھا پہلے وہ ملک بچایا جاتا جہاں آئین نافذ ہونا تھا۔ اس سلسلے میں جب میں نے قائداعظمؒ کے وزیرخارجہ چودھری محمد ظفراللہ خاں سے ایک انٹرویو میں پوچھا: ''یہ جو کہا جاتا ہے، اگر قائداعظمؒ کی زندگی میں پاکستان کا آئین بن جاتا تو بعد میں پیش آنے والے بہت سے مسائل پیدا نہ ہوتے''۔ اس بارے آپ کا کیا خیال ہے؟'' چودھری صاحب نے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر اس کا جواب یہ دیا: ''اس وقت پاکستان کو ہر طرف سے اس قدر مشکلات کا سامنا تھا کہ جو نسبتی اہمیت دوسرے امور کو دی جاتی ہے ان عملی مشکلات کے سامنے وہ اہمیت قائم نہیں رہی تھی۔ جس چیز کا دباؤ آکر پڑتا تھا، توجہ اس طرف ہو جاتی تھی۔ لازماً ہو جاتی تھی ورنہ ملک آگے چلتا ہی ناں۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ کانسٹی ٹیوشن (آئین) تو ایک تھیوریٹیکل (کتابی) لحاظ سے بڑی جلدی اور بڑی عمدہ بن جائے اور ملک قائم رہے یا نہ رہے۔ ملک کا قیام ضروری تھا۔ جس کے لئے آئین بننا تھا۔ ملک کے تعلق میں جو مشکلات پیش آجاتی تھیں ان کا حل کرنا بہرصورت سبقت رکھتا تھا۔ اس بات کی طرف کوئی غور نہیں کرتا کہ ایسے حالات میں پاکستان قائم ہوا کہ تمام دنیا سمجھتی تھی اور ہندوستان کو یقین تھا کہ یہ چند مہینے سے آگے نہیں چل سکے گا۔ پھر ہاتھ جوڑ کے واپس آجائیں گے کہ ہمیں شامل کرلو۔ ان حالات میں اس کا قائم رہنا، یہ بہت بڑی ہمت کا کام تھا''۔

(حوالہ۔ سیاسی اتار چڑھاؤ۔ صفحہ 92۔ جولائی 1989ء۔ آتش فشاں لاہور)

اگر آئین بنانے سے کسی ملک کا صدر یا وزیراعظم ملک کے بانی یا آزادی کے مسلمہ ہیرو سے بھی بڑا ہوسکتا ہے تو پھر بھارت میں پنڈت جواہر لال نہرو کا مرتبہ موہن چند کرم داس گاندھی سے بالا ہو جانا چاہئے تھا۔ بھٹو صاحب نے 73ء میں آئین بنایا۔ اس سے قبل ملک میں تین مرتبہ آئین بن اور بگڑ چکے

تھے۔ 54ء میں آئین کا نفاذ ہونے کو تھا کہ گورنر جنرل ملک غلام محمد نے وہ اسمبلی ہی توڑ دی۔ 56ء کا آئین بھٹو صاحب کے آئین سے 17 برس قبل منظور اور نافذ ہو چکا تھا۔ ہم جنرل ایوب خاں کے مارشل لائی 62ء کے آئین کا ذکر نہیں کرتے کہ یہ آمریت کی پیداوار تھا۔ لیکن 54ء اور 56ء کے آئین بنانے والوں کے متعلق کبھی کسی نے کہا، چونکہ لیاقت علی خانؒ، خواجہ ناظم الدین کے دور میں 54ء کے آئین پر اصل کام ہو چکا تھا اور 56ء کا آئین چودھری محمد علی کے دور میں بنا اور نافذ ہوا، اس لئے یہ تینوں حضرات بانی پاکستان اور فادر آف دی نیشن قائداعظم محمد علی جناحؒ سے بڑے تھے کہ قائداعظم کے دور میں آئین نہ بن سکا تھا۔

کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں نے 7 اور 8 اکتوبر 1958ء کی درمیانی شب ملک پر غاصبانہ قبضہ کیا۔ انہوں نے 56ء کا آئین منسوخ کر دیا۔ 56ء کا آئین ٹوٹا تو بھٹو صاحب مرکزی وزیر بنے۔ اس کے تیرہ برس بعد ملک ٹوٹا تو بھٹو صاحب باقی ماندہ پاکستان کے صدر اور وزیراعظم بن سکے۔ درست کہ انہوں نے لٹے پٹے پاکستان کا آئین دیا۔ یہ ان کا ایک کارنامہ ہے۔ لیکن یہ کارنامہ انہیں یا کسی کو بھی بانی پاکستان اور فادر آف دی نیشن سے بڑا ہرگز نہیں کرتا اور دنیا میں کہیں بھی اور کبھی ایسا نہیں ہوا۔ ہندوستان میں مغل سلطنت کا بانی شہنشاہ ظہیرالدین محمد بابر تھا۔ وہ اورنگ زیب عالمگیر سے بھی بڑا تھا۔ حالانکہ اورنگ زیب کی سلطنت کی وسعت بابر بلکہ تمام مغل بادشاہوں کے مقابلے میں وسیع ترین تھی اور ان کا عرصۂ حکمرانی بھی سب سے طویل ترین تھا۔ اس کے باوجود جو منزلت سلطنت مغلیہ کا بانی ہونے کے ناتے شہنشاہ بابر کی ہے اورنگ زیب کی نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتی۔ سلطنت موجود تھی تو اورنگ زیب نے اسے وسعت دی اور طویل ترین حکمرانی کی۔

درست کہ قائداعظمؒ نے 1935ء کے ایکٹ کے تحت ملک کو چلایا۔ اس میں ضروری ترامیم کی گئی تھیں۔ بھٹو صاحب نے 73ء کا آئین بننے سے قبل جو عبوری آئین بنایا وہ بھی 1935ء کے ایکٹ پر استوار تھا۔ کیا انہوں نے اپنے عبوری اور مستقل آئین کی پابندی اس طرح کی جس طرح قائداعظمؒ کیا کرتے تھے؟ قائداعظمؒ کے وزیر اطلاعات خواجہ شہاب الدین کے بقول: ''ایک موقعہ بھی ایسا نہ آیا کہ انہوں نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہو۔ وہ مکمل طور پر آئینی آدمی تھے۔ اور وزیراعظم کا بہت احترام کرتے تھے۔ (رسالہ ''آتش فشاں'' قائداعظمؒ نمبر۔ دسمبر 1976ء۔ صفحہ 85، کالم 2)۔

قائداعظمؒ کی آئین اور قانون پسندی پر ان کا دشمن بھی قائل رہا۔ اور بھٹو صاحب کی آئینی اور قانونی خلاف ورزیوں سے ان کے مداح اور پیروکار بھی لرزاں رہے۔

اس ایک واقعہ سے بھی دونوں کی شخصیت کا موازنہ بآسانی کیا جاسکتا ہے۔ جنرل گل حسن مرحوم قائداعظمؒ کے ابتدائی تینوں اے ڈی سیز میں سے ایک تھے۔ دنیا جانتی ہے کہ جن دنوں جنرل آغا محمد یحییٰ خاں ملک کے سیاہ وسپید کے مالک تھے بھٹو صاحب کی جنرل گل حسن کے ساتھ بھی گہری چھنتی تھی۔ یہ دونوں اکٹھا چین بھی گئے تھے۔ جنرل (ر) گل حسن نے مجھے ایک انٹرویو میں بتایا: ''ہم چین سے واپس آئے۔ اسلام آباد میں چینی سفیر نے کھانے پر بلایا تھا۔ بھٹو کی این سی باؤس آیا۔ یہاں سے ہم روانہ ہوئے کھانے پر۔ ابھی روانہ ہوئے تھے کہ بھٹو مجھے کہتا ہے: گل! قائداعظمؒ کی کوئی بات سناؤ۔ میں نے اسے یہ واقعہ سنایا۔

''شام کے وقت اکثر ہم ملیر جاتے۔ میں ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتا۔ اُس وقت اس قسم کی عیاشی کا تو تصور نہیں تھا کہ دس موٹر سائیکل آگے جارہے ہیں اور دس پیچھے ہیں۔ خیر، قائداعظمؒ اور محترمہ فاطمہ جناحؒ پچھلی سیٹ پہ ہوتے۔ شہر سے ملیر کی طرف جائیں تو راستے میں ریلوے پھاٹک آتا ہے۔ ایک روز پھاٹک بند تھا۔ ہماری گاڑی رک گئی۔ میں نیچے اترا اور پھاٹک والے سے کہا، ٹرین اگر دور ہے تو پھاٹک کھول دو۔ قائداعظمؒ صاحب بیٹھے ہیں۔ اس نے یہ کہہ کر کہ ٹرین تو ابھی دور ہے پھاٹک کھول دیا۔ میں آ کے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کا نام تھا عزیز۔ میں نے کہا، عزیز چلو۔ وہ کہتا ہے، حکم ملا ہے گاڑی نہیں چلے گی۔ ساتھ ہی قائداعظمؒ نے فرمایا: ''گل، اس آدمی سے کہو کہ پھاٹک بند کردے''۔ میں نیچے اترا اور اسے کہا کہ پھاٹک بند کردو۔ وہ کہتا ہے، صاحب گاڑی ابھی دور ہے۔ میں نے کہا، بند کردو، مصیبت پڑ جائے گی۔ اس نے پھاٹک بند کردیا۔ میں آ کے بیٹھ گیا۔ ٹرین گزری، پھاٹک کھلا، تب ہماری گاڑی آگے بڑھی۔

''تھوڑی دیر بعد قائداعظمؒ نے مجھے کہا: ''گل، آپ کو معلوم ہے میں نے یہ کیوں کہا تھا کہ پھاٹک بند کروادو''۔ میں نے کہا: ''سر، مجھے نہیں معلوم''۔ ارشاد ہوا: ''اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر میں اپنی ہی ہدایات اور احکامات پر عمل نہیں کرتا تو پھر میں دوسروں سے یہ توقع کیسے رکھوں گا کہ وہ میری ہدایات اور احکامات پر عمل کریں۔ جبکہ میں ملک کا سربراہ بھی ہوں''۔ میں نے عرض کیا: ''سر، مجھے اس کا افسوس ہے''۔

جنرل گل حسن کہتے ہیں: ''بھٹو کو یہ واقعہ سنا رہا تھا کہ منسٹری آف ڈیفنس کے چوک میں اشارہ بند تھا۔ میں نے گاڑی روک دی۔ وہیں یہ واقعہ بھی مکمل ہوگیا۔ بھٹو ڈرائیور سے کہتا ہے: ''چلو چلو، مجھے کوئی نہیں روک سکتا''۔ میں نے کہا: ''آپ پر تو کوئی اثر نہیں ہوا''۔

پھر بھی آپ کہتے ہیں، بھٹو قائداعظمؒ سے بڑے لیڈر تھے۔

(2) لطیف کھوسہ کا یہ مؤقف بھی کمزور بلکہ انتہائی کمزور ہے کہ ''قائداعظمؒ کے پاس سیاسی قوت

نہیں تھی، بھٹو کے پاس سیاسی قوت تھی"۔ کیا پاکستان بغیر کسی سیاسی قوت کے ہی وجود میں آ گیا تھا؟ قائداعظمؒ کی سیاسی قوت متحدہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں تھی۔ کوئی کونا کھدرا ایسا نہ تھا جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کا پرچم لہرا نہیں رہا تھا۔ اور قائداعظمؒ کی تصویر آویزاں یا چسپاں نہ تھی۔ برطانیہ متحدہ ہندوستان کی تقسیم بالکل نہیں چاہتا تھا، کیونکہ وہ ہندوستان کو ایک ملک کا مقام دینے کا کریڈٹ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف گاندھی کا کہنا تھا: "پاکستان یا تقسیم ہندوستان ایک گناہ ہے۔ اور میں اس گناہ کو کسی شکل میں برداشت نہ کرسکوں گا"۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو اس پر اٹل تھے: "دنیا کی کوئی طاقت یونائیٹڈ نیشنز کی آرگنائزیشن بھی مسٹر جناح کے اس مطالبہ کو پورا نہیں کرسکتی..... کانگریس کسی حالت میں بھی پاکستان قبول نہیں کرے گی"۔

اس کے باوجود اگر انگریز اور ہندو کانگریس پاکستان کا قیام ماننے پر مجبور ہوئی تو کیا یہ قائداعظمؒ کی بغیر کسی سیاسی قوت کے ہوگیا؟ قائداعظمؒ کی تو پورے متحدہ ہندوستان میں مانتا تھی۔ مقابلے میں بھٹو صاحب کا 70ء میں ابھار ہوتا ہے تو ان کی ہردلعزیزی صرف پنجاب اور سندھ تک محدود رہتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ان کا کوئی نام لیوا تھا؟ وہاں ان کی پارٹی آرگنائزیشن ہی نہ تھی۔ شروع میں نورالدین نامی ایک بنگالی مشرقی پاکستان پیپلز پارٹی کا چیئرمین تھا۔ مرکزی چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ اس کی مناقشت شروع ہوئی تو دونوں نے ایک دوسرے کو پیپلز پارٹی سے خارج کردیا۔ مشرقی پاکستان میں تو پاکستان پیپلز پارٹی کی آرگنائزیشن تھی نہ وہاں انہوں نے 70ء کے انتخابات میں کوئی امیدوار کھڑا کیا۔ مشرقی پاکستان سے قومی اسمبلی میں ان کا کوئی نمائندہ نہیں تھا۔ بلوچستان سے کوئی نہ تھا۔ سرحد سے ایک تھا۔ آ جا کے پنجاب اور سندھ سے انہیں 80 نشستیں ملیں۔ سرحد کی ایک شامل کر کے 81 ہوگئیں۔ سندھ میں بھی انہیں اکثریت نہیں ملی تھی۔ اور کراچی بھی ان کے پاس نہیں تھا۔ یہ تھی اس ذوالفقار علی بھٹو کی سیاسی قوت جس کی بناپر لطیف کھوسہ جوش خطابت اور جہالت کے آمیزے سے پورے اعتماد اور وثوق سے انہیں قائداعظمؒ سے بھی بڑا لیڈر قرار دیتے ہیں۔

70ء میں متحدہ پاکستان میں سیاسی قوت تو شیخ مجیب الرحمٰن کے پاس تھی۔ اگر بھٹو صاحب کے پاس قوت ہوتی تو وہ 28 فروری 1971ء کو مینار پاکستان کے سائے تلے یہ اعلان نہ کرتے، جو 3 مارچ کو ڈھاکہ میں ہونے والے قومی اسمبلی اجلاس میں شرکت کے لئے جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔ وہیں بھٹو صاحب نے کہا، یہ مینار پاکستان ہے میں اسے یادگار پاکستان نہیں بننے دوں گا۔ حالانکہ ٹانگیں توڑنے کی دھمکی مینار پاکستان کو یادگار پاکستان بنانے کا ابتدائیہ تھی۔ ایک ملک کے لئے دو پارلیمنٹوں، دو

آئینوں کی باتیں کرنا اور یہ کہنا کہ میں اپوزیشن لیڈر بننے کے مقابلے میں لاڑکانہ میونسپل کمیٹی کا چیئرمین بننا پسند کروں گا۔ اور یہ بھی کہ میں کوئی بندرانائیکے جو اپوزیشن میں بیٹھا رہوں۔ سیاسی قوت والے ایسا نہیں کہا کرتے۔ شیخ مجیب کو ہم لاکھ برا کہیں۔ کیا اس نے دو آئینوں یا دو پارلیمنٹوں کی بات کی؟ وہ اقتدار مانگتا تھا۔ اور پورے پاکستان کا۔ یہ اس کا آئینی حق تھا۔

ادھر شیخ مجیب کو مغربی پاکستان سے قوت فراہم کرنے کے لئے بھٹو مخالف سیاسی جماعتوں کے ارکان اسمبلی پر مشتمل یونائیٹڈ کولیشن پارٹی (یوسی پی) وجود میں آئی۔ مشرقی پاکستان کے مسٹر نورالامین اس کے سربراہ تھے۔ بھٹو صاحب پر اس اتحاد کا خوف اس قدر طاری ہوگیا کہ اس کا مذاق اڑاتے اور انتہائی نفرتی انداز میں جناب نورالامین کو بڈھا کھوسٹ کہتے۔ اور جب ایک دفعہ وہ کراچی جارہے تھے، اتفاق سے اسی ٹرین میں کونسل مسلم لیگ کے سربراہ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ بھی تھے۔ ظاہر ہے مختلف ریلوے سٹیشنوں پر بھٹو صاحب کا استقبال کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ بھٹو صاحب نے میاں دولتانہ کو چوہا کہہ کر سارا راستہ ان کا ناک میں دم کئے رکھا۔ جس کے پاس سیاسی قوت ہو وہ ایسی خوفزدگی کا اظہار نہیں کیا کرتا۔ قائداعظمؒ کے ہاں ایسا اوچھا رویہ نہیں ملے گا۔ وہ کبھی مخالف سے خوفزدہ نہیں ہوئے۔ اوروں کا ذکر ہی کیا، وہ برطانیہ اور ہندو کانگریس کی قوت سے نہیں گھبرائے۔ خم ٹھونک کر دونوں کا مقابلہ کیا۔ سیاسی قوت کے باعث کامیاب رہے۔ ان کے اٹل بیری جی ایم سید آخری عمر میں بھی کھل کر اعتراف کرتے رہے کہ وہ بختِ سکندری لے کر پیدا ہوئے تھے۔ قائداعظمؒ کا اپنے متعلق یہ کہنا تھا کہ میں ناکامی کے لفظ سے ناآشنا ہوں۔ کیا بھرپور سیاسی قوت کے بغیر اس قسم کی خود اعتمادی آسکتی ہے؟ جبکہ کمزور سیاسی قوت کے سبب انسان یوسی پی جیسے چھوٹے سے اتحاد سے بھی گھبرا جاتا۔ سیاسی قوت کے بل پر ہی انہوں نے ووٹوں کے ذریعے دنیا کی سب سے بڑی مسلمان مملکت کو وجود بخشا جو مشرقی اور مغربی پاکستان، دو بازوؤں پر مشتمل تھی۔

اگر ملک نہ ٹوٹتا تو کیا بھٹو صاحب برسراقتدار آسکتے تھے؟ ایسی ہی کمزور اور ادھوری سیاسی قوت پر لطیف کھوسہ بڑے اعتماد اور وثوق سے انہیں قائداعظمؒ سے بڑا لیڈر قرار دیتے ہیں۔

(3) بانیٔ پاکستان، بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ سے بھٹو صاحب کو بڑا لیڈر ثابت کرنے کے لئے لطیف کھوسہ نے تیسرا نکتہ یہ اٹھایا ہے کہ "قائداعظمؒ کبھی جیل نہیں گئے۔ بھٹو صاحب جیل گئے اور پھانسی پر چڑھ گئے۔ قائداعظمؒ نے کبھی صعوبتیں اور مظالم برداشت نہیں کئے"۔ سیاست کی کونسی کتاب میں لکھا ہے کہ سیاسی لیڈر کا جیل میں جانا ضروری ہے۔ سیاستدان جیل کب جاتا ہے؟ اولاً: جب وہ قانون توڑے۔ ثانیاً: مسائل سے فرار حاصل کرنے کے لئے وہ ایسا رویہ اختیار کرے کہ اسے جیل میں ڈال دیا

جائے۔ ثالثاً: حکمرانوں کی انتقامی کارروائی کے تحت۔ بھٹو صاحب کو جنرل ایوب خاں اور جنرل ضیاء الحق کی انتقامی سیاست کے تحت جیل بھیجا گیا۔ اور پھانسی بھی انہیں اس لئے دی گئی کہ قبر ایک تھی امیدوار دو تھے۔ انہیں یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ وہ جیل کی کال کوٹھری میں گھبرائے نہیں۔ معافی نہیں مانگی۔ مقتل کو جانے والی شان کو سلامت رکھا۔ انہیں غلط پھانسی دی گئی۔ فیصلہ پہلے کرلیا گیا۔ مقدمہ بعد میں چلایا گیا۔ انہوں نے ثابت قدم رہ کر اپنے آپ کو تاریخ میں امر کردیا۔ لیکن ان کا ان صعوبتوں میں سے گزرنا اور مظالم کا مردانہ وار مقابلہ کرنا انہیں قائداعظمؒ کا ایک پیروکار تو ثابت کرتا ہے ان سے بڑا نہیں۔ اور اس پیروکاری پر وہ عمر بھر نازاں رہے۔ پھر قائداعظمؒ جب اس مرحلے سے گزرے ہی نہیں تو موازنہ کیسا؟

قائداعظمؒ آئین اور قانون کے پابند تھے اس لئے جیل نہیں گئے۔ دوسرے، وہ مسائل کا سامنا کرتے تھے، ان سے فرار ہو کر جیل جانے کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ ان کی حیات مبارکہ ایسی منافقت سے قطعی پاک تھی۔ اور انتقامی کارروئی کے تحت انگریز انہیں جیل بھیجنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ پھر بھی ایک ایسا مرحلہ آیا جب ان کی گرفتاری کا خطرہ پیدا ہوا، جس کا اظہار انہوں نے 9 اگست 47ء کو سندھ کلب میں اپنے اعزاز میں دیئے گئے ایک استقبالیہ میں اس طرح کیا: ''مس فاطمہ جناح میرے لئے مسلسل امداد اور حوصلہ افزائی کا ذریعہ رہی ہیں۔ ان دنوں میں جبکہ مجھے اندیشہ تھا کہ برطانوی حکومت مجھے گرفتار کرلے گی، یہ میری بہن ہی تھی جس نے مجھے حوصلہ دیا اور بہت سی امید افزا باتیں کہیں جبکہ انقلاب آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مجھے گھور رہا تھا۔ انہوں نے میری صحت کا مستقل خیال رکھا''۔

دسمبر 1975ء میں کے ایل گابا بمبئی سے لاہور آئے۔ میں نے موقعہ غنیمت جان کر ان سے ملاقات کی۔ انہوں نے مجھے 22 دسمبر کا وقت دیا۔ مجھے لنگوٹیئے یار خواجہ نذیر احمد کی سیالکوٹ میں شادی مس کرنا پڑی۔ میں ان سے قائداعظمؒ کی باتیں سننا چاہتا تھا۔ 1909ء میں قائداعظمؒ کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لئے لاہور آئے تو ان کے والد کشن لال گابا کے مہمان ہوئے۔ میں نے کے ایل (خالد لطیف) گابا سے پوچھا، ''آپ نے اپنی مرتبہ کتاب ''فیمس اینڈ ہسٹارک ٹرائلز'' کے پیش لفظ میں قائداعظمؒ کے متعلق لکھا تھا کہ اگر حصول پاکستان کی جنگ نے انہیں قانون ہاتھ میں لینے پر مجبور کردیا تو پھر ان پر جو مقدمہ بنے گا اس کے سامنے گاندھی اور سریندر ناتھ بینر جی وغیرہ کے مقدمات کی دلچسپی ماند پڑ جائے گی''۔ کے ایل گابا نے اس کا یہ جواب دیا: ''اس لئے کہ ان کی خصوصیت تھی کہ حکومت کو تنقید کا نشانہ بناتے، لیکن قانون نہ توڑتے۔ اس لئے ان کے خلاف کوئی مقدمہ نہ ہو سکا۔ اگر ان کے خلاف بھی کیس ہوتا تو اس کا ہسٹری میں مقام ہوتا''۔

یہ تھی قائداعظمؒ کی قانون پسندی۔

قائداعظمؒ کے ہاں سیاسی انتقام کا گزر نہیں تھا۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر تھے، خان لیاقت علی خانؒ سیکرٹری جنرل تھے۔ 26 دسمبر 1943ء۔ مسلم لیگ کے 31 ویں سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے لیاقت علی خانؒ کی خدمات کو یوں خراج تحسین پیش کیا، ''نواب زادہ لیاقت علی خانؒ میرے دست راست ہیں۔ انہوں نے دن رات مشقت اور خدمت کی ہے۔ کسی کے تصور میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ انہوں نے ذمہ داریوں کا کس قدر غیر معمولی بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ نوابزادہ لیاقت علی خانؒ کو مسلمانوں کا ہمہ گیر احترام اور اعتماد حاصل ہے۔ اگرچہ وہ نواب زادہ ہیں لیکن مکمل طور پر عوامی (PROLETARIAN) ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ملک کے دیگر نواب بھی ان کے نقش قدم پر چلیں گے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے گزشتہ سات برسوں میں جو خدمات انجام دی ہیں میری آرزو ہے کہ وہ عمر بھی اسی طرح مسلمانوں کے لئے خدمت انجام دیتے رہیں''۔

بھٹو صاحب پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین تھے، جے اے رحیم سیکرٹری جنرل۔ وزیراعظم بھٹو کی طرف سے ایک کھانے پر وہ بھی مدعو تھے۔ چونکہ پابندی وقت کا لحاظ نہیں رکھا جا رہا تھا، وہ اٹھ کے چلے گئے۔ بھٹو صاحب کو پتہ چلا تو انہیں اتنا برا محسوس ہوا کہ اسی رات ایک ڈیڑھ بجے ان کے سیکورٹی چیف سعید احمد خاں کچھ بندے ساتھ لے کے جے اے رحیم کے گھر پہنچے۔ انہیں جگایا۔ اور فزیکلی مارا۔ اسی پر بس نہ کیا، بعد ازاں ان کے خوبصورت اور جوان بیٹے کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ لکھنے والی بات نہیں۔

پھر بھی لطیف کھوسہ پورے اعتماد اور وثوق سے کہتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو، قائداعظمؒ سے بڑے لیڈر تھے۔

قائداعظمؒ تو اتنے بڑے لیڈر تھے کہ بے قابو مجمع کی طرف انگشت شہادت اٹھا کر صرف اتنا ارشاد فرماتے: ''ڈسپلن''۔ لاکھوں کا بے ہنگم اجتماع ایسے ہو جاتا کہ اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ جبکہ بھٹو صاحب کو بے قابو ہجوم کو چپ کرانے کے لئے بھرے جلسے میں گملا مارنا پڑتا تھا۔

(4) ''بھٹو صاحب نے جمعہ کی چھٹی کی''۔ یہ کونسا کارنامہ ہے کہ اس پر انہیں قائداعظمؒ سے بھی بڑا ثابت کیا جائے۔ یہ بنیادی طور پر انتظامی معاملہ ہے کہ ہفتہ وار چھٹی جمعہ کے روز ہونی چاہئے یا اتوار کے روز، لیکن بھٹو صاحب کا یہ فیصلہ انتظامی سے زیادہ سیاسی تھا۔ جب آرمی چیف جنرل محمد ضیاء الحق کی طرف سے برپا کی گئی ان کے خلاف پاکستان قومی اتحاد کی موومنٹ بظاہر شدت پکڑ گئی تو اس کا زور توڑنے کا یہ ایک حربہ تھا۔ لیکن بات بنی نہیں۔ کیونکہ ان کا تختہ الٹنے کا فیصلہ آرمی چیف کر چکا تھا۔ جمعہ کی چھٹی انہیں

سہارا دے سکتی تھی نہ شراب اور جوئے کی بندش۔ ویسے بھی اسلام کا جمعہ کی چھٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ قرآن کریم میں ہے کہ نماز جمعہ کے وقت اپنے کاروبار بند کر دیا کرو۔ جب نماز پڑھ لو تو اللہ کا فضل تلاش کرنے کے لئے زمین میں پھیل جاؤ۔

(5) قائداعظمؒ سے انہیں بڑا ثابت کرنے کے لئے انہوں نے آخری دلیل یہ دی ہے، بھٹو صاحب نے ''ایٹمی پروگرام کی بنیاد رکھی''۔ دنیا میں سب سے پہلا ایٹم بم امریکہ نے بنایا اور چلایا تھا۔ اس پروگرام کی بنیاد امریکی صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ (45-1933ء) کے دور میں رکھی گئی۔ کیا اس سے روز ویلٹ کا مرتبہ امریکیوں کے بابائے قوم جارج واشنگٹن سے بلند ہوگیا؟ ہنری ٹرومین (53-1945ء) کے دور میں 49ء سے 52ء کے درمیان ایڈورڈ ٹیلر نے ہائیڈروجن بم تیار کیا۔ امریکہ میں کسی نے یہ دعویٰ کیا کہ ٹرومین جارج واشنگٹن سے بڑا لیڈر ہے؟

ایک شخص بڑے مشکل اور کٹھن حالات میں ناممکن کو ممکن کر کے ایک عمارت کھڑی کرتا ہے۔ آنے والے اس کی تزئین و آرائش اور زیبائش میں اضافہ کرتے ہیں۔ اسے خوب سے خوب تر بنانے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس میں اضافہ بھی کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ عمارت کا بانی اپنا مقام کھو چکا۔ اور بعد میں آنے والے اس سے عالی مرتبت ہوگئے۔ بلڈنگ تھی تو انہوں نے اس کی تزئین و آرائش اور زیبائش کی۔ بلڈنگ نہ ہوتی تو آنے والوں کا کوئی پرسان حال ہی نہ ہوتا۔ یہی حقیقت آزادی کے ہیرو کو فادر آف دی نیشن کا درجہ دیتی ہے، جو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ایسا ہوسکتا تو آج بھارت کا گاندھی، ترکی کا کمال اتاترک، امریکہ کا جارج واشنگٹن، سعودی عرب کا سلطان عبدالعزیز بن سعود، چین کا ماؤزے تنگ اپنی اپنی قوم کے بابائے قوم نہ ہوتے۔ کیونکہ بعد میں آنے والوں نے ان ملکوں کو ترقی ہی دی۔ ہماری طرح نہیں کہ ملک آدھا رہ جانے کے باوجود فخریہ انداز میں کہا جائے: ''میں پورے اعتماد اور وثوق سے کہتا ہوں کہ ذوالفقار علی بھٹو قائداعظمؒ سے بڑے لیڈر تھے''۔

بھٹو صاحب نے پاکستان کے رقبے میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ امریکہ میں کئی صدور کے ادوار میں اس کا رقبہ بڑھا۔ پھر بھی کسی نے بابائے قوم جارج واشنگٹن کی منزلت میں کمی نہیں آنے دی، بلکہ اس کے بتائے ہوئے اصولوں کو مشعل راہ سمجھتے رہے اور آج بھی یہی حالت ہے۔

1776ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ڈیکلریشن آف انڈی پنڈنس وجود میں آتا ہے۔ ابتداً امریکہ صرف تیرہ ریاستوں پر مشتمل تھا۔ نقشہ دیکھیں، چھوٹا سا امریکہ نظر آئے گا۔ اب اس کی 50 ریاستیں ہیں۔ صدر اینڈریو جانسن کے دور میں، 1867ء، میں امریکہ نے روس سے الاسکا کا علاقہ

7.2 ملین ڈالر میں خریدا۔ رقبہ تقریباً چھ لاکھ مربع میل۔ ایک ایکڑ دو سینٹ میں پڑا۔ کہا گیا بہت مہنگا خریدا ہے۔ حماقت ہے۔ لیکن بعد میں یہاں سے تیل اور گیس کے وسیع ذخائر دریافت ہوئے اور لامتناہی معدنیات۔ سونا تک پایا جاتا ہے۔ 1959ء میں آئزن ہاور کے زمانے میں اسے ریاست قرار دیا گیا۔ اس ریاست میں اتنی آمدنی ہے کہ وہاں انکم ٹیکس کی ضرورت نہیں۔ امریکہ کی ساحلی ریاستوں کے مجموعی ساحلی علاقے سے الاسکا کا ساحلی علاقہ بڑا ہے۔ رقبے کے اعتبار سے پچاس کی پچاس امریکی ریاستوں میں یہ سب سے بڑی ریاست ہے۔ اور امیر ترین۔ پھر تو اینڈریو جانسن کو ان کے بابائے قوم جارج واشنگٹن سے بڑا آدمی ڈیکلیر کرنا چاہئے تھا۔ لیکن نہیں۔

مئی 1803ء میں انگریزوں نے فرانس کے نپولین بونا پارٹ کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ نپولین کو پیسہ درکار تھا۔ اس نے اسی سال یعنی 1803ء میں فرانسیسی کالونی لوزیانہ امریکہ کو 15 ملین ڈالر میں بیچ دی۔ تھامس جیفرسن کا زمانۂ صدارت تھا۔ لوزیانہ کا رقبہ 8 لاکھ 28 ہزار مربع میل تھا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پہلے سے موجود ریاستوں کے مقابلے میں اکیلے لوزیانہ کا رقبہ دوگنا تھا۔ کسی نے کہا، تھامس جیفرسن بابائے قوم جارج واشنگٹن سے بڑا ہے؟

جیمز ناکس پولک کے زمانۂ صدارت میں 1848ء میں میکسیکو اور امریکہ کے درمیان جنگ کے نتیجے میں امریکہ نیو میکسیکو پر قابض ہو گیا۔ 1912ء میں یہ ٹیرٹری ریاست قرار پائی۔ نیو میکسیکو میں ہی امریکہ نے ایٹم بم کا پہلا تجربہ کیا تھا۔ یہ علاقہ فتح کرنے پر بھی جیمز ناکس پولک کو جارج واشنگٹن سے عظیم لیڈر نہیں کہا گیا۔ جبکہ ہمارے ہاں کے لطیف کھوسے آدھے ملک کے وزیراعظم کو پورے اعتماد اور وثوق سے قائداعظمؒ سے بھی بڑا لیڈر قرار دیتے ہیں۔

جو اس وقت امریکہ ہے 1776ء میں رقبے میں اس کا 1/10 بھی نہیں تھا۔ امریکہ کا رقبہ اور مقام کہاں سے کہاں پہنچا۔ کسی نے دعویٰ کیا کہ یہ رقبہ بڑھانے والے یا سوویت یونین کو ختم کر کے دنیا کی واحد سپر پاور بنانے والے صدور کا مرتبہ امریکی بابائے قوم جارج واشنگٹن سے بالا و بلند ہے۔ ایک وقت تھا کہ برطانوی حکمران امریکہ جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور آج برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کو اس کی قوم طعنہ دیتی ہے کہ تم امریکی صدر جارج بش کے پالتو ہو۔

بھٹو صاحب نے پاکستان کے رقبے میں کوئی اضافہ نہیں کیا تھا۔ ہمارے ایک وزیراعظم گزرے ہیں ملک فیروز حیات خاں نون۔ ان کے تدبر اور جرأت نے بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو مات دے کر پاکستان کے مغرب میں انتہائی اہم علاقہ گوادر خرید لیا۔ متحدہ پاکستان کے رقبے میں اضافہ کیا۔ اور

آج گوادر کی جو حیثیت اور مقام ہے اور پاکستان کے روشن مستقبل کی جو وہ نوید دے رہا ہے اس پر کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے بڑے کام کے باوجود ملک فیروز خاں نون کا مقام ایک اچھے اور جمہوری سیاستدان کا ضرور رہا۔ یہ نہیں کہ وہ قائداعظمؒ سے بڑے ہو گئے۔ اسی طرح بھٹو صاحب کی بھی کوئی خوبی انہیں قائداعظمؒ سے بلند نہیں کرتی۔

بھٹو صاحب تو خود قائداعظمؒ کا ایک پیروکار بننے پر فخر کرتے رہے۔ 26 اپریل 1945ء کو مسوری سے انہوں نے جو خط قائداعظمؒ کو لکھا، اس کا آغاز ہی اس جملے سے کرتے ہیں: ''صوبہ سرحد میں رونما ہونے والی سیاسی صورت حال نے مجھے اس قدر برافروختہ کر ڈالا ہے کہ میں اپنے لیڈر کو خط لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں''۔ آگے چل کر لکھتے ہیں: '' ہم مسلمانوں کو احساس ہونا چاہئے کہ آپ ان کے لیڈر ہیں..... آپ کے روپ میں ہمیں ایک قابل اور موزوں لیڈر میسر ہے..... اور ہمیں آپ پر فخر ہے... ''۔

جب قائداعظمؒ کا انتقال ہوا حسن اصفہانی امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔ بھٹو صاحب ان دنوں امریکہ میں زیر تعلیم تھے۔ قائداعظمؒ کی وفات پر 11 ستمبر 1948ء کو انہوں نے لاس اینجلس سے حسن اصفہانی کو جو خط لکھا، وہ اصفہانی مرحوم نے ''قائداعظمؒ جناح-- جیسا میں انہیں جانتا ہوں'' کے صفحہ 408 پر شائع کیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو اس میں لکھتے ہیں:-

''میں اس خط کو اپنے رنج و غم کے مخلصانہ اور نا قابل بیان اظہار سے شروع کرتا ہوں۔ ہماری زندگی کے اس نازک مرحلے میں قسمت کے ناپاک ہاتھ نے ہم پر سخت ظلم کیا ہے۔ لیکن ہمیں مشیت ایزدی میں چون و چرا کرنے کا کیا حق ہے۔

''یہ بڑی بد قسمتی کی بات ہے کہ ہم اس فیصلہ کن لمحے میں یتیم ہو گئے ہیں جبکہ کسی اور قوت سے بڑھ کر ہمیں اپنے محبوب قائداعظمؒ کے بے پناہ لطف و کرم کی ضرورت تھی۔ ہماری بقا کا انحصار زندگی کے انقلابات کے مقابلے کے لئے لامحدود عزم و ہمت فراہم کرنے پر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ہمت افزا تربیت کی بدولت جسے ہمارے قائد نے ہماری رگوں میں پیوست کر دیا ہے ہم ان سب رکاوٹوں کا سامنا کر سکتے ہیں جو ہمیں درپیش ہیں۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے اور ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ اگرچہ قائداعظمؒ اب ہمارے پاس موجود نہیں ہیں تاہم ان کی پاکیزہ اور معصوم روح ہمارے دل و دماغ میں ہمیشہ تر و تازہ رہے گی۔

''خدا ان کی مقدس روح پر اپنا رحم و کرم کرے۔ اس قدر طویل اور تھکا دینے والے کام کے بعد آخر کار انہیں آرام و سکون حاصل ہو گیا ہے۔ ان کی ساری زندگی اپنی قوم کی فلاح و بہبود اور آزادی کے لئے ایک جدوجہد تھی۔

''جناب، جو ذمہ داری آپ پر اور پاکستان کے دوسرے رہنماؤں پر عائد ہوتی ہے، وہ اب اور بڑھ گئی ہے اور ہم سب کو یقین ہے کہ آپ اپنے فرض کو عزت اور کامیابی کے ساتھ انجام دیں گے۔ آمین''۔

بھٹو صاحب نے بطور وزیر اعظم پاکستان سال 1976ء قائداعظمؒ کی صد سالہ سالگرہ کے طور پر جس شان سے منایا، وہ ان کی قائداعظمؒ کے ساتھ عقیدت اور اعتراف عظمت کا مظہر ہے۔ اس موقعہ پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا: '' خواہ ہم کتنے ہی شاندار الفاظ میں بابائے قومؒ کو خراج عقیدت پیش کریں، ہمارے لئے اس عظیم قائدؒ کے کارناموں اور جدوجہد کو مکمل طور پر دائرۂ تحریر و تقریر میں لانا ممکن نہیں۔ آزادی کے ہیرو، عوام کی خود مختاری و آزادی کے علمبردار، سماجی انصاف اور مساوات کے حامی مسلمانوں کے نجات دہندہ اور پاکستان کے بانی کی حیثیت سے ان کی قومی خدمات پر روشنی ڈالنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے قائداعظمؒ کو جو خوبیاں بخشی تھیں ان کو بیان کرنے سے ہماری زبان قاصر ہے۔ تاریخ میں قائداعظمؒ کی مثال نہیں ملتی''۔

اور یہاں ایک جاہل اٹھتا ہے، سوچتا ہے نہ سمجھتا ہے اور کہہ ڈالتا ہے: ''میں پورے اعتماد اور وثوق سے کہتا ہوں کہ ذوالفقار علی بھٹو قائداعظمؒ سے بڑے لیڈر تھے''۔ جبکہ ذوالفقار علی بھٹو خود پورے وثوق اور اعتماد سے قائداعظمؒ کو اپنا لیڈر قرار دیتے ہیں۔ اس سے بھٹو صاحب کی شان اور قد کاٹھ بڑھتا ہے، گھٹتا نہیں۔ گھٹانے کے لئے لطیف کھوسہ جیسے بھٹو صاحب کے نادان پیروکار جو موجود ہیں۔ تاہم جہانگیر بدر نے لطیف کھوسہ کا وہیں نوٹس لیتے ہوئے کہا: ''قائداعظم محمد علی جناحؒ کا ذوالفقار علی بھٹو سے خدمات کے حوالے سے مقابلہ اور موازنہ کرنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ قائداعظم محمد علی جناحؒ ذوالفقار علی بھٹو سے بڑے لیڈر تھے۔ کیونکہ وہ بانئ پاکستان ہیں۔ لیکن میں ایک بات ضرور کروں گا کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو بڑے لیڈر تھے''۔

اس تقریب میں سابق وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی بھی موجود تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ مجھے کہا تھا: ''پاکستان کی تاریخ میں میرا لیڈر کوئی نہیں۔ میں کسی کو لیڈر مانتا ہی نہیں۔ قائداعظمؒ کے سوا میں کسی کو لیڈر تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اونلی ون لیڈر، اور وہ قائداعظمؒ تھے۔ کیا کیریکٹر تھا۔ وہ ایک جائنٹ تھا جائنٹ۔ ان کے بعد بونے پیدا ہوئے بونے۔ بالکل بونے۔ قائداعظمؒ واز اے گریٹ مین''۔ ان کے یہ جذبات میں نے ان کے انٹرویو کے ساتھ ہفت روزہ ندائے ملت لاہور (20 تا 26 اگست 1998ء) میں شائع کئے تھے۔ اس کے باوجود اخباری اطلاع کے مطابق لطیف کھوسہ کو انہوں نے ٹوکا نہیں۔ سردار صاحب ٹوکیں نہ ٹوکیں، یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ قائداعظمؒ لیڈر تھے اور ذوالفقار علی بھٹو دوسرے وزرائے اعظم



لندن - 12 نومبر 1930ء - گول میز کانفرنس کے موقعہ پر - سر شاہنواز بھٹو، قائداعظم اور دیگر مسلم مندوبین

اور عام شہریوں کی طرح قائداعظمؒ کے پیروکار، سپاہی اور رعیت۔ بھٹو صاحب خود ہی نہیں ان کے باپ دادا بھی قائداعظمؒ کے عقیدت مند تھے۔ باپ دادا میں نے محاورۃً نہیں کہا، بلکہ یہ حقیقت ہے۔ قیام پاکستان کے موقعہ پر ذوالفقار علی بھٹو کے والد سر شاہنواز بھٹو ریاست جونا گڑھ کے وزیر اعظم تھے۔

سر شاہنواز بھٹو کے ریاست جونا گڑھ کے دیوان یعنی وزیر اعظم بننے کے سلسلے میں وی پی مینن اپنی تصنیف ''انٹیگریشن آف دی انڈین سٹیٹس'' میں لکھتا ہے: ''شروع 1947ء میں دیوان عبدالقادر محمد حسین نے کراچی کے ایک مسلم لیگی سیاستدان سر شاہنواز بھٹو کو جونا گڑھ کی ریاستی کابینہ میں شامل ہونے کی دعوت دی۔ مئی 1947ء میں عبدالقادر علاج کے لئے بیرونِ ملک چلے گئے۔ سر شاہنواز نے دیوان کا عہدہ سنبھالا..... جام صاحب نوانگر اور مہاراجہ دھرن گدھرا دونوں نے مجھے متنبہ کیا کہ سر شاہنواز کے دیوان بننے پر جونا گڑھ کی پاکستان میں شمولیت کا امکان بڑھ گیا ہے۔ (صفحات: 126,125)۔

ایسا ہی ہوا۔ جونا گڑھ کے نواب مہابت خانجی پر سردار پٹیل کے دباؤ کے باوجود سر شاہنواز بھٹو نے نواب کو ریاست کا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے پر قائل کر لیا۔ اس سلسلے میں سر شاہنواز بھٹو کو قائداعظمؒ کا اعتماد حاصل رہا۔ دونوں کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی رہی۔

اسی طرح سر شاہنواز بھٹو کے چچا سردار نبی بخش بھٹوؒ ہمیشہ قائداعظمؒ کے ایک جاں نثار سپاہی رہے۔ 1935ء میں سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اسمبلی کے اندر قائداعظمؒ کی انڈی پنڈنٹ پارٹی جائن کی۔ 1938ء میں قائداعظمؒ لاڑکانہ آئے تو سردار نبی بخش بھٹوؒ نے ان کی مہمان نوازی کا اعزاز حاصل کیا۔ 46ء کے انتخابات پاکستان کی بنیاد پر ہو رہے تھے۔ سندھ مسلم لیگ کے پارلیمانی بورڈ نے سردار نبی بخش بھٹوؒ کو ٹکٹ نہ دیا۔ لیکن انہوں نے مسلم لیگی امیدوار قاضی فضل اللہؒ کو شکست دیدی۔ سندھ میں حکومت سازی کانگریس کے لئے چیلنج تھی۔ ہندو سیٹھوں نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیئے۔ صرف ایک ووٹ سے ان کی حکومت نہیں بن رہی تھی۔ سردار نبی بخش بھٹوؒ نے کانگریس کی ہر آفر و ترغیب ٹھکرا دی۔ مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب نہ ہونے کے باوجود قائداعظمؒ کو ہی اپنا لیڈر قرار دیا اور اسمبلی کے اندر مسلم لیگ کا بھرپور ساتھ دیا۔ نتیجتاً کانگریس اور مسلم لیگ کے ممبرز برابر ہونے کے باعث آئین کی رو سے گورنر سندھ کو اسمبلی توڑنا پڑی۔ نئے الیکشن ہوئے۔ اب کے مسلم لیگ نے سردار نبی بخشؒ بھٹو کو ٹکٹ دیا۔ سندھ میں 35 کی 35 مسلم نشستیں مسلم لیگ نے جیتیں۔ یہ تھے بھٹو کے دادا سردار نبی بخش بھٹوؒ۔ ذوالفقار علی بھٹو، سر شاہنواز بھٹو اور سردار نبی بخش بھٹو۔ بھٹو خاندان کی یہ تینوں نسلیں قائداعظمؒ کو اپنا لیڈر مانتی رہیں۔

پھر بھی لطیف کھوسہ پورے اعتماد اور وثوق سے کہتے ہیں کہ ذوالفقار علی بھٹو قائداعظمؒ سے بڑے لیڈر تھے۔ (روزنامہ ایکسپریس لاہور۔ 30 جنوری تا 2 فروری 2005ء)۔

قائداعظمؒ کا جامِ جم

روزنامہ ایکسپریس لاہور۔ 16 جون 2006 ء۔ایاز امیر اپنے کالم کا آغاز ان الفاظ میں کرتے ہیں:''بابائے قوم اوران کے ہم خیال چند ایک دیگر افراد آخر کیوں جمہوریت اور قانون کی بالادستی کی باتیں کرتے تھے؟ اگر انہیں پتہ ہوتا کہ ہم ان نظریات کا کیا حشر کرنے والے ہیں تو وہ خودکو ان تمام زحمتوں سے بچا سکتے تھے جو انہوں نے اس سلسلے میں اٹھائی تھیں۔انہیں بصیرت بلاشبہ حاصل تھی (جو سبھی عظیم انسانوں میں کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے) لیکن پیش گوئیاں کرنے کا فن انہیں عطا نہیں ہوا تھا''۔

قائداعظمؒ کی بصیرت سے ایاز امیر صاحب کو انکار نہیں، کہ ان کے نزدیک یہ سبھی عظیم انسانوں میں کسی نہ کسی حد تک موجود ہوتی ہے۔تاہم وہ قائدؒ میں پیش گوئیوں کے فن سے انکاری ہیں۔یقیناً وہ پیشہ ور پیش گو نہ تھے، کہ ہر بات پر پیش گوئی کرتے۔کوئی بات سچ ثابت ہوگئی تو واہ واہ، نہ ہوئی تو کہہ دیا، میں کوئی خدا تو نہیں۔قائداعظمؒ ایک سٹیٹس مین تھے، جس کی نظریں آگے کے زمانے پر ہوتی ہیں۔وہ چھوٹی باتوں میں الجھ کر بڑے مقصد سے پسپائی اختیار نہیں کرتا۔

ایاز امیر صاحب کے دکھ بھرے ان دونوں پیراگرافس کا لب لباب یہ ہے، اگر قائداعظمؒ کو پتہ ہوتا کہ ان کے پاکستان کا یہ حشر کیا جائے گا تو وہ اسے تشکیل نہ دیتے۔یہ سوچ اکیلے ایاز امیر تک ہی محدود نہیں، بہتوں کا یہی خیال ہے، جو سراسر غلط ہے۔قائداعظمؒ اپنی قوم کے مزاج شناس تھے۔تبھی تو جب کسی نے پوچھا:''آپ پاکستان کس کے لئے بنا رہے ہیں؟'' قائداعظمؒ نے جواب دیا:''مسلمانوں کے لئے''۔ پوچھنے والے نے دوسرا سوال کیا:''کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان ہیں؟'' قائداعظمؒ کا جواب تھا:''نو''۔''انہیں صحیح معنوں میں مسلمان بننے کے لئے کتنا عرصہ درکار ہوگا؟'' قائداعظمؒ نے کہا:''اس کے لئے ایک صدی چاہیئے''۔

این ایم کوتوال گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کے لیگل ایڈوائزر رہے۔وہ کہتے ہیں:''ایک دفعہ میں قائداعظمؒ سے قومی کردار پر گفتگو کر رہا تھا۔وہ اس بات پر متفق تھے کہ جن برائیوں اور خامیوں میں ہماری قوم مبتلا ہے ان میں سے بیشتر کردار کی خامی کے باعث رونما ہو رہی ہیں۔میں نے خیال ظاہر کیا کہ

صحیح قومی کردار پیدا ہونے میں بیس سال مزید لگیں گے۔ قائداعظمؒ، جو اپنے عوام کو بہت اچھی طرح جانتے تھے، میری رائے سن کر فرمایا: ''نہیں، ایک سو سال''۔

انہیں پیش گوئیوں میں شمار کیا جائے، سیاسی تجزیہ کہا جائے یا مشاہداتی قوت کا حاصل، بہر حال یہ حقیقت ان پر آشکار ہو چکی تھی کہ یہ قوم صحیح معنوں میں مسلمان نہیں، اس کے لئے ایک صدی درکار ہے۔ اس قوم میں قومی کردار نہیں، جس کے پیدا ہونے میں ایک سو برس لگیں گے۔ اور اس قوم کو وہ اتحاد، تنظیم، یقینِ محکم کی تلقین کیا کرتے تھے، اس لئے کہ اس قوم میں ان خوبیوں کی کمی تھی۔ مسلم لیگ، جو ان کی قیادت میں مسلمانوں کے اتحاد کی مظہر بن کر ابھری، کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ میرے بعد یہی مسلم لیگ کئی ٹکڑوں میں بٹے گی۔ ان کے دستِ راست شہیدِ ملّت خان لیاقت علی خانؒ کی شہادت کے بعد قوم نے یہ نظارہ بھی کرنا شروع کر دیا اور آج اس بدقسمتی کی انتہا یہ ہے کہ قائداعظمؒ کا نام، جو اتحادِ ملّت کی علامت تھا، مسلم لیگ کے ایک دھڑے نے اختیار کر رکھا ہے، وہ بھی سرکاری مسلم لیگ نے۔ آئندہ ہمیں دیکھنے کو پتہ نہیں اور کتنی انتہائیں ملتی ہیں۔

اس کے باوجود قائداعظمؒ قیامِ پاکستان پر اٹل رہے، اس لئے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ، ثقافت اور تمدن حتیٰ کہ ان کے وجود کی بقا کا مسئلہ تھا۔ سرزمینِ ہندوستان میں ان کے لئے سپین کی تاریخ دہرائے جانے کی تیاریاں مکمل تھیں۔ اگر پاکستان نہ بنتا تو ہندوستان کا مسلمان ہی نہیں پورا مڈل ایسٹ انگریز یا ہندو برہمن ازم یا دونوں کی جارحیت تلے روندا جاتا۔ قائداعظمؒ اپنے دستِ راست شہیدِ ملّت خان لیاقت علی خانؒ کو ساتھ لے کر یکم دسمبر 1946ء کے روز گول میز کانفرنس میں شرکت کی خاطر کراچی سے لندن کے لئے روانہ ہوتے ہیں، راستے میں قاہرہ رکتے ہیں۔ 7 دسمبر کو لندن میں گول میز کانفرنس ہوتی ہے۔ 15 دسمبر کو لندن سے مالٹا اور 16 دسمبر کے روز قاہرہ پہنچتے ہیں۔ 19 دسمبر تک وہاں قیام فرماتے ہیں۔ اس دوران میں مصر کے شاہ فاروق سمیت ساری قابلِ ذکر مصری قیادت کے ساتھ ملاقاتیں کرتے ہیں اور یہ حقیقت ان کے ذہن نشین کرتے ہیں کہ آپ لوگوں کی آزادی قیامِ پاکستان کے ساتھ مشروط ہے، کیونکہ جو قوم بحرِ ہند پر قابض ہو مڈل ایسٹ اس کے اختیار و اقتدار میں رہتا ہے۔ اگر پاکستان نہ بنا اور انگریز متحدہ ہندوستان کی حکومت ہندو کانگریس کے حوالے کر گیا تو آپ انگریز اور دوسری استعماری قوتوں کی جگہ ہندو کے غلام ہوں گے۔

اس لئے قائداعظمؒ نے اس خوف سے کبھی قیامِ پاکستان کے نظریے سے دستبردار ہونے کا سوچا تک نہیں کہ ان کے بعد میں آنے والے اس ملک میں جمہوریت اور قانون کی بالادستی کا کیا حشر کرتے ہیں۔ آخر مصلحین اور بعض انبیاؑ کے نظریات کا کیا حشر ہوتا رہا؟ حضرت عیسیٰؑ نے بعض حواریوں کی بے وفائی کے

خوف سے تبلیغ چھوڑ دی؟ انہیں دغا دینے والا ان کا ساتھی یہودا اسقریوتی تھا۔ اسی طرح کوئی بھی بڑا آدمی اپنے مشن سے بعد ازاں ہونے والے متوقع واقعات کے خوف سے دستبردار نہیں ہوتا۔

بڑا آدمی تو بڑا ہوتا ہی ہے۔ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ ایک عام باپ کو بھی ناخلف اولاد اور آگے اس کی اولاد کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔

ہندوستان میں مسلم حکمرانی کا باضابطہ آغاز خاندانِ غلاماں سے ہوتا ہے جس کے اولین بادشاہ قطب الدین ایبک تھے۔ ان کی چار سالہ (1206ء-1210ء) حکمرانی کے بعد ان کا بیٹا آرام شاہ تخت نشین ہوا جو سخت نااہل اور سست تھا۔ شمس الدین التمش قطب الدین ایبک کا غلام اور داماد تھا۔ وہ آرام شاہ کو ہٹا کر خود بادشاہ بن گیا اور جو صوبے دار قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد خود مختار بن بیٹھے تھے ان کی سرکوبی کی۔ راجپوتوں کے ساتھ جنگیں کر کے شمالی ہندوستان میں مرکز کا قبضہ پختہ کیا۔ التمش کے دور کا یہ واقعہ بڑا اہم ہے کہ چنگیز خاں اپنے ایک دشمن خوارزم کے بادشاہ جلال الدین کے تعاقب میں ہندوستان تک آن پہنچا۔ جلال الدین نے التمش سے پناہ کی درخواست کی۔ التمش نے ہندوستان کو چنگیز خاں کی جارحیت سے محفوظ رکھنے کے نقطۂ نظر سے جلال الدین خوارزمی کو پناہ دینے سے انکار کر دیا۔ یوں ہندوستان ایک بڑی تباہی سے محفوظ رہا اور چنگیز خاں سندھ پار کا علاقہ تباہ کر کے واپس چلا گیا۔ التمش کے یہ سارے اقدامات ہندوستان میں مسلم حکمرانی مستحکم کرنے پر منتج ہوتے رہے، جبکہ اس کی اولاد حکمرانی کے تحت نااہل تھی۔ رکن الدین نکما اور عیاش، رضیہ سلطانہ عورت ہونے کے ناتے ناقابل قبول ٹھہریں۔ قتل ہوئیں۔ ان کا بھائی بہرام اور بھتیجا علاؤالدین یکے بعد دیگرے تخت دہلی پر بیٹھے، لیکن نااہلی کے سبب اتار دیئے گئے۔ ناصرالدین محمود عیاش نہ تھا لیکن حکمرانی کے اہل بھی نہ تھا۔ اس طرح درویش تھا۔ التمش نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے ہندوستان میں مسلم حکمرانی پختہ کی اس لئے کہ اس کے پیشِ نظر چند برس نہیں، آنے والی صدیاں تھیں۔ ہندوستان میں مسلم حکومت تھی تو اس کے بیٹے اور درویش بادشاہ ناصرالدین محمود کو غیاث الدین بلبن جیسا صاحب تدبیر وزیراعظم میسر آیا۔ جو بعد میں ہندوستان کا حکمران بنا۔ جس نے برہمنوں اور ہندو راجاؤں کی وہ سازشیں ناکام بنا ڈالیں جو مسلمانوں کو اسی راستے سے واپس بھیجنے کے لئے کی جا رہی تھیں جس راستے سے وہ ہندوستان میں آئے تھے۔ اور بالآخر بات کہاں تک پہنچی؟ قیام پاکستان پر۔

میرا مقصد ایاز امیر صاحب کی دکھی دل سے لکھی گئی تحریر میں سے کیڑے نکالنا نہیں، بادی النظر میں انہوں نے جو کچھ لکھا قومی درد میں ڈوب کر لکھا۔ لیکن میں ان کے اس مؤقف سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ میں کیا تاریخ بھی یہ رویہ اپنانے سے عاجز ہے کہ اگر قائداعظمؒ کو علم ہوتا کہ ان کے پاکستان کے ساتھ یہ

کچھ کیا جائے گا تو وہ یہ ملک بنانے سے باز رہتے۔ وہ عام سیاستدان نہیں سٹیٹس مین تھے، جس کی نظریں آنے والی صدیوں پر ہوتی ہیں۔قوم کے آنے والے ''رہنماؤں'' کے لچھن ان سے پوشیدہ نہ تھے۔ مثلاً اسی پہلے پیراگراف میں ایاز صاحب لکھتے ہیں:

''کیا جناح صاحب اپنے بدترین کابوس میں بھی ہمارے پالیمانی امور کے وزیر ڈاکٹر شیر افگن نیازی اور وزیر قانون وصی ظفر جیسے نابغوں اور مشاہد حسین جیسے قاف لیگ کے ان حیران کن آئینی ماہرین کا تصور کر سکتے تھے جو موجودہ اسمبلیوں کے ذریعے ہی عہدۂ صدارت پر جنرل مشرف کے دوبارہ انتخاب کے لئے قوم کو تیار کرر ہے ہیں؟؟!!''

قائداعظمؒ کا اس سے بھی زیادہ کا تصور تھا۔ اسی لئے تو جب ان سے کراچی کے ایک پارسی بزنس مین نے ملاقات کے دوران میں وزیر تجارت کی شکایت کی، قائداعظمؒ نے کہا: آپ کی شکایت بجا لیکن میں وزرا کے کاموں میں مداخلت نہیں کیا کرتا۔ دوسرے، آپ نے میرے وزرا پر تنقید کی ہے۔ یہ لوگ غنیمت ہیں، بعد میں آنے والے بدتر ہوں گے۔

اسی تحریر کا دوسرا پیراگراف ملاحظہ ہو: ''ذرا سوچئے کہ اگر جناح صاحب کسی طرح یہ سب کچھ پہلے سے جان سکتے۔ اگر پاکستان کو اس حال تک پہنچانے کے ذمہ دار تین چار فوجی سربراہوں کی تجسیم ان کے تصور میں کسی طور ہو سکتی یا کسی جام جم میں ہمارے قومی منظر پر اس وقت موجود مسخروں کی فوج ظفر موج کا نظارہ کرنا ان کے لئے ممکن ہوتا تو اس سوال کی بے باکی سے قطع نظر کیا واقعی وہ اپنی کئی باتوں پر نظر ثانی نہ کر لیتے؟''

یقیناً قائداعظمؒ اپنے جامِ جم میں ان تین چار فوجی سربراہوں کی تجسیم دیکھ رہے تھے، جنہوں نے بعد میں ان کے تصورِ قیامِ پاکستان کو تہس نہس کر ڈالا۔ قائدؒ ان سے بے خبر نہیں رہے۔ بار بار انہیں سیاست میں ٹانگ اڑانے سے منع کیا اور سویلین حکومت کے احکامات کی تعمیل کی ہدایت کرتے رہے تا آنکہ 14 جون 1948ء کو سٹاف کالج کوئٹہ میں باقاعدہ اور باضابطہ پرزور لہجے میں فوجی افسروں کو ان الفاظ میں جھنجوڑا:

''میں یہاں ایک اور بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ایک دو افسروں کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اس حلف کے منشا سے کماحقہٗ آگاہ نہیں ہیں جو افواجِ پاکستان نے اٹھایا ہے۔ بلاشبہ حلف اٹھانا محض ایک رسم ہے مگر اس سے کہیں زیادہ اہم جذبے اور دل کی سچائی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم رسم ہے اور میں اس موقع پر آپ کی یادداشت تازہ کرنے کے لئے حلف کی عبارت دہرانا چاہتا ہوں:۔

''میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر صدقِ دل سے عہد کرتا ہوں کہ میں آئین اور ڈومینین آف پاکستان کا وفادار رہوں گا۔آئین اور حکومت ڈومینین آف پاکستان کے الفاظ نوٹ کیجئے ۔اور یہ کہ میں مسلح افواج میں اپنی شرائط شمولیت کے مطابق فضا، خشکی یا سمندر میں انتہائی دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دوں گا اور اپنے آفیسر کے تمام احکامات کی تعمیل کروں گا.....

''جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ جذبہ ہی اصل چیز ہے جو اہمیت رکھتا ہے۔میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ آئین اور ڈومینین کے وفادار رہیں گے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ پاکستان میں نافذ العمل موجود آئین کا مطالعہ کریں اور اس کے صحیح آئینی اور قانونی منشا اور معانی کو سمجھیں''۔

انہوں نے صرف فوج کو ہی نہیں، بیوروکریسی کو بھی بار بار عوام کا خادم بننے کی ہدایت کی۔ پاکستان کو جاگیرداری اور سرمایہ پرستی سے پاک کرنے کا عزم بھی باندھا۔لیکن انہیں وقت نہ مل سکا۔تو جن لوگوں نے ان کا بنایا ہوا ملک برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی وہ ان سے بے خبر تھے؟ بالکل نہیں۔ان کا جامِ جم انہیں سب کچھ دکھا رہا تھا۔ پھر بھی پاکستان ضروری تھا کہ اگر آج تین چار جرنیلوں کی تجسیم آرام شاہ، رکن الدین، بہرام شاہ اور علاؤ الدین کی صورت میں ہوتی ہے تو کل کو کوئی بلبن بھی آئے گا۔ یہ ملک موجود ہوگا تو بلبن آئے گا۔ اگر آرام شاہوں کے خوف سے ہندوستان میں مسلم حکومت مستحکم نہ کی جاتی تو خاندانِ غلاماں کے بعد خلجی، تغلق، لودھی اور مغل کیسے آتے؟ اور پاکستان کی نیو کہاں ڈالی جاتی؟ جس کے متعلق قائداعظمؒ کہا کرتے تھے، یہ صرف ہندوستان کے ہی نہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے ہے۔ قراردادِلاہور کے بعد اسی لئے اینٹی پاکستان کانفرنس منعقد ہوتی ہے جس میں مسٹر اپنے اپنی صدارتی تقریر میں ایشیا کے اسلامی ملکوں، جن میں روس کی مسلمان ریاستیں بھی شامل ہیں، کے ایکے کو ایک ہولناک اتحاد قرار دیتے ہیں۔ جو ان کے نزدیک ''یورپ کی مغربی تہذیب، ہندوستان اور مشرقِ بعید کے ویدک اور بدھ تمدنوں کے حق میں زبردست خطرہ ثابت ہوگا.....''

ابھی پاکستان کو وجود میں آئے 59 برس ہوئے ہیں۔درست کہ اس ملک کی تشکیل میں فوج یا کسی فوجی مہم جوئی کا ذرہ بھر دخل نہیں۔ بلکہ اگر پاکستان موومنٹ ناکام رہتی۔انگریز اپنا قبضہ چھوڑنے سے انکار کر دیتا، یا وہ ہندوستان کی حکمرانی ہندو کانگریس کو دے جاتا، یا دونوں مل کر حکومت کرتے تو یہی ایوب خاں، یحییٰ خاں، ضیاء الحق وغیرہ اپنے آقاؤں کے حکم پر قائداعظمؒ اور ان کے رفقا کو دہلی کے چاندنی چوک میں گولیوں سے اڑا رہے ہوتے اور کنئوں کی پیٹھوں پر کوڑے مار رہے ہوتے۔اسی لئے ان کا یکے بعد

دیگر ے اقتدار پر قابض ہونا اور سیاسی عمل کو بے عمل کرنا ہماری بدقسمتی ہے۔

قائداعظمؒ کو اس کا شعور تھا، احساس تھا کہ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ یونہی انہوں نے سٹاف کالج کوئٹہ میں فوجی افسروں کو حلف کی عبارت مذکور پڑھ کر نہیں سنائی تھی اور اس پر عمل کرنے کی تاکید بھی کی تھی۔

ایک سٹیٹس مین کی منصوبہ بندی چند سال کا احاطہ نہیں کرتی، اس کے سامنے صدیاں ہوتی ہیں۔ اور وہ محض جانشینوں کی نااہلی اور بھٹکاؤ کے خوف سے اپنا منصوبہ ترک نہیں کردیتا۔ قائداعظمؒ جب کہتے ہیں، آپ کس اتحاد کی بات کرتے ہیں، میرے بعد 36 مسلم لیگیں بنیں گی۔ تو اس کا مطلب ہے انہیں آنے والے حالات کا ادراک تھا۔ ملک کا وجود ہوگا تو تین چار فوجی سربراہوں کی تجسیم کے بعد پھر سے لیاقت علی خاںؒ، حسین شہید سہروردیؒ اور سردار عبدالرب نشترؒ بھی آجائیں گے۔ اگر نوحؑ کے گھر نافرمان اور باغی بیٹا پیدا ہوسکتا ہے تو بت تراش آذر کے گھر بت شکن ابراہیمؑ جدالانبیا بھی جنم لے سکتے ہیں۔ اور فرعون کے ہاں موسیٰؑ کلیم اللہ پرورش پا سکتے ہیں۔

قائداعظمؒ جامِ جم میں تین چار فوجیوں کی تجسیم دیکھ کر مایوس ہوجاتے تو آج اس سرزمین پر کسی آذر کے ہاں ابراہیمؑ اور فرعون کے ہاں موسیٰؑ کی تخلیق کی توقع کیسے کی جاسکتی تھی؟ آخر انہوں نے ٹی بی کیوں لگوائی؟ پھر اس کا علاج محض اس لئے نہ کروایا کہ ہندو اور انگریز ان کی موت کا انتظار نہ کرنے لگیں۔ یہ سب انہوں نے اس کے باوجود کیا کہ انہیں پوری طرح احساس تھا کہ اس قوم میں قومی کردار سو سال بعد پیدا ہوگا اور یہ قوم صحیح معنوں میں مسلمان ایک صدی کے بعد بنے گی۔ اس لئے مایوس نہیں ہونا۔ انسان مرتا تب ہے جب آس ٹوٹتی ہے۔ متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آس قائداعظم محمد علی جناحؒ تھے۔ اور آج ہم انہی کے پاکستان میں آس توڑ دیں؟ انہوں نے اس سے منع فرمایا ہے۔ بقول این ایچ ہاشمی مرحوم:

''ایک موقع پر قائداعظمؒ فرما رہے تھے: ''پاکستان انشاءاللہ بن کے رہے گا''۔ میرے منہ سے اچانک نکل گیا: ''قائداعظمؒ! اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے۔ ہمارے ہاں تو قحط الرجال ہے''۔ اس پر ارشاد فرمایا: ''نوجوان! آپ مایوسی کا شکار کیوں ہوتے ہو۔ کون جانتا تھا کہ جناح پیدا ہوگا، اتاترک اٹھے گا۔ آپ ہی میں سے جناح ابھریں گے۔ مایوس ہونے کے بجائے محنت کریں اور بہتری کی امید رکھیں''۔

اگر لیاقت علی خاںؒ نہیں رہے، خواجہ ناظم الدینؒ نہیں رہے، حسین شہید سہروردیؒ نہیں رہے، مولوی تمیز الدین خاں نہیں رہے، سردار عبدالرب نشترؒ نہیں رہے تو جنرل ایوب، جنرل یحییٰ، جنرل ضیا اور جنرل مشرف بھی نہیں رہیں گے۔ قائداعظمؒ کا جامِ جم یہی دکھاتا ہے۔

(روزنامہ ''ایکسپریس'' لاہور۔ 25، 26 جون 2006ء)

قائداعظمؒ --- فیس، اصول اور اخلاقی تقاضے

ملک محمد قیوم، جو ملک سے بدعنوانی ختم کرنے کے دعویدار صدر جنرل پرویز مشرف کے دور حکومت کے آخری چند مہینوں میں انہیں قانونی اور آئینی سہارا دینے کے لئے اٹارنی جنرل آف پاکستان نامزد کئے گئے تھے، کے حوالے سے 17 دسمبر 2008ء کے روزنامہ اخبار میں یہ خبر شائع ہوئی ''میں اصولوں اور اخلاقی تقاضوں کی پروا کئے بغیر صرف فیس کے لئے کیس لڑتا ہوں اور یہی کچھ بانی پاکستان قائداعظمؒ کیا کرتے تھے''۔ اخبار نے یہ خبر کسی نجی ٹی وی کے حوالے سے دی ہے، لیکن حسب معمول اس ٹی وی چینل کا نام نہیں دیا۔ پتہ نہیں اس سلسلے میں بیشتر اخبارات کسی اخلاقی قدر کے پابند کیوں نہیں۔ خبر وہ دے دیں گے لیکن اس ٹی وی چینل اور پروگرام کے میزبان کا نام دینا گوارا نہیں کریں گے۔ ایسا ہونا نہیں چاہئے۔ بہرحال، روزنامہ نوائے وقت لاہور نے مانیٹرنگ نیوز کے حوالے سے آگے چل کر لکھا ہے: ''نجی ٹی وی کے اس پروگرام کے میزبان نے ملک قیوم کو بار بار کہا کہ وہ اپنی بحث کے دوران قائداعظمؒ کی ذات کو باہر ہی رکھیں اور اس طرح کے جملے ادا نہ کریں، لیکن اس کے باوجود ملک قیوم قائداعظمؒ کے بارے میں کہتے رہے کہ قائداعظمؒ بھی صرف فیس کے لئے کیس لڑتے تھے اور میں بھی وہی کچھ کر رہا ہوں۔

یوں ملک محمد قیوم، جنہوں نے بطور جج لاہور ہائی کورٹ آصف علی زرداری اور بے نظیر بھٹو کے سلسلے میں ایس جی ایس کوٹیکنا کیس میں ایسی ''شہرت'' پائی کہ انہیں یہ عہدہ ہی چھوڑنا پڑا، نے یہ بیان دے کر کرکٹ سیحمالت کا ثبوت دیا ہے۔ پتہ نہیں انہوں نے کس بنیاد پر اس قدر لغو دعویٰ کر دیا ہے، کیونکہ قائداعظمؒ کی وکیلانہ زندگی اس کی سخت تردید کرتی ہے۔

بمبئی کے حسین بیگ محمد قائداعظمؒ کے ایک زبردست والا وشیدا تھے۔ ایک سرفروش سپاہی۔ انہوں نے مجھے بتایا: ''1936ء کے الیکشن میں قائداعظمؒ نے مجھے حکم دیا کہ میں بمبئی کی صوبائی نشست کے لئے مسلم لیگ ٹکٹ پر انتخاب لڑوں۔ بلدیہ کے ریکارڈ سے تاریخ پیدائش کا سرٹیفکیٹ لیا تو اس کے مطابق میری پیدائش سولہ جنوری 1910ء تھی۔ جبکہ، ایک دوسرے سرٹیفکیٹ میں 26 جنوری کی تاریخ لکھی تھی۔ احتیاط کے طور پر ہم معاملہ قائداعظمؒ کے پاس لے گئے۔ اتنی چھوٹی سی بات کی سیاسی لوگ پروا نہیں کرتے، لیکن قائداعظمؒ قانون کے اس

قدر پابند انسان تھے کہ فوراً کہا ''حسین! مسٹر سٹرینگ مین کے پاس چلے جاؤ، وہ آپ سے پانچ دس گنی فیس لے گا اور یہ مسئلہ مناسب طور پر حل ہو جائیگا''۔ سٹرینگ مین انگریز وکیل تھا۔
(حوالہ آتش فشاں۔ قائداعظمؒ نمبر۔ دسمبر 1976ء صفحہ 87)۔
جسے فیس کی خاطر اصولوں اور اخلاقی تقاضوں کی پروانہ ہو، وہ ایسا ہرگز نہیں کرتا کہ کسی کو کسی دوسرے وکیل کے پاس بھیج دے۔

قائداعظمؒ کی بہن مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ لکھتی ہیں:۔

''مسٹر سٹرینگ مین بمبئی بار کے ایک سینئر اور قابلِ احترام انگریز رکن تھے۔ ان دونوں (محمد علی جناح اور سٹرینگ) کو ایک مقدمے کے سلسلے میں مشترکہ طور پر وکیل مقرر کیا گیا۔ ایک موقع پر میرے بھائی کو سٹرینگ مین کے چیمبر میں اس کیس پر مشترکہ صلاح مشورے کے لئے جانا پڑا۔ اس زمانے میں انگریزوں کا اپنے ہندوستانی رفقائے کار کے ساتھ تحکمانہ انداز روا رکھنا غیر معمولی بات نہیں تھی۔ سٹرینگ مین نے قائدؒ کے ساتھ بات چیت میں ایسا لب ولہجہ اور رویہ اختیار کیا جو میرے بھائی کے نزدیک توہین آمیز اور حقارت پر مبنی تھا۔ اس روز کے بعد وہ دوبارہ کبھی سٹرینگ مین کے چیمبر میں نہیں گئے۔ حتیٰ کہ عدالتوں کے اندر اور باہر جب سٹرینگ مین ان کے سامنے آتا تو اس کے ساتھ رسمی علیک سلیک بھی نہ کرتے۔

''بمبئی بار میں ایک نووارد وکیل کی حیثیت سے وہ ایک مرتبہ جسٹس مرزا کی عدالت میں پیش ہو رہے تھے۔ ان کے مخالف وکیل سر چمن لال سیتلواڈ تھے۔ جب قائدؒ دلائل ڈویلپ کر رہے تھے تو جسٹس مرزا نے انہیں ٹوکا اور سرزنش کی۔ قائدؒ نے اس کا برا منایا اور اس کے بعد انہوں نے جج کو ایسے انداز میں مخاطب کرنا شروع کر دیا جسے جسٹس مرزا نے توہین محسوس کیا۔ جج نے نوجوان بیرسٹر کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا: ''آپ کے الفاظ اور لہجہ توہینِ عدالت کی گرفت میں آ سکتا ہے''۔ پھر جج نے سیتلواڈ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا: ''مسٹر سیتلواڈ! کیا آپ مجھ سے اتفاق نہیں کرتے؟''۔ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے سر چمن لال سیتلواڈ نے اپنے کتاب میں لکھا: ''جج کا مجھ سے اس قسم کا سوال کرنا انتہائی احمقانہ تھا۔ چنانچہ، میں نے جواب دیا: ''یہ رائے دینا میرا کام نہیں ہے کہ آیا مسٹر جناحؒ نے توہین عدالت کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں۔ یہ آپ کا حق ہے کہ آپ اس بات کا تعین کریں۔ مگر میں کہہ سکتا ہوں کہ مسٹر جناح کے ایک جاننے والے کی حیثیت سے اور جس حد تک میں انہیں جانتا ہوں، ان کا مقصد عدالت کی توہین کرنا کبھی نہیں ہو سکتا''۔ بعد کے برسوں کے دوران اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے قائدؒ نے بتایا: ''اس روز کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں (بحیثیت وکیل) جسٹس مرزا کی عدالت میں کبھی پیش نہیں ہوں گا''۔ (حوالہ: میرا بھائی۔ صفحہ 63،62۔ پبلشر آتش فشاں، پوسٹ بکس 162 لاہور)۔

جو شخص اصولوں اور اخلاقی تقاضوں کی پروا کئے بغیر صرف فیس کے لئے کیس لڑتا ہو، وہ کسی سنہ نہیں، سے محض اصولوں کی خاطر علیک سلیک ختم نہیں کرتا اور نہ کسی جسٹس مرزا کی عدالت میں پیش نہ ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔

بیگم رعنا لیاقت علی خانؒ نے قائداعظمؒ پر ایک انٹرویو کے دوران میں مجھے بتایا: "پیسے انہوں نے ہمیشہ جائز طریقے سے کمائے۔ ایک دفعہ ان کے پاس مقدمہ آیا۔ ان کا اندازہ تھا کہ اس پر زیادہ وقت صرف ہوگا۔ ان کے مؤکل نے انہیں کافی رقم پیش کر دی۔ قائداعظمؒ نے یہ کہہ کر اسے رقم واپس لے جانے کو کہا کہ "میں اپنے وقت کے حساب سے پیسے وصول کروں گا۔ ایک گھنٹہ لگے یا تیس دن، آپ کے پاس میرا بل پہنچ جائے گا"۔ قائداعظمؒ کے اندازے کے برعکس کیس چند گھنٹوں میں ہی طے ہوگیا۔ مؤکل نے اصرار بھی کیا لیکن قائداعظمؒ نے صرف اپنا حق وصول کیا"۔ (آتش فشاں۔ صفحہ 34، 35)۔

قائداعظمؒ کی اصول پرستی اور دیانت داری کے تو ان کے دشمن بھی مداح اور قائل تھے۔ کشمیر کے شیخ عبداللہ کو ان سے کس قدر اختلاف رہا، لیکن اپنی خودنوشت "آتش چنار" کے صفحہ 304، 305 پر وہ لکھتے ہیں: "1935ء میں جناب محمد علی جناح سرینگر سیر و تفریح کے لئے تشریف لائے تو وہ ایک ہندوستان گیر شخصیت کے مالک بن چکے تھے اور ان کے سیاسی امتیاز کے ساتھ ان کی قانون دانی کا لوہا بھی مان چکے تھے۔ اس وقت ان کے ساتھ ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح بھی تھیں۔ وہ شیو پورہ میں ایک ہاؤس بوٹ میں مقیم تھے۔ انہی دنوں چیف جسٹس سر برجور دلال کی عدالت میں ایک مقدمہ حنیفہ بیگم اور مہر علی تھانیدار کے متنازع نکاح سے متعلق زیر سماعت تھا۔ مہر علی کشمیر پولیس میں ایک تھانیدار تھا اور مقدمہ حنیفہ بیگم سے ان کے نکاح ثانی سے متعلق تھا۔ حنیفہ بیگم کا ایک اور دعویدار استاد عبدالکبیر پیر تھا۔ مہر علی کے ساتھ ہماری جان پہچان تھی۔ مقدمہ کافی مشکل تھا۔ اور اس نے کافی توجہ مبذول کر لی تھی۔ میں اور مرزا محمد افضل بیگ جناح صاحب سے ان کے ہاؤس بوٹ میں ملے تا کہ انہیں اس مقدمے کا وکالت نامہ لینے پر مائل کر سکیں۔ یہ میری جناح صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات تھی۔ جناح صاحب نہایت صاف ستھرے انگریزی سوٹ میں ملبوس تھے۔ اگر چہ وہ دبلے پتلے تھے لیکن ان کی آنکھوں میں ذہانت اور چہرے پر ایک قدرتی تمکنت موجود تھی۔ ایک خاص آن بان سے بات کرتے اور بہت کم مسکراتے۔ اس لئے ان کے گھر میں سنجیدگی کا ماحول قائم رہتا۔ بیگ صاحب سے مقدمے کی نوعیت سن کر انہوں نے ایک ہزار روپیہ فی پیشی فیس طلب کی۔ ہم اتنی بڑی فیس ادا کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھے اور جناح صاحب کو فیس گھٹانے پر راضی کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ یہ بات میری پیشہ ورانہ اخلاقیات کے منافی ہوگی۔ آپ کو ایک ہزار روپے فی پیشی کے حساب سے فیس دینا ہوگی، جب ہی میں وکالت نامہ قبول کروں گا۔ انہوں نے

یہ بھی کہا کہ میں خیراتی کاموں کے لئے چندہ دے سکتا ہوں، لیکن پیشہ ورانہ اصولوں کو قربان نہیں کر سکتا۔ معاملہ طے کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اور وہ پیشی کے دن سر برجور کی عدالت میں وکالت کے جوہر دکھانے کے لئے آ گئے۔ ان کی فاضلانہ بحث سننے کے لئے کمرۂ عدالت لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ میں بھی تماشائیوں میں تھا۔ جناح صاحب کی وکیلانہ موشگافیاں رنگ لائیں اور ایک بڑے ہی باریک اور لطیف سے نقطے کی تشریح پر مقدمہ جیت گئے۔ کمال یہ ہے کہ یہ موشگافی اسلامی کیلنڈر سے متعلق ایک نکتے سے متعلق تھی۔''

قائداعظمؒ نے پہلی ہی پیشی میں مسئلہ حل کر دیا۔ جبکہ فیس ایک ہزار روپیہ فی پیشی طے ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود سابقہ جسٹس لاہور ہائی کورٹ ملک محمد قیوم کا اصرار ہے: ''میں اصولوں اور اخلاقی تقاضوں کی پروا کئے بغیر صرف فیس کے لئے کیس لڑتا ہوں اور یہی کچھ بانی پاکستان قائداعظمؒ کیا کرتے تھے''۔

کے ایل گابا، جنہوں نے اخیر دم تک صرف قیام پاکستان کی مخالفت ہی نہ کی، اس کے خلاف CONSEQUENCES OF PAKISTAN کے نام سے انگریزی میں کتاب بھی لکھ ماری، سے 22 دسمبر 1975ء کے روز میں نے قائداعظمؒ پر انٹرویو کیا، جس میں انہوں نے یہ بھی بتایا: ''اوجین، راجستان کا انہیں ایک کیس پیش کیا گیا۔ ٹیمپل (مندر) کیس۔ ایک مندر کے بارے میں ہندوؤں کے دو فرقوں میں جھگڑا چل رہا تھا۔ ایک پارٹی نے انہیں دو لاکھ روپے فیس ادا کرنے کی پیش کش کی کہ وہ ان کی طرف سے اپیل میں آرگو کریں۔ انہوں نے اس بنا پر وہ کیس لینے سے انکار کر دیا کہ اس روز انہوں نے اسمبلی میں کسی موضوع پر تقریر کرنا تھی۔ پتہ ہے انہوں نے اسمبلی میں وہ تقریر کتنی دیر کی؟ صرف دس منٹ وہ اسمبلی میں بولے۔ اور بہت خوش تھے ...... یہ 35-36ء کی بات ہے۔ اصول کے اتنے پابند تھے کہ دس منٹ کی تقریر کی خاطر دو لاکھ کی خطیر رقم ٹھکرا دی''۔

لیکن جنرل مشرف کے دورِ ابتلا کے اٹارنی جنرل ملک محمد قیوم صاحب کو قائداعظمؒ میں کوئی اصول اور اخلاقی تقاضا نظر ہی نہیں آتا۔

بقول رضوان احمد: ''ان کی پیشہ ورانہ عظمت کا ایک واقعہ بیان کرتا ہوں جو میرے پھوپھا سید محمد حسین بیرسٹر نے سنایا۔ وہ کونسل آف سٹیٹس کے ممبر بھی تھے۔ ریاست بھوپال میں عموماً قائداعظمؒ کے جونیئر ہوتے۔ 40ء یا 1941ء کا واقعہ ہے، کسی کیس کے سلسلے میں قائداعظمؒ نے بھوپال آنا تھا۔ وہ مصروفیت کی بنا پر نہ آ سکے تو سید صاحب نے عدالت سے مقدمہ ایک روز کے لئے مؤخر کرنے کی درخواست کی، جسے عدالت نے منظور نہ کیا۔ اسی روز کیس کی اوپننگ تھی۔ چنانچہ سید صاحب نے دلائل دینا شروع کئے کہ اتنے میں قائداعظمؒ تشریف لے آئے۔ سید صاحب نے کہا، حضور! مجھے زبردستی مقدمے کا آغاز کرنا پڑا۔ میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جسے دلیل کہا جا سکے۔ آپ تشریف لے آئے ہیں اس لئے بات شروع کیجئے''۔ قائداعظمؒ کا جواب ملاحظہ فرمائیں: ''ایسا ہماری

پیشہ ورانہ اخلاقیات کے منافی ہے۔ جب آپ نے دلائل شروع کر دیئے تو پھر میں آپ کو اسسٹ کرتا ہوں''۔ چونکہ قائداعظمؒ مقدمے میں معاون بن گئے تھے، اس لئے انہوں نے مؤکل کے پیسے واپس کر دیئے''۔

قائداعظمؒ کے متعلق جن لوگوں سے یادداشتوں پرمبنی میں نے انٹرویو کر رکھے ہیں ان میں مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں کے نواسے نواب ارشد سعید بھی شامل ہیں۔ ان کا پورا انٹرویو تو میری کتاب ''دی گریٹ لیڈرز'' میں آئے گا۔ یہاں قائداعظمؒ کی وکالت اور فیس کے متعلق نواب ارشد سعید کا بیان کردہ صرف یہ واقعہ دے رہا ہوں: ''پاکستان سے پہلے دہلی میں ہماری جائیداد کا مقدمہ تھا۔ میں قائداعظمؒ کو 10 اورنگزیب روڈ پر مشورے کے لئے ملا۔ انہوں نے وقت کے حساب سے فیس بتائی کہ میں اتنے وقت کے پندرہ سو روپے لوں گا۔'' اس حساب سے جو فیس بنے وہ لوں گا۔'' انہوں نے کافی ٹائم دیا۔ تقریباً 6 ہزار روپے بنتے تھے۔ کہنے لگے: ''آپ کے میں کچھ نہیں۔ آپ مقدمہ واپس لے لیں''۔ میں نے کہا، واپس لے لیتا ہوں۔ میں نے فیس دینا چاہی، انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ میں نے کہا: ''سر! یہ تو آپ کے مشورے کی فیس ہے''۔ فرمایا: ''میں اس مقدمے کی فیس لیتا ہوں جس میں کچھ جان ہو۔ جس میں کوئی جان ہی نہیں، کیا فیس لوں! میں اس ڈاکٹر کی طرح نہیں کہ مریض مر رہا ہو اور وہ فیس لے''۔

1942ء میں انگریزوں کے خلاف کانگریس نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک شروع کی۔ سندھ میں حالات ایسے خراب ہوئے کہ حکومت نے وہاں مارشل لا لگا دیا۔ حالات کے بگاڑ کی ذمہ داری پیر صاحب پگارا کے حروں پر ڈال دی گئی۔ موجودہ پیر صاحب پگارا علی مردان شاہ کے والد پیر صاحب پگارا سید صبغت اللہ شاہ کو گرفتار کیا گیا۔ مارشل لا کے تحت ان کے خلاف کارروائی شروع ہونا تھی۔ 17 جنوری 1943ء کو پیر صاحب پگارا نے قائداعظمؒ کو سندھی لہجے کی اردو میں خط لکھا۔ جو نیچے من وعن پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں پیر صاحب نے لفظ ادا کو عدا لکھا ہے:

محمد علی جناح سلامت

دوست مہربان امید گاہ درویشان جناب عالی بعد سلاموں کے عرض ہے برائے کرم آپ سندھ میں مجھ سے جلد آ کر ملاقات کیجئے میرا کیس 29 جنوری کو چالو ہوگا میں آپ کی فی ہر طرح کی عدا کرنے کو تیار ہوں۔ کیس مارشلا کے کورٹ میں چلیگا اور یہ کیس حیدرآباد شہر میں چلیگا اور میں حیدرآباد شہر میں ہوں۔ میں نے آپ کو مسلمانوں کا مربی سمجھ کر یہ عرض کیا ہے امید ہے آپ یہ عرض قبول کریں گے اور مجھ بیگناہ کو برا ہے خدا چھڑانے کی کوشش کریں گے۔ زیادہ خیر وسلام پیر پگاڑو۔

پیر صاحب کی طرف سے یہ خط ان کے وکیل دیال مل جے للوانی نے قائداعظمؒ کو ارسال کیا۔ اس وقت میجر

جنرل رچرڈسن بالائی سندھ میں برطانوی ہندی فوج کا کمانڈر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر تھا۔للوانی نے پیر صاحب کے اس خط کے ساتھ اپنی طرف سے بھی ایک خط قائداعظمؒ کو ارسال کیا، جس میں اس نے جنرل مذکور کے ساتھ اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ وہ (چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر) کہتے ہیں: ''وہ روپیہ جو پیر صاحب نے حفاظت کے خیال سے اپنی غیر حاضری میں اپنے مریدوں کے پاس رکھ دیا تھا پیر صاحب اس سے اپنے دفاع کے لئے فنڈ قائم کرنا چاہیں تو میں ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔ اگر ان کے مریدوں اور واقف کاروں میں سے کوئی پیر صاحب کے دفاع کے لئے رقم دینا چاہے تو یہ رقوم ان کے نام سے امپیریل بینک آف انڈیا حیدرآباد میں جمع کرائی جاسکتی ہیں''۔

لگتا ہے، للوانی اپنی اس تحریر کے ذریعے قائداعظمؒ پر واضح کرنا چاہتے تھے کہ وہ جتنی چاہیں فیس لیں یہاں روپے پیسے کی کمی نہیں۔ اس کے لئے پیر صاحب کو باقاعدہ دفاعی فنڈ قائم کرنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ خط کے آخر میں للوانی بھی یہ جملہ لکھتے ہیں: ''پیر صاحب آپ کو آپ کی فیس وغیرہ ادا کریں گے''۔ 18 جنوری 1943ء کو للوانی نے قائداعظمؒ کو جوابی تار بھیجا۔ اس میں بھی ان سے پیر صاحب کے دفاع میں پیش ہونے کی استدعا کے ساتھ یہ لکھا ''پیر صاحب آپ کو آپ کی فیس ادا کریں گے''۔ قائداعظمؒ نے 20 جنوری کو اس کا بذریعہ تار جواب دیا: ''آپ کا تار ملا۔ پہلے سے طے شدہ عوامی مصروفیات کے باعث میں پیر پگاڑو کا مقدمہ لینے سے قاصر ہوں''۔

دیال مل جے للوانی نے 22 جنوری کو پھر قائداعظمؒ کو تار دیا: ''پیر پگاڑو التجا کرتے ہیں کہ آپ چند روز کے لئے ہی تشریف لے آئیں۔ اپنی شرائط سے بذریعہ تار آگاہ کریں''۔ قائداعظمؒ نے بذریعہ جواب دیا: ''آپ کا تار ملا۔ مجھے ازحد افسوس ہے، پہلے سے طے شدہ مصروفیات کالعدم کردینا ممکن نہیں''۔

(''صرف مسٹر جناح''۔ صفحات: 110، 111)۔

قائداعظمؒ اگر صرف فیس کے لئے کیس لڑتے تھے تو انہوں نے پیر صاحب پگارو کو کیوں انکار کیا؟ موجودہ پیر صاحب پگارا کا کہنا ہے اگر قائداعظمؒ دفاع میں پیش ہوجاتے تو ان کے والد کو پھانسی نہ ہوتی۔

لیکن قائداعظمؒ برصغیر کے مسلمانوں کے بکھرے ہوئے غول کو قوم کا روپ عطا کرنے اور اس کے لئے حصول وطن کی کٹھن جدوجہد میں مصروف تھے اور اس ساری جدوجہد میں بھی انہوں نے مسلم لیگ یا قومی چندے پر کبھی کوئی بوجھ نہیں ڈالا، اپنے پلے سے خرچ کرتے رہے۔ بقول مختار زمن مرحوم: ''میرے والد آگرہ میں جج تھے، انہوں نے بتایا کہ ایک دفعہ قائداعظمؒ کسی کیس کے سلسلے میں آگرہ تشریف لائے۔ مسلم لیگ نے جلسہ کرنا چاہا۔ قائداعظمؒ نے اس بنا پر شرکت سے انکار کردیا: ''میں اپنے مؤکل کی طرف سے پیش ہونے آیا ہوں، جس کی وہ فیس ادا کررہا ہے۔ میں خیانت کیسے کروں۔ آپ جلسہ کرنا چاہتے ہیں تو بعد میں بلالیں میں اپنے خرچ پر آؤں گا''۔

جب 46ء کے فیصلہ کن انتخابات کا مرحلہ آیا جس میں فیصلہ ہونا تھا، آل انڈیا مسلم لیگ جیت گئی تو پاکستان، ہار گئی تو متحدہ ہندوستان۔ متحدہ ہندوستان کا مطلب تھا، ہندو رام راج کا قیام۔ مسلمانوں کو ہندو دھرم میں آنا تھا۔ جو ایسا نہ کرتا اس کے لئے موت۔ یہ ہندو کانگریس کی ذیلی تنظیموں کا طے شدہ پروگرام تھا۔ اس نازک مرحلے پر قائداعظمؒ نے قوم سے اپیل کی، آپ مجھے چاندی کی گولیاں یعنی روپے دیں میں آپ کو پاکستان دیتا ہوں۔ قوم نے کھل کر چندہ دیا۔ یہ چندہ براہ راست قائداعظمؒ کے پاس جاتا تھا۔ جس نے چار آنے بھیجے اسے بھی قائداعظمؒ نے اپنے ہاتھ سے رسید بھیجی۔ روزانہ جتنی رقم تو پہنچتی، اتنی ہی رقم کا چیک قائداعظمؒ اپنی طرف سے چندے کے طور پر اس قومی فنڈ میں جمع کراتے۔ ایک روز مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کہنے لگیں، اس طرح تو آپ کنگال ہو جائیں گے۔ قائداعظمؒ نے جواب دیا، مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ قوم چندہ دے اور میں اس سے پیچھے رہوں۔

جو وکیل اصولوں اور اخلاقی تقاضوں کی پروا کئے بغیر کیس لڑتا ہو وہ کسی موکل کو دوسرے وکیل کے پاس جانے کی ہدایت نہیں کرتا۔ کوئی پچیس چھبیس برس قبل بھارت کے ایک قومی انگریزی روزنامے میں ایک ہندو وسنت ٹی کرپلانی کا مضمون قائداعظمؒ کے آخری مقدمے کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ کرپلانی سیٹھ شیام لال کی فرم میں ملازم تھے۔ سرکاری اور فوجی ٹھیکوں کے باعث سیٹھ کروڑپتی سرمایہ دار تھے۔ سیٹھ شیام لال کے بیٹے کیسری چند کو آگرہ کے ڈپٹی کلکٹر ہیرا شیو واسانی اور انگریز میجر مارٹن نے سازش کے تحت ایک مقدمے میں پھنسوا دیا، کیوں کہ سیٹھ شیام لال نے ڈپٹی کلکٹر کو وار فنڈ میں چندہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ سیٹھ شیام لال کا کہنا تھا، میرے بچے کو اب مسٹر جناح کے سوا کوئی نہیں چھڑوا سکتا۔ کرپلانی کا تعلق سندھ سے تھا اور ان کے بزرگوں کے قائداعظمؒ کے بزرگوں کے ساتھ تعلقات رہے تھے۔ اور وہ خود ان دنوں دہلی میں قائداعظمؒ کی رہائش گاہ 10 اورنگزیب روڈ کے سامنے رہتے تھے۔ سیٹھ کے کہنے پر ان حوالوں سے انہوں نے قائداعظمؒ کے ساتھ ملاقات کی۔ مدعا بیان کیا۔ کرپلانی لکھتے ہیں: '' قائداعظمؒ نے بڑے تحمل اور اطمینان کے ساتھ جواب دیا، برخوردار! یہ ممکن نہیں۔ تمہیں معلوم ہے میں عرصہ ہوا پریکٹس ختم کر چکا ہوں۔ اب کسی عدالت میں پیش ہونے کا میرا کوئی ارادہ نہیں اور تم بات کر رہے ہو آگرہ کے ایک مجسٹریٹ کی عدالت کے لئے۔ اس کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قائداعظمؒ کے اس جواب میں کوئی تلخی یا درشتی نہیں تھی۔ جب کہ ان کی گفتگو سے یہ واضح ہوتا تھا کہ وہ میری اس تجویز اور جسارت سے محظوظ ہوئے۔ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ انہوں نے کہا کہ اس تجویز کو بھول جاؤ اور پھر انہوں نے بمبئی کے دو ایک ممتاز وکلا، مسٹر ایم سی سیتل واڈ اور ڈاکٹر مسٹر منشی وغیرہ کے نام لئے اور کہا کہ اگر تم ان کی خدمات حاصل کرنا چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں نے بچوں کی طرح اصرار کیا کہ وہ ضرور ہمارا مقدمہ لڑیں لیکن

انہوں نے کہا، برخوردار! اس کیس میں میرے پیش ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ میری امید ختم ہوگئی۔''

خیر، ہوتے ہوتے سیٹھ شیام لال وسنت ٹی کرپلانی کو ساتھ لے کے قائداعظمؒ کے پاس دہلی پہنچ گئے۔ قائداعظمؒ نے کہا، ''آپ کہیں تو مسٹر سپرو سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ اس معاملے سے بخوبی نپٹ سکتے ہیں۔ پٹنہ کے مشہور بیرسٹر مسٹر پی آر داس بھی اچھے رہیں گے۔ آپ ان میں سے کسی ایک سے رابطہ کرلیں''۔

لیکن سیٹھ شیام لال کے ذہن میں یہ بات پختہ ہوچکی تھی کہ اس کے بیٹے کیسری چند کو صرف اور صرف محمد علی جناحؒ ہی چھڑوا سکتے ہیں۔ کرپلانی کے مطابق، سیٹھ شیام لال نے اس مرحلہ پر اچانک اپنا آخری حربہ استعمال کیا۔ وہ کرسی سے اٹھے اور آگے بڑھ کر جلدی سے اپنی پگڑی اتار کر جناحؒ صاحب کے قدموں میں ڈال دی۔ میں نے دیکھا کہ جناح صاحب نے اپنے پیر پیچھے کھینچ لئے اور کہا،نہیں سیٹھ جی ایسا نہ کریں، ایسا نہ کریں۔ میں سیٹھ جی کو پکڑ کر پیچھے ہٹا رہا تھا تو جناح صاحبؒ نے کہا، میں آپ کی پریشانی کو سمجھتا ہوں۔ ان کے چہرے کے تاثرات سے میں نے اندازہ لگایا کہ جناح صاحب جو ذاتی وقار کا بڑا خیال رکھتے تھے، سیٹھ شیام لال کی اس حرکت سے کافی متاثر ہوئے ہیں۔ انہوں نے کہا، اچھا! دو ایک روز بعد۔ جب ہم واپس جا رہے تھے تو قائداعظمؒ نے مجھے روکا اور کہا: کرپلانی! تم نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ میں اس سطح کے مقدمہ میں پیش ہونے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ بہرحال اب کچھ کرنا ہوگا۔

قائداعظمؒ پیش ہوئے۔ پہلی ہی پیشی پر، ایک ہی دلیل نے کیسری چند کو بری کرادیا۔ ورنہ اسے طویل قید ہوسکتی تھی۔

اس کیس میں بھی قائداعظمؒ اصولوں اور اخلاقی تقاضوں کی پروا کئے بغیر فیس کے لئے کیس لڑتے نظر نہیں آتے۔ ہاں، اگر وہ آمادہ ہوئے تو انسانی ہمدردی کے تحت۔ اگر قائداعظمؒ لالچی ہوتے یا بددیانتی کی ہلکی سی ہوا نے بھی انہیں چھوا ہوتا تو پہلی ہی پیشی میں فیصلہ نہ ہوتا۔

8 اگست 1943ء۔ بڑودہ کے ایک وکیل رسول خاں ایچ پٹھان نے لال منڈوا کے ٹھاکر شری بالا میاں کی طرف سے قائداعظمؒ کو خط لکھا۔ ٹھاکر شری بالا میاں جس مسئلے پر قائداعظمؒ کا مشورہ چاہتے تھے، اس پر پٹھان نے یہ بھی لکھا ''میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اولین فرصت میں مجھے مطلع فرمائیں گے کہ ان امور کے لئے آپ کی فیس کیا ہوگی''۔ فیس کے ضمن میں قائداعظمؒ نے دوٹوک انداز میں لکھا: ''اپنی فیس کے متعلق میں اس وقت تک کچھ نہیں بتا سکتا جب تک کاغذات وصول ہونے کے بعد میں کام کے حجم کا اندازہ نہیں کرلیتا۔ بمبئی کی روایت کے مطابق میں اس قسم کے مقدمے کا بالعموم ڈھائی سو روپیہ فی گھنٹہ لیتا ہوں۔ کام کی تکمیل کے لئے درکار وقت کا میں ٹھیک ٹھیک حساب رکھتا ہوں۔ بہرکیف، کاغذات وصول ہونے کے بعد ہی میں فیس کے متعلق کچھ بتا سکوں گا۔

اس کے بعد یہ کام آپ مجھے تفویض کریں گے''۔

یہاں بھی قائداعظمؒ کے ہاں اصولوں اور اخلاقی تقاضوں کی سخت پابندی نظر آتی ہے۔

بہرحال، اب تک کے دستیاب مواد کے مطابق اس کے بعد قائداعظمؒ کو اگر کسی نے اپنے دفاع میں پیش ہونے کے لئے وکیل کرنا چاہا یا ان سے قانونی مشاورت کا طلب گار ہوا، قائداعظمؒ نے انکار کردیا۔ کیونکہ قیام پاکستان کی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکی تھی اور قائداعظمؒ فیس کے لالچ میں ہندوستان کو مسلمانوں کے لئے سپین بنتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ حتیٰ کہ محمد ایوب کھوڑو، جن کے ساتھ قائداعظمؒ کے بہت اچھے تعلقات تھے، قائداعظمؒ نے ان کی طرف سے پیش ہونے سے بھی انکار کردیا۔

سندھ کے سابق وزیراعظم الہ بخش سومرو کے قتل میں محمد ایوب کھوڑو کو ملوث کیا گیا۔ وہ اس وقت سر غلام حسین ہدایت اللہ کی کابینہ میں تھے۔ انہوں نے 25 ستمبر 1944ء کو وزارت سے استعفا دیدیا۔ انہیں جیل بھیج دیا گیا۔ الہ بخش مرڈر کیس کی ابتدائی سماعت میں چارجز فریم ہوئے اور باقاعدہ سماعت کے لئے کیس سیشن کورٹ میں بھیج دیا گیا۔ ایوب کھوڑو نے 23 فروری 1945ء کے روز سپیشل جیل سکھر سے قائداعظمؒ کو تار دیا۔ اس میں ان سے استدعا کی کہ سیشن کورٹ میں وہ ان کی طرف سے پیش ہوں۔ سندھ کے بہترین وکلا ان کی معاونت کے لئے حاضر ہوں گے۔ اور میں آپ کی خواہش کے مطابق فیس ادا کروں گا۔ قائداعظمؒ نے اگلے روز بذریعہ تار انہیں مطلع کیا کہ وہ وکالت چھوڑ چکے ہیں۔ عوامی مصروفیات اور آل انڈیا مسلم لیگ کی مصروفیات اور کام کے دباؤ کے باعث ان کے لئے ایسی پیشہ ورانہ ذمہ داری قبول کرنا ممکن نہیں رہا۔ لیکن مجھے واثق امید ہے کہ آپ باعزت بری ہوں گے۔

جسے فیس کا لالچ ہو اور اس لالچ میں اصول اور اخلاقی تقاضے کوئی اہمیت نہ رکھتے ہوں، وہ ایسا کرے گا؟ بلکہ قائداعظمؒ نے الٹا ایوب کھوڑو کو تسلی دی کہ وہ باعزت بری ہوں گے۔ ایسا ہی ہوا محمد ایوب کھوڑو باعزت بری ہوئے اور قائداعظمؒ نے 3 اگست 1945ء کو بذریعہ تار انہیں مبارکباد دی۔ اور مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ نے اپنی اور قائداعظمؒ کی طرف سے مسز کھوڑو کو مبارکباد کا تار دیا۔

تحریر پہلے ہی خاصی طویل ہو چکی ہے۔ چاہوں تو اس پر کتاب لکھ ڈالوں۔ یہیں ختم کرتا ہوں، قائداعظمؒ کے شدید سیاسی مخالف کے ایل گابا کے ان ریمارکس کے ساتھ: ''وکیل کی حیثیت سے بھی وہ عالی مرتبہ تھے۔ اپنے مؤکل کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاتے اور پیشہ ورانہ دیانت داری میں بلند مقام حاصل کیا''۔

(روزنامہ خبریں لاہور 28،29 دسمبر 2008ء)



قائداعظمؒ

قائداعظمؒ اور مغربی لباس

روزنامہ نوائے وقت لاہور - 21 جولائی 2009ء - ایک خبر کے مطابق نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کے زیر اہتمام ایوان کارکنانِ تحریکِ پاکستان شاہراہِ قائداعظم لاہور میں نظریاتی سمر سکول کے بائیسویں دن طالب علموں سے خطاب کرتے ہوئے ممتاز دانشور، نظریۂ پاکستان ٹرسٹ کے چیف کوآرڈینیٹر میاں عزیزالحق قریشی نے کہا ہے" قائداعظمؒ نے ہمیشہ مغربی لباس پہنا، لیکن قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ہمیشہ قمیض، شلوار، اچکن اور قراقلی ٹوپی پہنی اور اپنی شناخت مکمل طور پر مشرقی کر لی۔ انہوں (یعنی میاں عزیزالحق قریشی) نے طلبا کو نصیحت کی کہ آپ اپنا قومی لباس پہنیں اور کبھی غیروں کی نقل نہ کریں ۔

یہ پہلا موقعہ ہے نہ میاں عزیزالحق قریشی پہلے فرد ہیں جنہوں نے پبلکلی اس بات پر زور دیا ہے کہ قائداعظمؒ نے قیام پاکستان کے بعد مغربی لباس پہننا ترک کر دیا تھا، اس لئے پوری قوم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے۔ لاہور کے ایک ڈاکٹر اختر علی تو اس مؤقف میں خاصی شہرت اور شناخت رکھتے ہیں۔ موقع بہ موقع اور تقریباً ہر قومی دن پر ان کا اس نوع کا بیان اخبارات میں شائع ہوتا ہے کہ قائداعظمؒ نے قیام پاکستان کے بعد مغربی لباس ترک کر دیا تھا، اس لئے پوری قوم کو اس امر کی پیروی کرنی چاہئے۔

یہ حقیقت سے سراسر اغماض اور اس کا منہ چڑانا ہے، کیونکہ قائداعظمؒ نے بطور گورنر جنرل آف پاکستان اگرچہ قومی تقریبات میں قومی لباس کو ترجیح دی، لیکن انہوں نے مغربی لباس یکسر ترک کیا نہ اس سے نفرت کی۔ سب سے بڑی شہادت کے طور پر وہ تصاویر موجود ہیں جن میں بانی پاکستان، فادر آف دی نیشن، گورنر جنرل آف پاکستان اور قوم کے قائداعظمؒ کی حیثیت سے وہ مغربی لباس اسی نفاست اور چاہت سے پہنے ہوئے ہیں جو ان کی شناخت تھی۔ میں ان تمام تر مواقع کی تفصیل بیان نہیں کر رہا، جب قائداعظمؒ نے قیام پاکستان کے بعد مغربی لباس پہنا، کہ اس کے لئے بہت مشقت درکار ہے۔ اس ذیل میں میں نے اپنے ذخیرے کا صرف ایک گوشہ چھیڑا، جو ہاتھ لگا اس پر یہ تحریر استوار کر لی:-

گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کے اولین تینوں اے ڈی سیز میں سے ایک (تب) فلائٹ

لیفٹیننٹ عطا ربانی نے اپنی یادداشتوں پر مبنی کتاب WAS THE QUAID'S A.D.C I میں وہ تصویر بھی شائع کی ہے جو اکثر مختلف کیپشنز کے ساتھ اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہے۔ اس تصویر کے کیپشن میں مصنف نے لکھا ہے: ''11 اگست 1947ء۔ قائداعظمؒ دستور ساز اسمبلی کی طرف جا رہے ہیں۔ مصنف اور نوابزادہ لیاقت علی خاںؒ ان کے دائیں بائیں ہیں''۔ عطا ربانی نے یہی تصویر اسی کیپشن کے ساتھ اپنی ایک اور تصنیف THE SUN SHALL RISE میں بھی دی ہے۔ اس تصویر میں لیاقت علی خاںؒ اچکن، پاجامے، چپل اور ٹوپی میں ملبوس ہیں۔ قائداعظمؒ ننگے سر ڈبل بریسٹ سوٹ اور اپنے پسندیدہ شمر شوز پہنے ہوئے ہیں۔ یہی وہ تاریخی تقریر ہے جس میں قائداعظمؒ نے فادر آف دی نیشن، بانی پاکستان اور پاکستان دستور ساز اسمبلی کے صدر کی حیثیت سے قوم کا قبلہ متعین کر دیا تھا، جو بلاشبہ ہمارا میگنا کارٹا ہے۔ ہماری اسلامی تاریخ میں میثاقِ مدینہ کو زبردست اہمیت حاصل ہے۔ میثاقِ مدینہ پڑھیں اور پھر قائداعظمؒ کی 11 اگست 1947ء والی تقریر ملاحظہ کریں، یہ میثاقِ مدینہ کا ہی پرتو نظر آئے گی۔

میثاقِ مدینہ کی بعض شقوں پر استوار یہ تقریر قائداعظم محمد علی جناحؒ نے بطور بانی پاکستان اور بابائے قوم مغربی لباس پہن کر کی تھی۔ کیا ہمیں اپنے اس میگنا کارٹا سے محض اس لئے پہلوتہی کر لینی چاہئے کہ اسے قائداعظمؒ نے شلوار، اچکن اور قراقلی ٹوپی پہن کر ادا نہیں کیا تھا۔ پھر تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے۔

پاکستان کے ابتدائی ارکانِ کابینہ کے ساتھ قائداعظمؒ کی ایک تصویر اکثر اخبارات میں شائع ہوتی ہے۔ اس میں فضل الرحمٰن، غلام محمد، آئی آئی چندریگر اور سردار عبدالرب نشتر اچکن کے ساتھ پاجامے یا شلوار میں ملبوس ہیں؛ قائداعظمؒ، لیاقت علی خاںؒ اور پیرزادہ عبدالستار مغربی لباس میں ہیں۔ یہ تصویر آفیشل ہے۔ اسے قائداعظمؒ کے دور میں ہی سرکار کی طرف سے تیار کرایا اور شائع کیا گیا۔

27 ستمبر 1947ء۔ قائداعظمؒ نے ولیکا ٹیکسٹائل ملز لمیٹڈ کراچی کے سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب کے موقعہ پر اپنے خطاب میں کہا: ''مجھے یہ امید بھی ہے کہ آپ اپنے کارخانے کی منصوبہ بندی کرتے وقت کارکنوں کے لئے مناسب رہائشی انتظامات اور دیگر سہولتوں کی فراہمی بھی پیش نظر رکھیں گے، کیونکہ مطمئن کارکن کے بغیر کوئی صنعت فروغ نہیں پاسکتی''۔

قائداعظمؒ نے مزدوروں کے لئے رہائشی اور دیگر سہولتوں کی فراہمی کے لئے کارخانہ داروں کو تلقین کی تو اس وقت شلوار، اچکن اور قراقلی ٹوپی کے بجائے وہ ڈبل بریسٹ سوٹ اور شمر شوز میں ملبوس تھے۔

11 اکتوبر 1947ء۔ قائداعظمؒ نے سوٹ میں ملبوس پاکستان کے سول، بری، بحری اور فضائیہ کے افسروں سے خالقدینا ہال کراچی میں اپنے خطاب میں یہ بھی کہا: ''ہماری اس مملکت کی تشکیل بذات

خود منزل نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کا ذریعہ ہے''۔ نوزائیدہ پاکستان کو درپیش مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے کہا: ''یہ ہم سے کام، کام اور زیادہ کام کی متقاضی ہے''۔ اور یہ بھی کہ ''اس نئی مملکت کی خوشنما تعمیر میں اپنی اہلیت دکھانے کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک عظیم موقعہ دیا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو، دنیا کہے کہ ہم اس قابل ہی نہ تھے''۔

قائداعظمؒ اواخر اکتوبر 1947ء لاہور آئے۔ اس قیام کے دوران میں جب وہ لاہور میں مہاجرین کا والٹن کیمپ وزٹ کرنے جا رہے تھے ان کی کار کو دور سے آتا دیکھ کر لٹے پٹے، زخم خوردہ اور دکھی مہاجرین نے ان کی طرف دوڑ لگا دی اور فضا قائداعظمؒ زندہ باد کے نعروں سے معمور کر ڈالی۔ قائداعظمؒ نے یہ نعرے سن کر کہا: ''یہ ابھی بھی قائداعظمؒ زندہ باد چلا رہے ہیں''۔

ان دکھی انسانوں کو اپنے قائدؒ کے مغربی لباس سے کوئی غرض نہ تھی، ان کی دیانتدار قیادت اب بھی ان کی آس تھی۔ والٹن مہاجر کیمپ لاہور میں جناب ایف ای چودھری المعروف چاچا چودھری، جن کا 15 مارچ 2009ء کو 100واں یوم پیدائش منایا گیا، کی بنائی ہوئی اس تصویر میں قائداعظمؒ کے ساتھ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کے علاوہ وزیر مہاجرین پنجاب میاں افتخارالدین اور کمشنر بحالیات عطا محمد لغاری بھی کھڑے ہیں۔

اسی قیام لاہور کے دوران میں ان کے اعزاز میں لارنس گارڈنز (اب باغ جناح) کے روز گارڈن (اب گلستانِ فاطمہ) میں استقبالیہ دیا گیا۔ قائداعظمؒ روز گارڈن کی سیڑھیاں اتر رہے ہیں اور سیاہ سوٹ میں ملبوس ہیں۔ ان کے بائیں ہاتھ وزیراعلیٰ پنجاب نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ ہیں۔ اس تقریب کی ڈاکٹر ریاض علی شاہ نے مووی بھی تیار کی تھی۔

دسمبر 1947ء کی ایک شام قائداعظمؒ کراچی میں بھارت سے آئے ہوئے مسلمان مہاجرین کا کیمپ وزٹ کرنے جاتے ہیں۔ ڈپٹی کمشنر سید ہاشم رضا بھی ہمراہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''شام کے وقت ہم مسلمانوں کے ایک کیمپ آرٹیلری میدان سکول میں گئے۔ یہاں پانچ ہزار کے قریب مسلمان مہاجر جمع تھے، جو دہلی سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ ان لوگوں نے اپنی داستانِ غم بیان کی اور ہر کوئی اپنے ان عزیزوں کا ماتم کر رہا تھا جسے اس کی آنکھوں کے سامنے تہ تیغ کیا گیا۔ قائداعظمؒ ان کے روح فرسا واقعات سن رہے تھے اور میں قائدؒ کی نگاہوں میں آنسوؤں کی جھلک دیکھ رہا تھا۔ انہیں اپنے جذبات پر بڑا قابو تھا، اس لئے انہوں نے آنسو ٹپکنے نہ دیے۔ وہ آنکھوں میں ہی تیرتے رہے۔ انہوں نے فرمایا: ''آپ لوگوں نے جو قربانیاں دی ہیں اور آپ کے عزیزوں کا جو خون بہا ہے اس سے

پاکستان کی عمارت کی بنیاد پڑی ہے اور مجھے پوری امید ہے کہ ان قربانیوں کا صلہ آپ کے بچوں کو ملے گا''۔ (''آتش فشاں'' قائداعظم نمبر دسمبر 1976ء۔صفحہ 296۔کالم 2)

آرٹیلری میدان مہاجر کیمپ کی تصویر بھی اکثر اخبارات میں چھپتی ہے۔قائداعظمؒ مغربی لباس میں ملبوس ہیں۔

25 جنوری 1948ء۔ خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کے سلسلے میں قائداعظمؒ نے بار ایسوسی ایشن کراچی کی اس تقریب میں شرکت کی، جس میں انہوں نے یہ بھی کہا: ''آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔آپؐ کی عزت و تکریم کروڑوں عام انسان ہی نہیں کرتے، بلکہ دنیا کی تمام عظیم شخصیتیں آپؐ کے سامنے سر جھکاتی ہیں۔ میں ایک عاجز ترین، انتہائی خاکسار، بندۂ ناچیز اتنی عظیم، عظیموں کی بھی عظیم ہستی کو بھلا کیا اور کیسے نذرانۂ عقیدت پیش کرسکتا ہوں۔رسول اکرمؐ عظیم مصلح تھے، عظیم رہنما تھے، عظیم واضع قانون تھے، عظیم سیاست دان تھے، عظیم حکمران تھے''۔

اس موقع کی تصاویر بھی اکثر اخبارات میں چھپتی ہیں۔قائداعظمؒ نے کمبی نیشن پہن رکھا ہے۔ کوٹ، پتلون، نکٹائی اور شمر شوز۔

2 فروری 1948ء۔ بنگال آئل ملز کراچی کی افتتاحی تقریب سے خطاب کے دوران میں بھی قائداعظمؒ نے مغربی لباس پہن رکھا تھا۔

ڈینٹسٹ ڈاکٹر ولی موراج کا کلینک کراچی صدر میں الیکٹرک ہاؤس والی بلڈنگ میں تھا۔دانت میں تکلیف کے سلسلے میں گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ وہاں گئے۔لوگوں کو پتہ چلا تو ہزاروں افراد کلینک کے باہر جمع ہوگئے۔فوٹوگرافر بھی آگئے۔قائداعظمؒ سیکورٹی آفیسر سے ناراض ہوئے: ''یہ تو موقعہ نہیں تھا کہ جب میں دانت کو یہ کرا کے نکلا تو میرا فوٹو لے''۔میرے پاس اس موقعہ کی تصویر پر 6 فروری 1948ء درج ہے۔قائداعظمؒ کے ساتھ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ، ایک اے ڈی سی ایس ایم احسن اور ان سب کے پیچھے ڈاکٹر ولی موراج ہیں۔سب کلینک کی سیڑھیاں اتر رہے ہیں۔قائداعظمؒ ہلکی لائنوں والے ڈبل بریسٹ سوٹ اور شمر شوز میں ملبوس ہیں۔

14 فروری 1948ء۔ قائداعظمؒ نے سبی دربار سے خطاب کیا۔سبی دربار سے تو انہوں نے قومی لباس میں خطاب کیا، لیکن اس وزٹ کے دوران کی ان کی ایک تصویر ہے جس میں مغربی لباس پہنے ہوئے ہیں، سیاہ کوٹ پتلون اور نکٹائی۔بلوچستان مسلم لیگ نیشنل گارڈز کے چیف ملک جان محمد انہیں ٹوپی پیش

کرر ہے ہیں۔

بی سے روانگی کے موقعہ پر انہوں نے جو پریس کانفرنس کی اس میں بھی وہ کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہیں۔

19 مارچ سے 29 مارچ 1948ء۔ قائداعظمؒ مشرقی پاکستان (تب مشرقی بنگال) کے دورے پر رہے۔ اس دوران میں قائداعظمؒ کی آمد کی خوشی میں بنگالیوں نے گھروں پر چراغاں کئے رکھا۔ فضا قائداعظمؒ زندہ باد کے نعروں سے معمور رہی۔ قائداعظمؒ شہر میں نکلتے تو لوگوں کے ٹھٹ لگ جاتے۔ عوام ان کی گاڑی کے پیچھے دیوانہ وار بھاگتے۔ ایک تصویر بتاتی ہے، اس دوران میں انہوں نے مغربی لباس اور جناح کیپ میں دریائے کرنافلی کی سیر کی۔

بطور گورنر جنرل قائداعظمؒ نے 11 سے 21 اپریل 1948ء تک صوبہ سرحد کا دورہ کیا۔ اس دوران میں وہ 14 اپریل کو لنڈی کوتل بھی گئے۔ لنڈی کوتل قلعہ میں ملک ولی خاں کوکی خیل نے ان کی خدمت میں خیبر ساختہ رائفل پیش کی۔ قائداعظمؒ سوٹ اور جناح کیپ میں ملبوس ہیں۔ اس موقعہ پر قلعہ میں ملیشیا کے ایک جوان نے ان کی خدمت میں ان کی ایک تصویر پیش کرتے ہوئے اس پر ان کے دستخط کی خواہش کی۔ تصویر میں قائداعظمؒ اپنی جس تصویر پر آٹوگراف ثبت کررہے ہیں وہ کلوز اپ نکٹائی اور جناح کیپ پرمبنی ہے۔ یہ وہی تصویر ہے جو کئی برس تک ہمارے کرنسی نوٹوں کی زینت رہی۔

قائداعظمؒ پاک افغان سرحد پر بھی گئے۔ اس کا چشم دید حال مرحوم این ایچ ہاشمی کی زبانی:

''پاکستان بننے کے بعد میں پشاور ریڈیو سے وابستہ تھا۔ اپریل 1948ء میں قائداعظمؒ وہاں تشریف لائے تو مجھے ان کے ساتھ رپورٹنگ کی سعادت ملی۔ ان دنوں کرنل بیکن خیبر میں پولیٹیکل ایجنٹ اور صاحبزادہ کرنل خورشید قبائل کے پولیٹیکل ریذیڈنٹ تھے۔ گورنر سرحد ایمر اس ڈنڈاس تھے۔ قائداعظمؒ قبائلی علاقے میں تشریف لے گئے تو راستے میں پٹھان جگہ جگہ انہیں روک کر پاکستان اور ان کے ساتھ اپنی عقیدت، محبت اور ایثار پسندی کا مظاہرہ کرتے۔ ایک موقع پر چند پٹھان کچھ جذباتی سے ہوئے تو قائداعظمؒ نے فرمایا، ''دیکھو مرنا تو کتنا بھی ہے۔ آپ اس ملک کی تعمیر وترقی کے لئے زندہ رہیں''۔

''قائداعظمؒ پاکستان وافغانستان کی سرحد طورخم تک گئے۔ افغانستان کے فوجیوں کو ان کی آمد کا علم ہوا تو وہ سب دو تین فرلانگ دور سے بھاگ کر زنجیر کے پاس دیدارِ قائدؒ کے لئے کھڑے ہوگئے۔ وہ قائداعظمؒ سے ہاتھ ملانے کی سعادت پانے میں بہت بے چین ہوئے۔ قائداعظمؒ نے صاحبزادہ خورشید سے پاکستان کے متعلق ان کی رائے پوچھنے کو کہا۔ صاحبزادہ صاحب نے پشتو میں ان سے بات کی تو

افغان سپاہیوں نے پشتو میں جواب دیا، ''ہم خوش ہیں کہ مسلمان آزاد ہوگئے''۔ قائداعظمؒ نے صاحبزادہ سے کہا، ''انہیں بتادو۔ ہم بھی بڑے خوش ہیں کہ ہمارے اس طرف مسلمان ہمسایہ ہیں''۔

''قائداعظمؒ نے دور پہاڑوں تک نظر ڈالی اور ایک دومنٹ کے لئے کسی گہری سوچ میں گم ہوگئے۔ قائدؒ اس وقت بالکل ایک مفکر کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ پھر محترمہ مس فاطمہ جناحؒ کے ساتھ گجراتی زبان میں کوئی بات کی''۔ (آتش فشاں۔ قائداعظمؒ نمبر۔ دسمبر 1976ء۔ صفحہ 284۔ کالم 2)۔

پاک افغان سرحد پر افغان سپاہیوں کے ساتھ قائداعظمؒ کے ہاتھ ملانے کی تصویر اکثر اخبارات میں شائع ہوتی ہے۔ اس تصویر کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ ساتھ گئے ہوئے سرکاری فوٹوگرافر زیڈ اے برنی نے یہ تصویر نہ بنائی۔ مجھے قائداعظمؒ کے مرحوم سیکورٹی آفیسر نے بتایا تھا، انہوں نے برنی سے کہا، قائداعظمؒ یہ تصویر ضرور مانگیں گے کیونکہ اس میں اسلامی اخوت کا جذبہ ہے۔ ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ انہیں یہ تصویر پریس فوٹوگرافر سے لے کر قائداعظمؒ کی خدمت میں پیش کرنا پڑی۔ اس تصویر میں اسلامی اخوت کا جذبہ فروزاں ہے۔ اس موقعہ پر قائداعظمؒ مغربی لباس اور جناح کیپ میں ہیں۔

18 اپریل 1948ء۔ ایڈورڈز کالج پشاور میں قائداعظمؒ نے طلبا سے خطاب کیا۔ اور انگریزی سوٹ میں ملبوس یہ بھی کہا: ''آج میں یہاں بہتر حالات اور معاملات دیکھ کر خوش ہوں۔ اس سے زیادہ کسی کو حقیقتاً کیا توقع ہوسکتی ہے کہ یہ شہ زور سرزمین بحیثیت ایک خودمختار اور آزاد مملکت کے اب ایک ایسے قانون کے تحت لائی جاچکی ہے جو اسلامی ہے، مسلم ہے۔ اب ہمیں اس سے بھی زیادہ مشکل کام کا سامنا ہے — اس مملکت کی تعمیر نو اور اٹھان کس طرح کرنی ہے۔ اور اس میں ماضی کے ان ورثوں میں کس طرح انقلاب لانا اور ان کی تعمیر نو کرنی ہے، جن میں ہم مبتلا رہے۔ مثلاً: ذہنیت، چلن اور بری رسوم جن کا ہم ایک صدی یا اس سے بھی زیادہ عرصہ بطور غلام شکار رہے..... ''۔ (سپیچز، سٹیٹمنٹس اینڈ میسجز آف دی قائداعظمؒ۔ مرتبہ: خورشید احمد خاں یوسفی۔ جلد: چہارم۔ صفحہ: 2761۔ سن اشاعت 1996ء۔ پبلشر: بزم اقبال 2 کلب روڈ لاہور)۔

صوبۂ سرحد کے اسی دورے کی ایک تصویر میں قائداعظمؒ مغربی لباس میں کرسی میں تشریف فرما ہیں۔ ان کے سامنے جو لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہیں ان میں سردار بہادر خاں، محمد علی ہوتی اور ارباب نور محمد بھی ہیں۔

کوئٹہ: 13 جون 1948ء۔ پارسی کمیونٹی کوئٹہ کے ایک وفد نے قائداعظمؒ سے ملاقات کی۔ تصویر کے مطابق، قائداعظمؒ سوٹ میں ملبوس صوفے میں تشریف فرما ہیں۔

14 جون 1948ء۔ سٹاف کالج کوئٹہ میں انہوں نے فوجی افسروں سے خطاب کیا۔ اس تقریر میں

انہوں نے ان کے حلف نامے کی عبارت بھی دہرائی جس میں ہر فوجی افسر آئین، حکومت اور ڈومینین آف پاکستان کے ساتھ وفاداری کا عہد کرتا ہے اور آخر میں کہا، "جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ جذبہ ہی اصل چیز ہے جو اہمیت رکھتا ہے۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ آئین اور ڈومینین کے وفادار رہیں گے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ پاکستان میں نافذ العمل موجودہ آئین کا مطالعہ کریں اور اس کے صحیح آئینی اور قانونی منشا اور معانی کو سمجھیں"۔

قائداعظمؒ نے گورنر جنرل آف پاکستان، بانی پاکستان اور فادر آف دی نیشن کی حیثیت سے فوجی افسروں کو آئین اور اس کے تحت قائم جمہوری حکومت کے احکامات پر عمل کرنے اور سیاست اور اقتدار سے دور رہنے کی تلقین وہدایت اور تنبیہہ مغربی لباس میں کی تھی۔

کراچی 2 جولائی 1948ء۔ قائداعظمؒ مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کے ساتھ حکومت پاکستان کی ایک دستاویزی فلم دیکھنے کے لئے کراچی صدر کے پیراڈائز سینما میں آتے ہیں، جہاں وزیر اطلاعات و داخلہ خواجہ شہاب الدین ان کا استقبال کرتے ہیں۔ اس تصویر میں بھی قائداعظمؒ مغربی لباس اور اپنے پسندیدہ ٹمر شوز پہنے ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض تصاویر کی رو سے، انہوں نے پاکستان ریڈ کراس سوسائٹی کی کراچی میں صدارت سوٹ پہن کر کی۔ کراچی میں ہی ایک ڈپلومیٹک ریسپشن میں وہ ڈبل بریسٹ سوٹ زیب تن کئے ہوئے ہیں۔ ایک اور تصویر میں وہ فوجیوں کے ساتھ مصافحہ کے دوران میں ڈبل بریسٹ سوٹ، ٹمر شوز اور جناح کیپ پہنے ہوئے ہیں۔ برمی سفیر سے اسنادِ سفارت وصول کرتے وقت بھی قائداعظمؒ سوٹ میں ملبوس ہیں۔ گورنر جنرل ہاؤس کراچی میں قائداعظمؒ سیاہ سوٹ میں مصر کے چارجڈی افیئرز الحسین الخطیب کے ساتھ ایک ہی صوفے پر بیٹھے بات چیت کر رہے ہیں۔ ایک اور تصویر میں قائداعظمؒ سوٹ میں ملبوس میجر ایس اے حمید سمیت تین فوجی اتھلیٹس کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں۔ ایک تصویر میں قائداعظمؒ پاکستان نیوی کے پہلے سربراہ جیمز ولفریڈ جیفرڈ (James Wilfred Jefford) کے ساتھ مصروف گفتگو ہیں۔ قائداعظمؒ نے مغربی لباس پہن رکھا ہے۔

میرے پاس ایک اور تصویر ہے جس میں وہ بطور گورنر جنرل پاکستان میں متعینہ مصری سفیر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام کے ساتھ گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ گفتگو خصوصی اہمیت کی حامل لگتی ہے، کیونکہ دونوں کی کرسیاں ساتھ ساتھ ہیں۔ قائداعظمؒ سفید یا آف وائٹ سوٹ اور سفید چپل پہنے ہوئے ہیں۔

بہت عرصہ پہلے میں نے کسی اخبار میں اس نوع کا مضمون پڑھا تھا، قائداعظمؒ کے پاس سارے

سوٹ پرانے تھے۔اس لئے اس مؤقف کے دعویدار کہ قائداعظمؒ نے قیام پاکستان کے بعد مغربی لباس ترک کر دیا تھا، کہہ سکتے ہیں، قائداعظمؒ نے قیام پاکستان کے بعد کوئی پتلون کوٹ نہیں سلوایا تھا۔ یہ تو ان کے پاس پرانے پڑے ہوئے سوٹ وغیرہ تھے جو وہ کبھی کبھار استعمال کرتے رہے۔ ایسی دلیل بھی غلط ہوگی، کیونکہ قیام پاکستان کے بعد بھی وہ نئے سوٹ سلواتے رہے۔ ان کے ایک ابتدائی اے ڈی سی عطا ربانی کے بقول ان کے ''کپڑوں کا انتخاب عمدہ اور سلائی نفیس ہوتی، اور دو تین مرتبہ سوٹ ٹرائی کرتے۔ کوٹ کے کف کے کتنے بٹن ہونے چاہئیں، ان کا درمیانی فاصلہ کتنا ہو، اس میں بھی پوری دلچسپی لیتے'' (آتش فشاں، قائداعظمؒ نمبر دسمبر 1976ء۔ صفحہ 292۔ کالم 1)۔

کیپٹن این اے حسین 29 جون 1948ء سے 11 ستمبر 1948ء تک یا دوسرے لفظوں میں قائداعظمؒ کی زندگی کے آخری 75 ایام میں ان کے اے ڈی سی رہے۔ وہ بتاتے ہیں: ''کراچی میں انہوں نے حمید ٹیلرز سے بھی سوٹ سلوایا''۔ (ایضاً۔ صفحہ 317۔ کالم 1)۔

''قائداعظمؒ زیارت میں بھی معاملاتِ مملکت میں دن رات مصروف رہنے لگے۔ سوٹ پہن کر کام کے لئے صوفے پر بیٹھ جاتے یا چارپائی پر تکیے کی ٹیک لگا لیتے۔ جب زیادہ ہی تھک جاتے تو لیٹ جاتے، لیکن کام جاری رہتا۔ وفات سے ایک ہفتہ پہلے تک کام جاری رکھا''۔ (ایضاً۔ صفحہ 318۔ کالم 2)۔

گویا آخری وقت تک قائداعظمؒ اپنے لئے مغربی لباس تیار کرواتے رہے اور استعمال بھی کرتے رہے۔ پس ثابت ہوا، قائداعظمؒ نے قیام پاکستان کے بعد بھی ہمیشہ شلوار، اچکن اور قراقلی ٹوپی نہیں پہنی اور اپنی قیام پاکستان سے پہلے والی شناخت بھی قائم رکھی۔

اس میں ہرج والی کونسی بات ہے۔ پتلون کوٹ غیر اسلامی لباس نہیں۔ کوئی بھی لباس تراش خراش اور ڈیزائن کے حوالے سے اسلامی ہوتا ہے نہ غیر اسلامی۔ اسلام نے لباس کے اصول وضع کئے ہیں کہ اس میں ستر پوشی اور حیاداری ہو۔ کسی خاص فیشن یا ڈیزائن کے لباس پر زور نہیں دیا اس لئے کہ لباس کے رواج کے پیچھے تاریخ، جغرافیے، موسمی حالات اور تہذیبوں اور ثقافتوں کے ملاپ اور مختلف قوموں کے میل جول کے اثرات ہوتے ہیں۔

اسلام، جو دین فطرت ہے، کیسے انسانوں کو ایک خاص ڈیزائن کے لباس کا پابند کر سکتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ شلوار، اچکن اور قراقلی ٹوپی مشرقی لباس ہے تو ہم وضاحت نہیں کرتے کہ کب سے یہ لباس مشرقی ہوئے۔ ترکوں، افغانوں اور مغلوں کی آمد سے قبل یہاں کا لبادہ دھوتی اور لنگوٹی تھا۔ پھر تو مشرقی لباس دھوتی اور لنگوٹی ہوئے۔ آپ لباس کے معاملے میں ارتقائی عمل کو شلوار، اچکن اور قراقلی ٹوپی

پر آ کے کیوں روک لیتے ہیں۔ اور یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے برصغیر میں پھیلے ہوئے کروڑوں مسلمانوں کے بے ہنگم اور بے ترتیب غول کو قوم کا روپ بھی مغربی لباس پہن کر دیا تھا۔

1916ء میں آل انڈیا مسلم لیگ اور انڈین نیشنل کانگریس میں جو لکھنؤ پیکٹ ہوا وہ برصغیر کی سیاسی تاریخ بالخصوص مسلم لیگ کے علیحدہ تشخص اور مسلمانوں کی واحد نمائندہ تنظیم تسلیم کئے جانے کے حوالے زبردست اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں لکھنؤ میں جو اشتہارات نکالے گئے ان میں مولانا محمد علی جناح لکھا گیا۔ قائداعظمؒ کان پور ریلوے سٹیشن پہنچے، جہاں لکھنؤ کے لئے سپیشل ٹرین کا انتظام کیا گیا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے آفس سیکرٹری مرحوم سید شمس الحسن لکھتے ہیں:

''ہلکے بادامی رنگ کے سوٹ میں ملبوس قائدؒ ایک مولانا کی بجائے یورپی دکھائی دے رہے تھے۔ ان کی شخصیت کے ساتھ ''مولانا'' کا راسخ العقیدہ تصور چسپاں کرنا یقیناً الجھن کا باعث بنا۔ ہم سب متفکر ہوئے کہ اشتہارات کے ذریعے جو تصور پیدا ہو چکا ہے اسے برقرار رکھنے کے لئے کیا کیا جائے۔ کئی تجویزیں سامنے آئیں۔ ان میں سے ایک تو یہ تھی کہ قائدؒ شروانی پہن لیں، جو قائدؒ کے پاس نہیں تھی۔ سید وزیر حسن از حد حیران ہوئے کہ آیا ایک دن میں شروانی تیار ہو سکتی ہے۔ یہ بات قائدؒ نے سن لی۔ جب انہیں صورت حال سے آگاہ کیا گیا تو وہ محظوظ ہوئے۔ تاہم انہوں نے کوئی ایسا لباس پہننے سے انکار کیا جسے وہ پہننے کے عادی نہ تھے۔ (حوالہ:..... صرف مسٹر جناح۔ صفحہ 28۔ پبلشر آتش فشاں لاہور)

اسی طرح ایک دفعہ شملہ میں جلوس کے دوران میں'' قائداعظمؒ رکشا میں تھے۔ انہوں نے اپنا ہیٹ گھٹنے پر رکھا ہوا تھا۔ اس موقع پر کسی نے عرض کیا: مسلمان ہیٹ پسند نہیں کرتے، بہتر ہے آپ اسے گھٹنے سے اٹھا کر پاؤں میں رکھ لیں۔ مسلمان خوش ہوں گے۔ قائداعظمؒ نے فرمایا: ''میں کبھی بھی گاندھی کی طرح منافقت اختیار نہیں کروں گا'' اور ہیٹ گھٹنے پر سے اٹھا کر سر پر رکھ لیا''۔ (آتش فشاں۔ قائداعظمؒ نمبر دسمبر 1976ء۔ صفحہ 70۔ کالم 2)

یہی مغربی لباس پہن کر قائداعظمؒ نے انگریز اور ہندو برہمن کی عیارانہ چالوں کو شکست دے کر سب سے بڑی مسلم مملکت قائم کر دکھائی۔ پارٹیشن پلان کے سلسلے میں 3 جون 1947ء کو جب آل انڈیا ریڈیو پر انہوں نے تقریر کی اور سارا ہندوستان ریڈیو سیٹوں پر امڈا ہوا تھا، اخیر میں قائداعظمؒ نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا کر قوم کو ذہنی، فکری اور نظریاتی لحاظ سے ایک بار پھر شہ زور کر دیا۔ سارا مسلم انڈیا خوشی سے جھوم اٹھا کہ اس کی حصول پاکستان کی آشا پوری ہو رہی تھی۔ اس وقت کی تصویر اکثر اخبارات میں چھپتی ہے، قائداعظمؒ مغربی لباس میں ہیں۔ کیا ہمیں قائداعظمؒ کے تمام کارناموں اور خدمات ملی کی، عملاً تو

ہم کر ہی چکے ہیں، اعلانیہ بھی نفی کر دینی چاہئے کہ یہ چیزیں انہوں نے انگریزی لباس پہن کر کی تھیں؟

ہمارے ہاں قبل ازیں کرنسی نوٹوں پر قائداعظمؒ کا کوٹ، نکٹائی اور ٹوپی میں جو کلوز اپ چھپتا تھا، یہ تصویر کراچی کے پارسی فوٹوگرافر آئی سکویرا نے کھینچی تھی۔ قائداعظمؒ نے اس پر اسے اپنے آٹوگراف بھی دیئے تھے۔ ان کے آٹوگراف دینے کا عمل بھی کیمرے نے محفوظ کر رکھا ہے۔ ہماری ڈھلمل اور ڈھلوان سوچ کا یہ عالم ہے کہ مسلم لیگ (ن) نے اپنے زمانہ اقتدار میں ایک دفعہ اخبارات کو ایک اشتہار جاری کیا جس پر قائداعظمؒ کی تصویر دینا اس کی مجبوری تھی کیونکہ کسی بھی ''قائداعظمؒ ثانی'' کے لئے یہ مرحلہ انتہائی تکلیف دہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اشتہار میں کرنسی نوٹوں والی تصویر کو ہی ری ٹچ کر کے ٹائی اور کوٹ کو اچکن میں تبدیل کر دیا گیا۔ پتہ نہیں یہ بھول ہے یا بے دھیانی، مصلحت ہے یا پسپائی یا لاغر سوچ کہ حکومت نے بھی نئے کرنسی نوٹوں پر سے یہ تصویر ہٹا کر اس کی جگہ اچکن والا کلوز اپ دے دیا ہے۔

قصہ مختصر، جب قائداعظمؒ نے شلوار، اچکن اور قراقلی ٹوپی کے ساتھ ساتھ مغربی لباس کا استعمال بھی جاری رکھا تو نئی نسل کو کیوں کہا جاتا ہے: ''قیام پاکستان کے بعد انہوں نے ہمیشہ قمیض، شلوار، اچکن اور قراقلی ٹوپی پہنی اور اپنی شناخت مکمل طور پر مشرقی کر لی''۔

قائداعظمؒ کے اصول، ہدایات اور احکام تو ہم نے چھوڑے ہی تھے اب ان کے لباس کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑ گئے ہیں۔ قائداعظمؒ نے کوٹ، پتلون، ٹائی اور ہیٹ سے کبھی اظہارِ نفرت نہیں کیا، کبھی اسے غلامی کی یادگار قرار نہیں دیا۔ اسے پورے طمطراق سے پہنا، اس قدر کہ برصغیر کے خوش پوش ترین انسان کہلائے۔ اور یہ مغربی لباس بھی اخیر عمر تک ان کا پہناوا رہا۔

جب نظریاتی سمر سکول کے 22 دیں روز کے انہی بچوں پر جوانی یا عمر کے کسی حصے میں اصل حقیقت عیاں ہوئی، پھر ان کا تاثر کیا ہوگا؟ اس لئے بہتر ہے حقائق اور تاریخ کو اپنی خواہشات کی سان پر نہ چڑھایا جائے۔ تاریخ سے پناہ ہی مانگی جائے تو بہتر ہے۔ یہ بڑی ظالم شے ہے۔ اس کے معتبر الفاظ، حروف حتیٰ کہ شوشے تک کھرا اور کھوٹا الگ کرنے میں ہمیشہ زور آور رہے ہیں۔

(روزنامہ خبریں لاہور یکم و 2 اگست 2009ء

روزنامہ نوائے وقت لاہور 2 اگست 2009ء)

قائداعظمؒ کی تین غلطیاں۔ایک نیا شگوفہ؟

ابلاغ عامہ کی رو سے کسی کی مخالفت کرنے یا اس کی کردارکشی کا مؤثر ترین طریق یہ ہوتا ہے کہ پہلے اس شخص کی خوبیاں بیان کی جائیں۔خوبیاں بیان کرتے کرتے، بلکہ بعض اوقات زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ملاتے، اپنے اصل مقصد کی طرف آجائیں کہ اس قدر خوبیوں اور مثبت اوصاف کے باوجود اس شخص یا شخصیت میں یہ یہ خامیاں، کوتاہیاں یا غلطیاں بھی تھیں۔ پھر یہ لغزشیں یا غلطیاں اس شخصیت میں اس قدر بھاری بھر کم بنا کر پیش کر دی جاتی ہیں کہ اس کی خوبیاں ان کی تاب نہیں لاسکتیں۔یہی انداز گورنر جنرل آف پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے ایک سابقہ اے ڈی سی مسٹر عطا ربانی نے اپنی کتاب The Sun Shall Rise میں قائداعظمؒ کے متعلق اختیار کیا ہے۔کتاب کے صفحہ 10 پر Mr.Jinnah as a political saint (مسٹر جناح بطور سیاسی ولی) کی ضمنی سرخی دے کر صفحہ 15 تک، تقریباً پانچ صفحات میں، قائداعظمؒ کی خوبیاں بیان کرنے میں خاصہ زورِ قلم صرف کیا گیا ہے۔انہیں ایک سربرآوردہ شخص، غیر معمولی سٹیٹس مین اور سیاسی دانش کے حوالے کے بے مثل اور یکتا قرار دیا گیا ہے۔لیکن ان پانچ صفحات کے بعد اگلی ضمنی سرخی Three mistakes by the Jinnah (مسٹر جناح کی طرف سے سرزد ہونے والی تین غلطیاں) کے تحت صفحہ 15 سے صفحہ 18 تک، سوا تین سے زائد صفحات میں قائداعظمؒ کی ان ''تین غلطیوں'' پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن پر چند ماہ تک بعض اخبارات، زیادہ تر نوائے وقت، میں لے دے ہوتی رہی۔ رہ رہ کر یہ موضوع چھڑتا رہا، لیکن یہ ایک طرف سے جذباتیت اور دوسری طرف سے ہٹ دھرمی کی نذر ہوتا رہا۔ٹھوس دلائل اور تاریخی و واقعاتی سچائیوں اور شواہد سے فریقین دور رہے۔ جہاں ہٹ دھرمی اور جذباتیت کا غلبہ ہو وہاں یہی کچھ ہوتا ہے، نتیجتاً قاری زیر بحث موضوع پر ابجیکٹ ہونے اور معلومات پانے کے بجائے ذہنی طور پر الجھ کر رہ جاتا ہے۔

کسی جذباتیت میں گئے بغیر ہم واقعات اور شواہد کی بنا پر جائزہ لیں گے کہ مسٹر عطا ربانی نے

قائداعظمؒ کے حوالے سے ان کے جن تین فیصلوں یا اقدامات کو ان کی غلطیاں قرار دیا ہے، کیا واقعی وہ غلطیاں تھیں یا مسٹر عطار بانی انہیں غلطیاں قرار دے کر خود غلطی کا شکار ہو گئے ہیں۔

قائداعظمؒ کی پہلی غلطی کے حوالے سے عطار بانی رقم طراز ہیں: ''مسٹر جناح سے عوامی زندگی میں پہلی غلطی 15 اگست 1947ء کو سرزد ہوئی جب گورنر جنرل کی حیثیت سے انہوں نے ایک غیر منتخب بیوروکریٹ ملک غلام محمد کو وفاقی وزیر برائے خزانہ مقرر کیا۔ بعدازاں انہوں نے ایک اور غیر منتخب شخص چودھری سر محمد ظفر اللہ کو وزیر خارجہ نامزد کیا۔ یہ دونوں نامزدگیاں پارلیمینٹری پریکٹس، حتیٰ کہ خود مسٹر جناح کے جمہوری اصولوں سے ٹکراتی تھیں''۔

عطار بانی 2008ء میں غیر منتخب ملک غلام محمد اور چودھری سر ظفر اللہ خاں کی بطور وزرا تقرری پر اعتراض کرتے ہیں تو بظاہر یہ غیر جمہوری اور غیر پارلیمانی اقدام ہی دکھائی دیتا ہے، حالانکہ جب ان دو اشخاص کو وزیر خزانہ اور وزیر خارجہ نامزد کیا گیا اس وقت جو ملک میں عبوری آئین نافذ تھا اس میں ایسی کوئی شق نہیں تھی کہ غیر منتخب شخص کو وزیر نامزد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ پاکستان کے پہلے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ایوب خاں کے زمانہ اقتدار میں 62ء کا جو آئین بنایا گیا اس میں یہ تھا کہ وزیر اسمبلی کا رکن نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی رکن اسمبلی کو وزیر بنایا بھی گیا تو اسے اپنی اسمبلی کی رکنیت چھوڑنا پڑے گی اور اس حلقے میں ضمنی انتخاب ہوگا۔

جب 15 اگست 1947ء کو نافذ آئین میں وزیر بننے کے لئے اسمبلی ممبر ہونا لازمی نہ تھا تو ملک غلام محمد اور چودھری ظفر اللہ خاں کی نامزدگی کو پارلیمینٹری پریکٹس اور خود قائداعظمؒ کے جمہوری اصولوں کی ضد کیسے کہا جا سکتا ہے؟ آج کا آئین 47ء میں آپ کیوں لاگو کرتے ہیں۔ ہر چیز کو اس وقت کے سیاق و سباق میں دیکھنا چاہئے۔ جس طرح کہ صفحہ 12 پر عطار بانی لکھتے ہیں کہ 1913ء میں قائداعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی رکنیت اختیار کی۔ اس طرح وہ آل انڈیا کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ دونوں جماعتوں کے ممبر ہو گئے۔ کل کو کوئی اور عطار بانی قائداعظمؒ کی بہ یک وقت دونوں جماعتوں کی رکنیت کو بھی غیر جمہوری کہہ سکتا ہے، حالانکہ تب یہ چیز جائز اور رائج تھی۔ آج آپ بہ یک وقت دو سیاسی جماعتوں کا رکن نہیں ہو سکتے۔

عطار بانی صاحب نے آل انڈیا کانگریس لکھا ہے، اس کا نام انڈین نیشنل کانگریس تھا۔ بہر حال،

لیکن مسٹر عطا ربانی کی ان چند جملوں سے تشفی نہیں ہوتی۔ اس کے فوراً بعد وہ لکھتے ہیں: "ممکن ہے انہوں نے ملک کی بھلائی کے لئے لیجسلیچر سے باہر دستیاب ٹیلنٹ استعمال کرنے کا راستہ نکالا ہو، جس طرح کہ انہوں نے 40 کی دہائی کی جدوجہد کے دوران میں "اپنی جیب کے کھوٹے سکوں" کو موثر انداز میں استعمال کیا تھا"۔

قائداعظمؒ کو غیر معمولی سٹیٹس مین، سیاسی دانش کے حوالے سے بے مثل اور یکتا اور سیاسی ولی قرار دینے کے باوجود جب ان دو افراد کی نامزدگی پر قائداعظمؒ کے لئے عطا ربانی فرماتے ہیں: "ممکن ہے انہوں نے ملک کی بھلائی کے لئے لیجسلیچر سے باہر دستیاب ٹیلنٹ استعمال کرنے کا راستہ نکالا ہو"۔ تو اس کا مطلب ہے مسٹر عطا ربانی قائداعظمؒ کی سیاسی دانش کو بے مثل اور یکتا ماننے کے باوجود "ممکن ہے" کا شکار ہیں۔ باقی رہا کھوٹے سکوں والا معاملہ اس پر میں آگے چل کر گفتگو کروں گا۔

بقول عطا ربانی، قائداعظمؒ نے یہ نامزدگیاں 1947ء کو کیں۔ لیکن 61 برس بعد 2008ء میں اپنی اس کتاب کے ذریعے عطا ربانی تجویز دیتے ہیں: "وزیر خزانہ کے معاملے میں گورنر جنرل کے لئے دو آپشن اوپن تھے۔ ایک یہ کہ وزارتِ عظمیٰ کی ذمہ داریوں کے ساتھ نوابزادہ لیاقت علی خانؒ کو وزیر خزانہ کے طور پر بھی برقرار رکھا جاسکتا تھا۔ دوم، کسی دوسرے سیاستدان کو، جسے مالیات کی سوجھ بوجھ تھی، وزیر خزانہ مقرر کر دیا جاتا اور اس کی سر آرچ بالڈ رولینڈز (Sir Archibald Rowlands) کی سرپرستی میں تربیت کی جاتی جو ہندوستان میں وائسرائے کی کونسل کے آخری ممبر فنانس تھے، جن کی مسٹر جناح نے مشیر مالیاتی امور کے طور پر بطور خاص خدمات مستعار لی تھیں"۔

اس ضمن میں پہلی بات یہ کہ مسٹر عطا ربانی 61 برس بعد یہ تجویز کیوں دے رہے ہیں جب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر ان میں صلاحیت اور ہمت تھی تو انہوں نے یہ تجویز گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کو اس وقت کیوں نہ دی، جب وہ 15 اگست 1947ء سے ہفتہ عشرہ پہلے ہی ان کے اے ڈی سی مقرر ہو چکے تھے۔ باقی رہا لیاقت علی خانؒ کے وزارت خزانہ برقرار رکھنے کا معاملہ، تو لیاقت علی خانؒ پر پہلے ہی بڑا بھار تھا۔ وہ وزیراعظم ہونے کے ساتھ وزیر دفاع اور وزیر خارجہ بھی تھے۔ قائداعظمؒ نے چودھری ظفر اللہ خاں کی بطور وزیر خارجہ نامزدگی 25 دسمبر 1947ء کو کی تھی۔ ایسے میں یہ کیسے ممکن تھا کہ انہیں وزارت خزانہ کا اضافی محکمہ بھی دیدیا جاتا جو سراسر ٹیکنیکل اور ایک نوزائیدہ مملکت کے لئے حساس، نازک اور بھاری بھرکم ہونے کے باعث اضافی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ کل وقتی تھا، بالخصوص ایک نوزائیدہ مملکت کے لئے تو اس کے لئے ایک کل وقتی، انتھک اور ماہر فرد کی ضرورت تھی۔ ملک غلام محمد میں ان خوبیوں سے کسی کو انکار نہیں۔

لیکن ربانی صاحب کہتے ہیں کہ غلام محمد کے بجائے قائداعظمؒ کے مشیر مالیات آرچ بالڈرولینڈز کی سرپرستی میں یہ ذمہ داری کسی سیاستدان کو سونپی جانی چاہئے تھی۔ حیرت ہے انہیں غلام محمد کے غیر منتخب ہونے پر تو اس قدر شدید اعتراض ہے کہ وہ انہیں قائداعظمؒ کی ایک غلطی قرار دیتے ہیں لیکن قائداعظمؒ کے انگریز مشیر مالیات آرچ بالڈرولینڈز کو وزیرخزانہ کا سرپرست بنانے کی تجویز دیتے ہیں جبکہ مسٹر رولینڈز بھی غیر منتخب تھے، بلکہ جب وہ متحدہ ہندوستان میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں ممبر فنانس یعنی وزیرخزانہ تھے اس وقت بھی غیر منتخب تھے .کہ اس ممبرشپ یا وزارت کے لئے انتخابات جیتنا شرط نہ تھی۔

عطا ربانی صاحب معترض ہیں کہ وزیراعظم لیاقت علی خاںؒ یا آرچ بالڈرولینڈز کے بجائے غلام محمد کو یہ ذمہ داری کیوں سونپی گئی، لیکن اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ''بلاشبہ ان کا مالیاتی پس منظر تھا'' ساتھ ہی انہیں اعتراض ہے کہ فنانس بیک گراؤنڈ کے باوجود مالیات میں ''وہ نمایاں طور پر باکمال نہ تھے کہ انہیں ایک نوزائیدہ ملک کی مالیات کا سربراہ بنایا جاتا''۔ یہاں مسٹر عطا ربانی شائد یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ قائداعظمؒ سے زیادہ دانا اور جوہرشناس تھے۔ بہت خوب!

61 برس بعد یہ دور کی کوڑی مسٹر عطا ربانی ہی لا سکتے ہیں کہ ملک غلام محمد مالیات میں ''نمایاں طور پر باکمال نہ تھے کہ انہیں ایک نوزائیدہ مملکت کی مالیات کا سربراہ بنایا جاتا''۔ جبکہ قائداعظمؒ جنہیں عطا ربانی سیاسی ولی، غیر معمولی سیاسی مدبر، سیاسی دانش کے حوالے سے بے مثل اور یکتا قرار دیتے ہیں اسی نوزائیدہ مملکت کے لئے بطور وزیرخزانہ غلام محمد کی خدمات کا بطور گورنر جنرل یوں اعتراف کرتے ہیں:-

یکم اپریل 1948ء- وزیرخزانہ غلام محمد نے پاکستانی سکے اور کرنسی نوٹ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کی خدمت میں پیش کئے تو اس موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے قائداعظمؒ نے غلام محمد کے متعلق کہا: '' جس طریق پر آپ نے اور آپ کی وزارت نے ہماری نوخیز مملکت کے مالی امور ہینڈل کئے ہیں اور آپ کے انتھک انہاک اور لگن نے انہیں مضبوط بنیاد فراہم کی ہے، میں اس موقعہ پر عوامی سطح پر حکومت اور پاکستانی عوام کی طرف سے آپ کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ جب ہم نے خودمختار اور آزاد مملکت پاکستان کے لئے مطالبے کا آغاز کیا تھا، اس وقت ایسے جھوٹے پیغمبر خاصی تعداد میں تھے جنہوں نے ہمیں ہمارے طے شدہ نصب العین سے یہ کہتے ہوئے برگشتہ کرنے کی کوشش کی کہ پاکستان معاشی لحاظ سے قابلِ عمل نہیں ہوگا۔ انہوں نے ہماری مملکت کے مستقبل، اس کی مالیاتی اور اقتصادی حالت کی انتہائی تاریک تصاویر پیش کیں۔ ان جھوٹے پیغمبروں کو آپ کی طرف سے پیش کئے گئے پہلے بجٹ ہی نے صدمہ پہنچا دیا ہوگا۔ یہ بجٹ پاکستانی مالیات کے استحکام اور اسے زیادہ مضبوط اور ٹھوس بنانے

میں حکومتی عزم پہلے ہی ثابت کر چکا ہے....."۔(حوالہ: سپیچز، سٹیٹمنٹس اینڈ میسیجز آف قائداعظم۔ جلد چہارم۔صفحات: 2741، 2742۔مرتبہ: خورشید احمد خاں یوسفی۔سن اشاعت: 1996ء۔ ایڈیشن پہلا۔پبلشر: بزمِ اقبال 2 کلب روڈ لاہور)۔

ملک غلام محمد کی بطور وزیرخزانہ پاکستان کے لئے خدمات اور ان کی مالیاتی اہلیت کے قائداعظمؒ کی طرف سے اعتراف اور خراج تحسین کے بعد کسی عطا ربانی کے اس اعتراض میں کیا وزن رہ جاتا ہے:

"غلام محمد ایک بدمزاج، غیر وسیع القلب، منہ زور، پرلے درجے کا حریص اور مغرور بیوروکریٹ تھا، جس نے دوسری جنگ عظیم کے سال حکومت ہند کی سپلائی اینڈ پرچیز آرگنائزیشن میں گزارے"۔ گویا جنگ عظیم دوم کے دوران میں ملک غلام محمد کا حکومت ہند کی سپلائی اینڈ پرچیز آرگنائزیشن میں رہنا بھی ان کی ایک نااہلیت ہے، جبکہ انگریز ایسے ذمہ دار کام پر کسی اہل کو رکھتا تھا۔ حیرت تو اس پر ہے کہ غلام محمد کی بدمزاجی، ناروا داری، منہ زوری، پرلے درجے کا لالچ اور غرور قائداعظمؒ کو تو نظر نہ آیا اگر کسی کو نظر آیا تو وہ قائداعظمؒ کے سات ماہ تک اے ڈی سی رہنے والے عطا ربانی ہیں۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ انہیں غلام محمد میں یہ خامیاں قائداعظمؒ کی طرف سے ان کی تقرری کی 61 برس بعد نظر آئیں۔

اس کے ساتھ ہی ربانی صاحب کہتے ہیں: "جب اسے وزیرخزانہ مقرر کیا گیا وہ اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھا اور اپنی ذات کو سب پر حاوی سمجھنے لگا"۔

ربانی صاحب کو تو غلام محمد کا ذہنی توازن ان کے وزیرخزانہ بنتے ہی کھویا ہوا نظر آ رہا ہے، قائداعظمؒ کا یہ حال تھا کہ "خواہ وزیر ہو، کوئی بھی قائداعظمؒ کو اَن شیڈیولڈ نہیں مل سکتا تھا۔ صرف لیاقت علی خاںؒ اور غلام محمد اَن شیڈیولڈ مل سکتے تھے۔ آنے سے پہلے فون کر دیتے تھے۔ ٹائم بھی طے کر لیتے تھے....."۔

(حوالہ: "دی گریٹ لیڈر" (اردو)۔ زیرتحریر)۔

یعنی قائداعظم محمد علی جناحؒ جن کے ہاں غلطی اور نااہلیت کی کوئی جگہ نہ تھی، وہ ایک ذہنی توازن سے مبرا اور پرلے درجے کے لالچی غلام محمد کو، جو اپنی ذات کو سب پر حاوی سمجھتا تھا، اَن شیڈیولڈ ملاقات دیتے رہے۔ اور پھر اس کی اہلیت اور خدمات کی عوامی سطح پر تحسین بھی کرتے رہے۔

آگے ربانی صاحب غلام محمد کے خواجہ ناظم الدین کی جگہ گورنر جنرل بننے اور پارلیمنٹ کی تحلیل کا مسئلہ بیان کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ غلام محمد کا انتہائی غلط قدم تھا۔ اس کی اثرات قوم آج تک بھگت رہی ہے، لیکن ان کے ان اقدامات سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ ان کی بطور وزیرخزانہ تقرری بھی غلط تھی۔

اگر ملک غلام محمد بہت بعد، گورنر جنرل شپ کے زمانے میں کسی لحاظ سے بعض معاملات میں معذور یا

ہٹ دھرم ہو چکے تھے تو اس سے قائداعظمؒ کی طرف سے بطور وزیرخزانہ ان کی تقرری غلطی تو نہیں ٹھہرتی۔ جبکہ قائداعظمؒ کے مطابق غلام محمد نے اپنی انتھک مالیاتی لگن سے پاکستان کی اقتصادیات مستحکم کی۔

پاکستان سٹیل ملز بھی بھٹو صاحب کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ بھٹو صاحب سے بہت پہلے 1949ء میں غلام محمد وزیرخزانہ کی حیثیت سے امریکہ گئے۔ اس وقت یو ایس سٹیل دنیا میں سب سے بڑی تھی۔ غلام محمد نے ان سے پاکستان میں اس وقت سٹیل ملز لگانے کی بات کی جب اس ملک کو وجود میں آئے ابھی دو برس ہوئے تھے۔

عطا ربانی، غلام محمد کو ضدی اور ہٹ دھرم کہتے ہیں۔ جب سٹرلنگ کی ڈی ویلیوایشن (قدر میں کمی) ہوئی، غلام محمد نے بطور وزیرخزانہ حکومت کو کرنسی ڈی ویلیو کرنے کی ایڈوائس دی۔ وزیرتجارت فضل الرحمٰن، جن کا مشرقی پاکستان سے تعلق تھا، نے اسے پاکستان کے مفاد کے منافی قرار دیا۔ چنانچہ غلام محمد چاہتے ہوئے بھی پاکستانی کرنسی ڈی ویلیو نہ کرا سکے۔ حالانکہ ماہرینِ معاشیات کے نزدیک اس وقت ایسا ہونا ضروری تھا۔ ہوں گے وہ ہٹ دھرم، لیکن جب آپ جمہوری نظام کا حصہ بن جاتے ہیں تو آپ کو اپنے اندر برداشت اور لچک پیدا کرنا پڑتی ہے۔ وہ ہٹ دھرم ہوں یا نہ ہوں، مسئلہ زیربحث یہاں یہ ہے کہ ماہر مالیات کے طور پر ان کا مقام کیا تھا؟ اور کیا ان کا انتخاب قائداعظمؒ کی ایک غلطی تھی؟

ان کے بعد آنے والے ایک وزیرخزانہ سید امجد علی، جنہوں نے بطور وزیرخزانہ چار وزرائے اعظم بھگتائے تھے: چودھری محمد علی، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندریگر، ملک فیروز خاں نون۔ میں نے ان سے ایک انٹرویو میں غلام محمد کی فنانس کے بارے میں قابلیت کے بارے میں پوچھا، سید امجد علی کا جواب تھا:

> غلام محمد صاحب کا دماغ بڑا زرخیز تھا۔ جس وقت ہم سویڈن میں تھے، مجھے کہنے لگے، بھئی ایک آئیڈیا ہے۔ ڈویلپمنٹ پر میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ تم کسی سٹینوگرافر کا انتظام کرو۔ میں نے آپ کو بتایا نا، ہماری وہاں ایمبیسی کوئی نہیں تھی۔ میں نے ہوٹل والوں سے کہا، کوئی سٹینوگرافر! کہنے لگے، ہاں ہم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک لڑکی آ گئی۔ اسے انہوں نے ڈکٹیٹ کرانا شروع کیا۔ میں سیر کے لئے چلا گیا۔ واپس آیا۔ ڈرافٹ تیار تھا۔ مجھے انہوں نے کہا پڑھ۔ میں نے پڑھا۔ وہ یہ تھا کہ فارن ایڈ جو ہے یہی کافی نہیں کہ وہ فارن ایکسچینج میں ہو، بلکہ اس کا لوکل کرنسی میں ہونا بھی ضروری ہے وگرنہ اس کے ساتھ ڈویلپمنٹ ٹھیک نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ جو فارن ایکسچینج ہے اس کی تو مجھے سمجھ آ گئی کہ امریکہ آپ کو دے یا انگلستان

آپ کو دے۔ ڈالر دے یا سٹرلنگ دے۔ لیکن پاکستانی روپے؟ یہ آپ کو وہ کہاں سے دیں گے۔ آپ یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ کہیں گے کہ آپ یہ بھی نہیں کر سکتے۔ کہنے لگے، تم نہیں جانتے۔ غلام محمد صاحب ٹھیک کہہ رہے تھے۔ کیونکہ بعد میں جب میں خود پاکستان کا وزیر خزانہ بنا تو میں نے دیکھا کہ امریکی حکومت کی طرف سے مقامی روپیہ پی ایل 480 پروگرام کے تحت فراہم کیا جا رہا تھا۔ مثلاً پی ایل 480 کے تحت جو گندم وغیرہ آتی تھی اس کے جو روپے جنریٹ ہوتے تھے وہ واپس تو نہیں لے جاتے تھے۔ وہ پھر ہمیں دے دیتے تھے کہ آپ استعمال کریں۔ یہاں سے آپ اندازہ کریں غلام محمد صاحب کی دور بینی کا کہ وہ اس وقت یہ چیز سوچ رہے تھے۔ (حوالہ: سیاسی جوار بھاٹا۔ پبلشر: آتش فشاں لاہور۔ صفحہ 177)۔

میں نے سید امجد علی سے پوچھا، ''اور بطور وزیر خزانہ؟''۔ ان کا جواب تھا،

کامیاب۔ بڑے قابل۔ ان کا کنٹرول بڑا تھا۔ اس وقت یہ بڑا ضروری تھا، کیونکہ پیسہ تو تھا نہیں۔ اس واسطے بڑا کنٹرول تھا۔ غلام محمد صاحب بعض باتوں میں بڑے زیرک تھے۔ بڑا انٹیلی جنٹ آدمی تھا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میں اس وقت سمجھتا تھا کہ لوکل کرنسی کے سلسلے میں غلط کہہ رہے ہیں، لیکن وہ صحیح تھے۔ (ایضاً۔ صفحہ 204)۔

پھر قیام پاکستان میں بھی وہ اپنے انداز میں کردار ادا کرتے رہے۔ عطا ربانی صاحب نے طعن توڑا ہے کہ دوسری جنگ عظیم میں ملک غلام محمد حکومت ہند کی سپلائی اینڈ پرچیز آرگنائزیشن میں تھے۔ ربانی صاحب کو علم ہونا چاہئے کہ سرکاری ملازم ہوتے ہوئے ملک غلام محمد مسلم لیگ اور قائداعظمؒ اور مسلمانوں کے لئے کس قدر دبنگ تھے۔

پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے قائداعظمؒ لندن گئے۔ یہ کانفرنس 12 نومبر 1930ء کو شروع ہوئی۔ 19 جنوری 1931ء کو اس کے اختتام کے بعد قائداعظمؒ نے لندن میں ہی قیام کر لیا۔ وہیں پریکٹس شروع کر دی۔ قائداعظمؒ کو لندن سے ہندوستان واپسی پر آمادہ کرنے کے سلسلے میں تین چیزیں ریکارڈ پر ہیں: ایک آل انڈیا مسلم لیگ کی 12 مارچ 1933ء کی قرارداد جو عبدالمتین چودھری نے پیش کی تھی۔ اس میں قائداعظمؒ سے اصرار کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان آ کر پھر سے مسلمانوں کی قیادت سنبھالیں۔ دوسرے، عبدالمتین چودھری کے وہ خطوط جو انہوں نے اس سلسلے میں قائداعظمؒ کو لکھے تھے۔ تیسرے، آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک بانی اور بعد ازاں مسلم لیگ کے صدر (جون 1932ء تا مئی 1933ء) پشاور کے میاں عبدالعزیز کا قائداعظمؒ کے نام خط۔

حسین ملک، جو ملک غلام محمد کے ماموں زاد بھائی تھے، اور بعد ازاں داماد بھی، نے مجھے ایک انٹرویو کے دوران میں بتایا، ''میں اپنے پھوپھی زاد بھائی (غلام محمد) کے ہاں شملے گیا۔ ملک صاحب آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس میں تھے۔ ان دنوں ان کے ہاں ایک صاحب ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک روز میں کیا دیکھتا ہوں وہ صاحب سویٹر پہنے ہوئے ہیں۔ ٹانگوں پر لحاف اوڑھ رکھا ہے۔ لحاف پر ٹائپ رائٹر رکھا ہے۔ سردی سے سُوں سُوں کی آواز نکل رہی ہے اور ایک انگلی سے کچھ ٹائپ بھی کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا، ''چودھری صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں''۔ کہنے لگے، ''میں مسٹر ایم اے جناح سے درخواست کر رہا ہوں، حالات متقاضی ہیں کہ آپ آ کر مسلم لیگ کو منظم کریں۔ یہ صاحب آسام کے چودھری عبدالمتین تھے''۔ اور وہ یہ اہم مگر سراسر سیاسی خطوط اسی ملک غلام محمد کی رہائش گاہ پر انہی کے ٹائپ رائٹر پر ٹائپ کر رہے تھے۔

قائداعظمؒ ''دسمبر 1933ء کے آخری ہفتے بمبئی پہنچے''۔ اور آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم شروع کی۔ اس سلسلے میں اپریل 1936ء میں بمبئی اجلاس میں اس کے انتخابات ہوئے، ''اجلاس نے قائدؒ کو مرکزی اور صوبائی پارلیمنٹری بورڈ بنانے اور مسلم لیگ کی تنظیم نو کا اختیار دیا''۔ ملک غلام محمد نے اپنے کزن حسین ملک کو اس اجلاس میں شرکت پر آمادہ کیا۔ لیاقت علی خاںؒ سیکرٹری جنرل اور حسین ملک جائنٹ سیکرٹری منتخب ہوئے۔ 1937ء کے آل انڈیا مسلم لیگ سیشن لکھنؤ کو ہماری تاریخ میں زبردست اہمیت حاصل ہے۔ لیاقت علی خاںؒ ایک تجارتی وفد میں انگلینڈ گئے ہوئے تھے، اس لئے اس تاریخی سیشن کی سیکرٹری جنرل کی ذمہ داریاں بھی حسین ملک مرحوم کو ادا کرنا پڑیں۔ وہی حسین ملک جنہیں ملک غلام محمد نے آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم نو والے اجلاس میں شرکت پر آمادہ کیا تھا۔

1938ء میں حسین ملک نے قائداعظمؒ کے اعزاز میں چائے کی دعوت دی، جس کا مقصد اہم مسلمان سرکاری ملازمین کی قائداعظمؒ سے ملاقات تھا۔ حسین ملک مرحوم نے یہ دعوت ملک غلام محمد کی سرکاری رہائش گاہ 10 تغلق روڈ دہلی پر دی۔

جب اعلیٰ مسلمان سرکاری افسر مسلم لیگ اور اس کے مطالبۂ پاکستان کا مذاق اڑاتے تھے۔ انڈین سول سروس کے ایک بڑے مسٹر جی احمد کا یہ حال تھا کہ ایک موقعہ پر ''ہاتھ میں چھڑی لئے غصے کی حالت میں کبھی ادھر آتا اور کبھی اُدھر جاتا اور کہتا، آپ نے یہ پاکستان پاکستان کی کیا رٹ لگا رکھی ہے۔ پاکستان بن گیا تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا''۔ اس وقت ملک غلام محمد قائداعظمؒ کے حامی تھے اور ایسا بھی ہوا کہ قائداعظمؒ شملہ گئے تو ملک غلام محمد نے ان کی دعوت کی۔ قائداعظمؒ تو غلام محمد کو متحدہ ہندوستان کی عبوری حکومت میں بھی لینے کو تیار تھے۔ جس پر بمبئی سے غلام محمد نے قائداعظمؒ کو خط لکھا: ''میں یقین دلاتا ہوں

کہ آپ جس حیثیت کے لئے بھی چاہیں میری خدمات حاضر ہیں،لیکن اس کے لئے مجھے مسٹر ٹاٹا سے ریلیز لینا ہوگی''۔قائداعظمؒ نے اس ریلیز کے لئے ٹاٹا کو بھی لکھ دیا،لیکن یہ طے پانے پر کہ ہندوستان کی عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی نمائندگی مسلم لیگی کریں گے،ملک صاحب کو اس کیبنٹ میں نہ لیا گیا۔

چونکہ غلام محمد کا ماضی ان کے حال پر گواہ تھا اس لئے قائداعظمؒ کا انہیں وزیرخزانہ بنانے کا فیصلہ سراسر درست تھا۔بعد میں اگر ملک غلام محمد نے بطور گورنر جنرل پاکستان وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو برطرف کیا،دستورساز اسمبلی توڑی اور ملک آئینی بحران کا شکار کیا تو کیا ان کے ماتھے پر یہ لکھا تھا کہ وہ ایسا کریں گے،جنہیں پڑھنے کے باوجود قائداعظمؒ نے انہیں نوزائیدہ پاکستان کا پہلا وزیرخزانہ لیا۔لہٰذا ان کے بعد کے اقدامات کے سبب یہ قطعاً نہیں کہا جاسکتا کہ قائداعظمؒ نے انہیں جو وزیرخزانہ نامزد کیا وہ غلط تھا۔

قائداعظمؒ نے انہیں وزیرخزانہ بنایا تھا،گورنر جنرل تو غلام محمد محلاتی سازشوں کے ذریعے وہ بھی لیاقت علی خانؒ کے قتل کے نتیجے میں بنتے ہیں۔قائداعظمؒ کو پتہ تھا کہ ان کے دست راست،جانشین اور وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خانؒ قتل کردیئے جائیں گے اور اس سازش کے نتیجے میں غلام محمد گورنر جنرل بن کر ملک کو بھیانک دور کی طرف دھکیل دیں گے؟

پاکستان کے پہلے وزیراعظم خان لیاقت علی خانؒ کے منصوبہ بندی اور ایک سازش کے تحت قتل کے بعد نواب مشتاق احمد خاں گورمانی نے وزیرخزانہ ملک غلام محمد کو خواجہ ناظم الدین کی جگہ گورنر جنرل بنوایا اور خود وزیرامور کشمیر سے وزیرداخلہ بن گئے اور اپنے آپ کو غلام محمد کا جانشین بنانے کی سازباز میں رہے۔

لیاقت علی خانؒ کے سانحۂ قتل کے بعد گورمانی نے خواجہ ناظم الدین کو ملکی یکجہتی کے حوالے سے کہا تھا:''کیونکہ ایسٹ پاکستان اور ویسٹ پاکستان کا اکٹھا رہنا ضروری ہے اور ہمیں ایک ایسے شخص کو وزیراعظم بنانا چاہئے جو ملک کے دونوں حصوں میں بہت زیادہ پسند کیا جاتا ہو۔اس واسطے میں آپ سے کہتا ہوں کہ آپ مہربانی کرکے اس پر توجہ دیں''۔(ایضاً۔صفحہ 195)

خواجہ صاحب نے ملک کی خاطر گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑا،وزیراعظم بنے۔انہیں کیا پتہ تھا کہ ان کی جگہ بنایا جانے والا گورنر جنرل انہی کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت 17اپریل 1953ء کی صبح وزارت عظمیٰ سے برطرف کردے گا۔اور جو دستورساز اسمبلی پاکستان کا پہلا آئین تقریباً تیار کرچکی تھی اور اس کے نفاذ کے لئے قائداعظمؒ کے یوم ولادت 25دسمبر 1954ء کا اعلان ہوچکا تھا،اس اسمبلی کو 24اکتوبر 1954ءکو ہی گورنر جنرل غلام محمد کالعدم کردے گا۔

یہودا اسقریوتی حضرت عیسیٰؑ کا وفادار تھا تو ان کا حواری کہلایا۔اگر اس نے بعد میں 32درہم کے عوض مسیحؑ ابن مریم کو پکڑوایا تو اس پر ایسا قطعاً نہیں کہا جاسکتا کہ حضرت عیسیٰؑ نے اسے اپنا حواری ہی کیوں

بنایا؟ تاریخ ایسے واقعات سے بھی بھری پڑی ہے۔ دور کیوں جائیں۔ برصغیر میں یہ میر جعفر ہی تھا جس نے بنگال کو مرہٹوں کی شورش سے محفوظ کیا۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ بنگال، بہار، اوڑیسہ کے حکمران نواب سراج الدولہ کے ساتھ غداری کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور جنگِ پلاسی میں انگریزوں کی فتح کا سبب بن کر بنگال میں ان کی سیاسی حیثیت مستحکم کرتا ہے، کیونکہ بنگال کی زرخیزی اور دولت نے انگریز کو دکن میں فرانسیسیوں کے خلاف فتح دلوائی۔ یوں بنگال پر انگریزی قبضہ سارے ہندوستان کی غلامی کا سبب بنا۔ اب اس کے ماتھے پر تو نہیں لکھا تھا کہ وہ میر جعفر جس نے مرہٹوں سے بنگال کو محفوظ کیا، کل کو انگریزوں کا ساتھ دے کر اپنے ماتھے پر غداری کا قشقہ کھینچ لے گا۔

عطار بانی کا کہنا ہے کہ گورنر جنرل غلام محمد کے اس فیصلے سے انتخابی عمل اور منتخب جمہوری حکومتوں پر منفی اثرات پڑے۔ اور بیوروکریسی مافیا کی ہوس کو وجود ملا۔ یہ قصہ تو 53ء اور 54ء میں ہوا۔ جبکہ منتخب اور جمہوری قیادت قیام پاکستان کے فوراً بعد ہی دست و گریباں ہوگئی تھی۔ حتیٰ کہ پنجاب میں دولتانہ ممدوٹ کشمکش قائداعظمؒ کی زندگی میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ اس کے بعد سرحد میں خاں عبدالقیوم خاں اور پیر صاحب مانکی شریف، بنگال میں سہروردی اور خواجہ ناظم الدین، سندھ میں ایوب کھوڑو اور غلام حسین ہدایت اللہ۔ یہ سب غلام محمد نے تو نہیں کیا تھا۔ یہ ان کی محلاتی سازشوں سے بہت پہلے شروع ہو کر انتخابی عمل اور جمہوریت پر منفی اثرات ڈال چکا تھا۔

دراصل عطار بانی غلام محمد کے گورنر جنرل کی حیثیت سے غیر جمہوری اقدامات پر نالاں ہیں۔ اگر ایک شخص بعد کے ایام میں کوئی غلط قدم اٹھاتا ہے، اس سے کہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کے اچھے اقدامات بھی غلط تھے یا سرے سے اس کا انتخاب ہی غلط تھا۔ عطار بانی کے نزدیک غلام محمد کا بطور وزیر خزانہ اور چودھری سر محمد ظفر اللہ خاں کا بطور وزیر خارجہ انتخاب ہی غلط تھا، لیکن وہ غلام محمد کو سرتاپا اغلاط اور لغزشوں کا مجموعہ قرار دیتے ہیں اور سر چودھری محمد ظفر اللہ خاں کی زبردست تحسین کرتے ہیں کہ وہ غلام محمد کے برعکس ''قائدؒ کی توقعات پر پورا اترے اور ملک کے لئے ایک عظیم اثاثہ رہے''۔ اور یہ کہ ''سر محمد ظفر اللہ عالمی سطح پر معروف تھے۔ ہیگ میں عالمی عدالت انصاف کے چیف جسٹس رہے۔ اقوام متحدہ کے تحت کئی بین الاقوامی فورموں کے رکن کے طور پر ممتاز رہے اور دنیا بھر میں انہوں نے بے حد عزت پائی۔ انہوں نے اقوام متحدہ اور دیگر بین الاقوامی فورموں پر ہمارا مقدمہ از حد کامیابی سے پیش کیا، اور اپنے دنیا بھر میں پھیلے ہوئے روابط پاکستان کے فائدے میں استعمال کئے۔ ان کی عدالتی معاملہ فہمی، بحث کرنے اور گفت و شنید کی مہارت چیلنج نہیں کی جاسکتی تھی۔ وہ ایک باکردار انسان تھے جن کا ریکارڈ صاف ستھرا اور

ماورائے آئین ارادوں سے مبرا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو سیاسی سازشوں سے دور رکھا اور چھٹی دہائی کے اخیر تک مختلف حیثیتوں میں پاکستان کی بے لوثی کے ساتھ خدمت کی''۔

درست کہ چودھری ظفر اللہ خاں سیاسی جوڑ توڑ اور سازشوں سے دور رہے جبکہ قائداعظمؒ کا ایک دوسرا انتخاب ملک غلام محمد اپنے آپ کو اس دلدل سے دور نہ رکھ سکا۔ لیکن اس سے بطور وزیرخزانہ ان کی خدمات اور صلاحیت کار ختم تو نہیں ہو جاتی۔ جبکہ غلام محمد کے ان اوصاف کو قائداعظمؒ نے عوامی سطح پر حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام کی طرف سے سراہا، جس کا ذکر پیچھے آ چکا ہے۔ ان خوبیوں کے باوجود اگر یہ شخص قائداعظمؒ کی وفات کے پانچ چھ برس بعد وزیراعظم کی برطرفی اور قومی اسمبلی کی برخاستگی جیسے سنگین منفی قدم اٹھاتا ہے، تو اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ بطور وزیرخزانہ سرے سے اس کا انتخاب ہی غلط تھا۔ پھر اس غلطی کا سزاوار آپ کسی ایرے غیرے کو نہیں قائداعظمؒ جیسی ہستی کو قرار دے رہے ہیں۔ قائداعظمؒ کے ایک انتخاب چودھری ظفر اللہ خاں کی خوبیاں تو آپ کو نظر آ گئیں، غلام محمد کی صرف خامی پر ہی آپ اس کے اچھے اقدامات بھی ماننے کے لئے تیار نہیں جبکہ خود قائداعظمؒ ان اقدامات کے معترف تھے۔

عطا ربانی صاحب نے پہلی غلطی کے ذکر میں ''کھوٹے سکوں'' والی بات بھی چھیڑی ہے۔ اس سے قبل وہ ''مسٹر جناح بحیثیت سیاسی ولی'' کے تحت یہ بھی لکھتے ہیں: ''یاد رہے، ایک دفعہ انہوں نے کہا: ''میری جیب میں زیادہ تر سکے کھوٹے ہیں''۔ یا اس قسم کے الفاظ کہے تھے''۔ یعنی ربانی صاحب کو اصل الفاظ کا علم نہیں پھر بھی وہ کہتے ہیں: ''لیکن یہ بات ان کے حق میں جاتی ہے کہ انہوں نے یہ ''کھوٹے سکے'' مسلم کاز کے لئے بڑی دانائی سے چلائے''۔ ربانی صاحب جوش میں بھول گئے کہ کھوٹے سکے چلانا قانون کی نظر میں کتنا بڑا جرم ہے۔ لیکن قائداعظمؒ سے منسوب یہ غیرواقعی جملہ یہاں ادا کرنے سے بھی ربانی صاحب کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ ''پہلی غلطی'' تلے جہاں یہ لکھتے ہیں کہ ملک غلام محمد اور سر چودھری محمد ظفر اللہ خاں کی ''دو نامزدگیاں پالیمنٹری پریکٹس حتیٰ کہ خود مسٹر جناح کے جمہوری اصولوں سے ٹکراتی تھیں'' وہیں وہ اگلے جملے میں رقم طراز ہیں: ''ممکن ہے کہ انہوں نے لیجسلیچر سے باہر دستیاب جوہر قابل ملکی بہتری کے لئے استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کی ہو جس طرح کہ چوتھی دہائی کی جدوجہد کے ایام میں انہوں نے ''اپنی جیب کے کھوٹے سکے'' مؤثر انداز میں چلالئے''۔

کھوٹے سکوں والی بات تاریخی اور داقعاتی لحاظ سے غلط ہے۔ قائداعظمؒ نے اپنے رفقا کے بارے میں کبھی ایسا جملہ ادا نہیں کیا۔ اگر ایسا تھا کہ ان کے قریبی رفقا کھوٹے سکے تھے تو دس کروڑ مسلمانوں میں انہیں چند ایسے افراد بھی میسر نہ تھے کہ جنہیں وہ ان کھوٹے سکوں کی جگہ لے آتے؟ لہٰذا یہ جملہ واقعاتی،

تاریخی حتیٰ کہ منطقی اعتبار سے بھی انتہائی لغو ہے۔ اس لئے بھی کہ قائداعظمؒ کے قریب ترین ساتھی لیاقت علی خاںؒ تھے، ان کے متعلق وہ کہتے ہیں:

''نواب زادہ لیاقت علی خاں میرے دستِ راست ہیں۔ انہوں نے دن رات مشقت اور خدمت کی ہے۔ کسی کے تصور میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ انہوں نے ذمہ داریوں کا کس قدر غیر معمولی بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں کو مسلمانوں کا ہمہ گیر احترام اور اعتماد حاصل ہے۔ اگر چہ وہ نواب زادہ ہیں لیکن مکمل طور پر عوامی (PROLETARIAN) ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ملک کے دیگر نواب بھی ان کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے گزشتہ سات برسوں میں جو خدمات دی ہیں میری آرزو ہے کہ وہ عمر بھر اسی طرح مسلمانوں کے لئے خدمت انجام دیتے رہیں''۔ (آل انڈیا مسلم لیگ کا 31واں سالانہ اجلاس، کراچی۔ 26 دسمبر 1943ء)۔

کیا مولانا حسرت موہانی بھی کھوٹا سکہ تھے جن کا قائداعظمؒ بہت احترام کرتے تھے۔
مولانا حسرت موہانی کا رویہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور عام اجلاسوں میں کس قدر اختلافی اور بعض اوقات جارحانہ ہوتا تھا۔ کوئی کھوٹہ سکہ کبھی اس قدر صاف گو اور جرأت مند نہیں ہوسکتا اور نہ قائداعظمؒ کسی کھوٹے سکے کا احترام کر سکتے تھے۔

قائداعظمؒ تقسیم بنگال و پنجاب کے سخت مخالف تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے وائسرائے کو تجویز دی کہ بنگال کو تقسیم نہ کریں، اسے ایک تیسرے ملک کے طور پر آزادی دے دیں۔ اس سلسلے میں متحدہ بنگال کے آخری وزیراعظم حسین شہید سہروردیؒ کو قائداعظمؒ کا بھرپور اعتماد حاصل رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ انگریز حکمرانوں اور ہندو قیادت کے گٹھ جوڑ نے یہ اعلیٰ اور دانش مندانہ تجویز تسلیم نہ کی۔ اگر حسین شہید سہروردیؒ کھوٹا سکہ تھے تو قائداعظمؒ نے اس نازک اور اہم معاملے میں بھی ان پر بھروسہ کیوں کیا اور ان کی اس سلسلے میں ڈیوٹی کیوں لگائے رکھی؟ قائداعظمؒ اور سہروردی کے درمیان یہ سب کچھ خاموشی اور رازداری سے ہوتا رہا۔

جب سہروردی پاکستان کے وزیراعظم (57-1956ء) تھے۔ امریکی صدر آئزن ہاور نے بڈابیر پشاور پر اڈا مانگا۔ سہروردی مرحوم نے اسے مسئلۂ کشمیر کے حل کے ساتھ مشروط کر دیا۔ اسی لئے جب ان سے استعفا لیا گیا تو وہ رو رہے تھے کہ اب کشمیر ہمیشہ کے لئے گیا۔ مولانا عبدالحمید خاں بھاشانی نے مغربی پاکستان کو السلام علیکم کہا تو سہروردی نے اس کا منہ توڑ جواب دیا۔ وہ خود کو مشرقی اور مغربی پاکستان کے

درمیان پل کہا کرتے تھے۔ جنرل ایوب نے مارشل لا لگا کر جن سیاستدانوں پر سیاست میں حصہ لینے کے دروازے بند کر دیئے ان میں سہروردی بھی تھے اور ان پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔ پھر بھی وہ ملک کی خاطر تڑپتے رہے، اور اس کی بقا کے لئے تجاویز دیتے رہے۔

عطا ربانی بتائیں کیا حسین شہید سہروردی کھوٹا سکہ تھے؟

کیا خواجہ ناظم الدین کھوٹا سکہ تھے؟ قائداعظمؒ کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب مطلوب الحسن سید نے قائداعظمؒ کی پہلی مکمل اور جامع سوانح ''محمد علی جناح - اے پولیٹیکل سٹڈی'' لکھی تو اس کے پبلشر شیخ محمد اشرف نے لیاقت علی خاںؒ کی مصروفیت کے باعث اس کا دیباچہ گاندھی سے لکھوانے کی تجویز دی، قائداعظمؒ کا جواب تھا: ''میں اس کی اجازت نہیں دیتا۔ پورے ہندوستان میں کوئی مسلمان نہیں رہا جو اس کتاب پر دیباچہ لکھ سکے''؟ شیخ اشرف نے سر آغا خاں کا نام تجویز کیا۔ قائداعظمؒ اس پر بھی تیار نہ ہوئے۔ بالآخر قائداعظمؒ نے خود ہی خواجہ ناظم الدینؒ کا نام تجویز کیا۔ کیا کسی کھوٹے سکے سے کوئی اپنی سیاسی سوانح کا دیباچہ لکھواتا ہے؟ وہ بھی قائداعظمؒ جیسی ہستی۔ خواجہ ناظم الدین کی قیام پاکستان اور پھر استحکام پاکستان کے لئے انمٹ خدمات اس پر شاہد ہیں کہ وہ کھرا سکہ اور اکل کھرے سیاستدان اور لیڈر تھے۔ اور وہ حب الوطن من الایمان کے قائل تھے۔ جب غلام محمد نے انہیں وزارت عظمٰی سے برطرف کر دیا، وہ ڈھاکہ میں ایک جلسۂ عام میں انکشاف کرتے ہیں کہ امریکی حکام نے انہیں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی مہم پر اکسایا ہے۔ یوں انہوں نے ذات پر ملک کو ترجیح دیتے ہوئے امریکی سوچ اور پروگرام کا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوڑ دیا۔

آسام کے عبدالمتین چودھری، آل انڈیا مسلم لیگ اور قیام پاکستان کے لئے وہ شخص ایثار خلوص اور دیانت کے حوالے سے بیکراں تھا۔ کیا وہ کھوٹا سکہ تھا؟

پاکستان دستور ساز اسمبلی کے پہلے صدر (سپیکر) قائداعظمؒ تھے۔ نائب صدارت کے لئے مولوی تمیزالدین خاںؒ کا انتخاب عمل میں آیا۔ پاکستان دستور ساز اسمبلی میں وہ قائداعظمؒ کے جانشین تھے۔ ان کے بعد انہیں متفقہ طور پر صدر اسمبلی چنا گیا۔ پھر جمہوریت اور پارلیمنٹ کے لئے ان کی جنگ آوری کا زمانہ شاہد اور تاریخ گواہ ہے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ 62ء کی قومی اسمبلی میں وہ متفقہ طور پر سپیکر چنے گئے اور بطور سپیکر انہوں نے سابقہ تابناک روایات کا تسلسل جاری رکھا۔ یہ ان کی عظمت کردار ہی تھی کہ اس دوران میں جب نمونیہ اور 106 ڈگری بخار میں مبتلا 10 اگست 1963ء کو انہیں راولپنڈی سے ڈھاکہ کے لئے جہاز پر بٹھایا گیا تو وہاں موجود ارکان قومی اسمبلی اور وزرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ہر زبان پر



پاکستان کی پہلی کابینہ:- پیرزادہ عبدالستار، سردار عبدالرب نشتر، آئی آئی چندریگر، قائداعظمؒ، لیاقت علی خاں، غلام محمد، فضل الرحمٰن

ان کی صحت یابی کے لئے دعا تھی۔ کیا وہ کھوٹا سکہ تھے؟

پاکستان کی ابتدائی کابینہ میں خان لیاقت علی خاں، سردار عبدالرب نشتر، آئی آئی چندریگر، پیرزادہ عبدالستار، فضل الرحمٰن اور ملک غلام محمد تھے۔ خواجہ شہاب الدین کو انہوں نے بھارت میں پاکستان کا ہائی کمشنر مقرر کیا۔ پھر وہ پاکستان اسمبلی میں چیف وہپ ہوئے اور داخلہ اور اطلاعات کی وزارت کا قلمدان ان کے سپرد ہوا۔ حسن اصفہانی کو انہوں نے امریکہ میں سفیر بنا کے بھیجا، راجہ غضنفر علی کو ایران اور حاجی عبدالستار حاجی اسحٰق سیٹھ کو پہلے بھارت میں رہنے کا کہا، پھر مصر میں سفیر بنا کے بھیجا۔ چودھری محمد علی حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل بنائے گئے۔ کس کس کا نام لیں۔ جو نام بھی سامنے آتا ہے وہ وفاداری، حب وطن اور سیاسی، مالی، فکری اور نظریاتی دیانت کی معراج پر دکھائی دیتا ہے۔

کیا یہ سب کھوٹے سکے تھے؟

اگر ایسا تھا تو کیا پاکستان کے دس کروڑ مسلمانوں میں قائداعظمؒ کا ہاتھ بٹانے کے لئے یہی رہ گئے تھے جبکہ اس قوم سے قائداعظمؒ بہت پر امید تھے۔ صرف ایک واقعہ:۔ این ایچ ہاشمی مرحوم نے مجھے بتایا: ''ایک موقع پر قائداعظمؒ فرما رہے تھے: ''پاکستان انشاءاللہ بن کے رہے گا''۔ میرے منہ سے اچانک نکل گیا: ''قائداعظمؒ! خدا تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے۔ ہمارے ہاں تو قحط الرجال ہے''۔ اس پر قائداعظمؒ نے کہا: ''نوجوان! آپ مایوسی کا شکار کیوں ہوتے ہیں۔ کون جانتا تھا کہ جناح پیدا ہوگا، اتاترک اٹھے گا۔ آپ ہی میں سے جناح ابھریں گے۔ مایوس ہونے کے بجائے محنت کریں اور بہتری کی امید رکھیں''۔

مسٹر عطار بانی قائداعظمؒ کی بحیثیت گورنر جنرل دوسری غلطی کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

''اواخر اکتوبر 1947ء میں قبائلی جب سری نگر کے ہوائی اڈے کے اردگرد کے علاقے تاراج کر رہے تھے اور تاوان اکٹھا کرنے میں مصروف تھے، گورنر جنرل نے پاک فوج کے کمانڈر انچیف لیفٹیننٹ جنرل گریسی کو، جو اس وقت پاکستانی فوج کے قائم مقام آرمی چیف تھے، ایک بریگیڈ کشمیر میں بھیجنے کا حکم دیا، جو اس لشکر کو ہوائی اڈے پر جوان کے قدموں میں پڑا تھا، قبضہ کرنے کے لئے منظم کرے اور ان سے شدید حملہ کرائے۔ لیفٹیننٹ جنرل گریسی نے گورنر جنرل کا جائز حکم نظر انداز کیا۔ اس کے برعکس گورنر جنرل کے ارادے سے آگاہ کرنے کے لئے اس نے نئی دہلی میں فیلڈ مارشل سرکلاڈ آکن لیک (Claude Auchinleck) سے رابطہ کیا۔

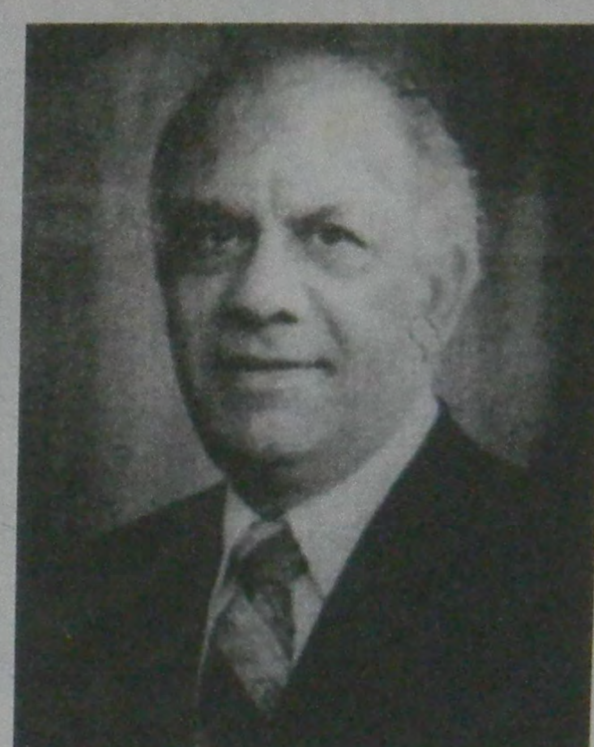
''فوج میں حکم عدولی بڑا سنگین جرم ہے اور سخت انضباطی کارروائی کا متقاضی ہوتا ہے۔ میرے نزدیک اس موقعہ پر گورنر جنرل ڈگمگا گئے اور گفتگو کے لئے فیلڈ مارشل آکن لیک کے ساتھ ملاقات کرنے



جنرل فرانک والٹر میسروی



جنرل ڈگلس ڈیوڈ گریسی



عطا ربانی



سر فرانسس موڈی

پر تیار ہو گئے۔ وقت اور صورت حال لیفٹیننٹ جنرل گریسی کی فوجی کمان سے فوری برطرفی اور اس کی جگہ ایسے پاکستانی آفیسر کی تعیناتی کی متقاضی تھی جسے ان احکام پر عمل پیرائی کی ہدایات دی جاتیں، جو سری نگر کے ہوائی اڈے کے قریب منڈلانے والے لشکر کی رہنمائی کے لئے وہاں فوجی دستے بھیجنے کے ذیل میں پہلے ہی دی جا چکی تھیں''۔

یہ درست ہے کہ قائداعظمؒ نے 27 اکتوبر 1947ء جنرل سر ڈگلس ڈیوڈ گریسی (Douglas David Gracy) کو کشمیر میں فوج بھیجنے کا آرڈر کیا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ جنرل گریسی نے اس حکم کی تعمیل کے بجائے پاکستان و بھارت کی افواج کے سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل آکن لیک سے رابطہ کیا۔ اس سلسلے میں کئی حوالے موجود ہیں۔ اوروں کے علاوہ 'مشن ود ماؤنٹ بیٹن'' (1952ء) صفحہ 226 ,241 پر ایلن کیمبل جانسن اور ''ایمرجنس آف پاکستان'' (صفحہ 295) میں چودھری محمد علی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ میں نے مئی 1980ء کے ''آتش فشاں'' میں جنرل گل حسن کا انٹرویو شائع کیا تھا۔ اس میں جنرل انٹرویو سے ہٹ کر میں نے ان سے بطور قائداعظمؒ کے اے ڈی سی بھی انٹرویو کیا۔ تب وہ کیپٹن تھے۔ اور گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کے پہلے تین میں سے ایک اے ڈی سی تھے۔ بحریہ کی طرف سے کموڈور ایس ایم احسن، فضائیہ سے فلائٹ لیفٹیننٹ عطا ربانی اور بری فوج سے کیپٹن گل حسن۔ جب میں نے ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن سے پوچھا، ''کشمیر کے مسئلے پر قائداعظمؒ نے کشمیر میں فوجیں بھیجنے کے سلسلے میں کوئی حکم دیا تھا؟'' تو انہوں نے بتایا:

> ''اکتوبر 1947ء میں ہم لاہور تھے۔ سر فرانسس موڈی (Sir Francis Mudie) گورنر پنجاب تھے۔ ہم گورنر ہاؤس میں ہی ٹھہرے تھے۔ موڈی بہت اچھے گورنر تھے۔ بہت اچھے سول سرونٹ تھے۔ اور سب سے بڑھ کر مسلمانوں کے بہت ہمدرد تھے۔ قیام پاکستان سے پہلے وہ لکھنؤ میں چیف سیکرٹری تھے۔ وہیں سے ان کے دل میں مسلمانوں سے ہمدردی او رقربت کے جذبات پیدا ہوئے تھے۔ قائداعظمؒ لاہور میں تھے کہ کشمیر میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس وقت جنرل گریسی پاکستانی افواج کے قائمقام کمانڈر انچیف تھے، کیونکہ جنرل میسروی (Sir Frank Walter Messervy) رخصت پر انگلینڈ گئے ہوئے تھے۔ اس وقت وزیراعظم لیاقت علی بھی لاہور میں تھے، لیکن بیمار پڑ گئے تھے۔ قائداعظمؒ ان کی عیادت کے لئے جا رہے تھے میں بھی ساتھ ہو لیا۔ ڈیفنس سیکرٹری سکندر مرزا بھی وہاں موجود تھے۔ قائداعظمؒ نے ان سے کشمیر کے متعلق بعض امور ڈسکس کئے اور ہم واپس آ گئے۔

''ڈنر سے فارغ ہوتے ہی قائداعظمؒ نے موڈی سے کہا، گریسی کو فون کرواور اسے کہو کہ کشمیر میں فوجیں بھیج دے۔ موڈی نے مجھے کہا کہ آپ گریسی سے فون ملائیں۔ رازداری کی وجہ سے موڈی میرے فون پر بات کرنا چاہتے تھے۔ فون پر موڈی نے گریسی کو کہا کہ کشمیر میں فوجیں بھیج دو۔ وہ پس وپیش سے کام لینے لگا تو موڈی نے کہا، دیکھیں، گریسی! میں آپ کو قائداعظمؒ کے آرڈر پہنچا رہا ہوں اور آپ کو ان احکامات سے پہلوتہی کرنے کا کوئی اختیار نہیں، نہ آپ کو اس بات کا حق ہے کہ آپ قائداعظمؒ کے احکامات کے باوجود اپنے دلائل دیں۔ آپ کو قائداعظمؒ کے حکم پر عمل کرنا ہوگا۔ یہ احکامات بالکل واضح ہیں۔

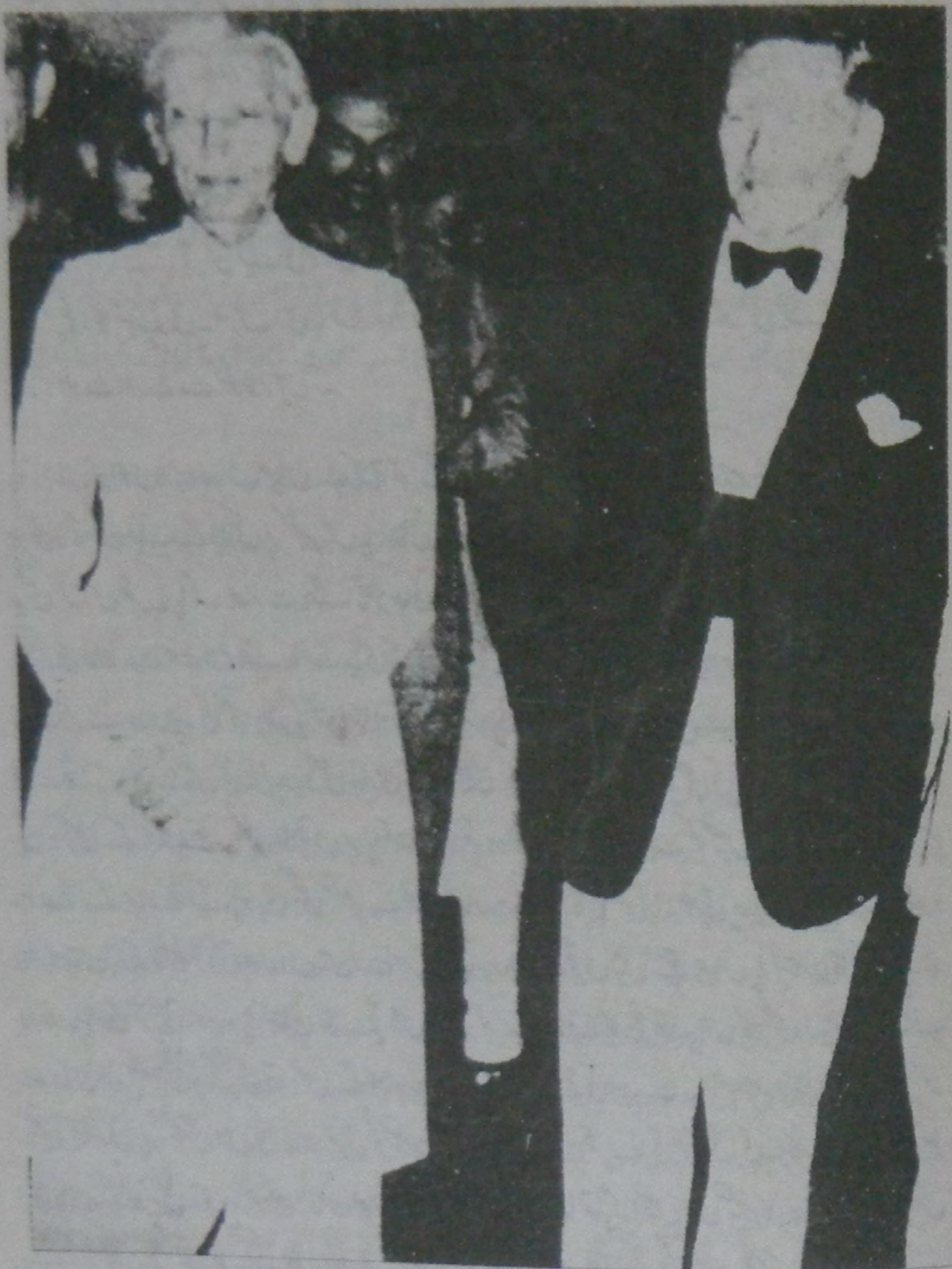
''بات ختم کر کے موڈی قائداعظمؒ کے پاس گئے اور انہیں بتادیا کہ اس نے گریسی کو یہ آرڈرز پاس آن کر دیئے ہیں۔

''اگلی صبح موڈی بہت پہلے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی اٹھا۔ قائداعظمؒ اس وقت سو رہے تھے۔ نیچے ٹیلی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نیچے گیا تو موڈی نے فون سننے کے بعد کہا،''یہ بہت ہی غلط آدمی ہے''۔ اور گالی دی۔ میں نے پوچھا،''کون تھا؟''۔ وہ بولا،''گریسی''۔ میں نے کہا،''وہ غلط آدمی کیوں ہے؟''۔ موڈی کہنے لگے،''اس لئے کہ اس نے کشمیر میں ٹروپس بھیجنے کی بجائے جنرل آکن لیک (پاک و ہند افواج کے کمانڈر انچیف) کو فون کر دیا ہے۔ جواب لاہور آ رہا ہے۔

''گورنر موڈی گریسی کے خلاف بہت گرم تھا۔ اسے بہت گالی دے رہا تھا۔ موڈی پاکستان اور مسلمانوں کا بہت ہمدرد تھا''۔ (''آتش فشاں'' مئی 1980۔ صفحہ 24۔ کالم 3،2)

اس پر سبھی متفق ہیں کہ جنرل گریسی نے کشمیر میں فوجیں بھیجنے کے بجائے فیلڈ مارشل جنرل آکن لیک سے رابطہ قائم کر لیا۔ اس سلسلے میں چودھری محمد علی ''ایمرجنس آف پاکستان'' کے صفحہ 295 پر لکھتے ہیں:

''اس وقت قائداعظمؒ مونٹ بیٹن کی ایان سٹیفنز (Ian Stephens) کو کرائی گئی اس یقین دہانی کے مطابق ''سری نگر میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہونے کے لئے ایبٹ آباد میں ''منتظر'' نہیں تھے بلکہ لاہور میں تھے۔ جب کشمیر پر بھارتی حملے کی خبر انہیں ملی، انہوں نے پاکستانی فوج کے قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو کشمیر میں ٹروپس بھیجنے کا حکم دیا۔ گریسی نے تعمیل حکم نہ کی بلکہ ہدایات کے لئے سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل آکن لیک



قائداعظمؒ اور فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکن لیک

کو دہلی فون کر دیا.....

''بھارتی حملے کے بعد آکن لیک نے قائداعظمؒ کے ساتھ صورت حال پر تبادلۂ خیال کی غرض سے 28 اکتوبر کی صبح لاہور کے لئے پرواز کی۔ اس گفتگو کے نتیجے میں قائداعظمؒ نے کشمیر میں پاکستانی فوج بھیجنے کا حکم واپس لے لیا اور بھارت اور پاکستان کے گورنرز جنرل اور وزرائے اعظم کے درمیان لاہور میں فی الفور کانفرنس منعقد کرنے کے سلسلے میں آکن لیک کی تجویز قبول کر لی.....

ایلن کیمبل جانسن کی مشن ود ماؤنٹ بیٹن کے صفحہ 241 پر درج ہے:

''..... آکن لیک کی فوری مداخلت جناح صاحب کے لئے متبادل موقف پر گہرے غور کا سبب بنی۔ صرف اسی باعث دونوں ڈومینین ایک دوسرے کے ساتھ کھلی جنگ میں ملوث ہونے سے محفوظ رہیں''۔

ان حوالوں سے صاف عیاں ہے کہ قائداعظمؒ نے پاک بھارت افواج کے سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکن لیک کے دلائل پر کشمیر میں پاکستانی فوج بھیجنے کا فیصلہ واپس لے لیا۔ سب سے مضبوط دلیل یہ تھی کہ اس طرح پاک بھارت جنگ چھڑ جاتی جو انتہائی خوفناک نتائج لاتی، کیونکہ اس وقت پاکستان عسکری لحاظ سے سخت لاغر تھا۔ حالت یہ تھی کہ خود قائداعظمؒ نے تسلیم کیا تھا کہ یہ وہ پاکستان نہیں جس کے لئے ہم نے جدوجہد کی تھی بلکہ یہ کٹا پھٹا اور کرم خوردہ پاکستان ہے۔ پھر بھارت نے ہمارے حصے کے اثاثے ہمیں دینے میں سخت لیت و لعل جاری رکھا۔ 55 کروڑ روپے بھی گاندھی کی طرف سے مرن بھرت کی دھمکی کے بعد ملے۔ جن علاقوں پر پاکستان قائم ہوا وہاں صنعتیں بہت کم تھیں۔ ان کا عملہ غیر مسلم ہونے کے بہانے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت بھارت نقل مکانی کر گیا۔ فوجی حالات یہ تھے کہ متحدہ ہندوستان کے 46 تربیتی اداروں میں سے صرف سات ان علاقوں میں تھے جہاں پاکستان قائم ہوا۔ جو واحد بنیادی تربیتی ادارہ پاکستانی علاقے میں تھا وہ کوئٹہ کا سٹاف کالج تھا۔ اس کا بھی زیادہ تر سٹاف ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھا جس کے بھارت نقل مکانی کرنے کی وجہ سے یہ اہم ادارہ بند ہو گیا۔ حتیٰ کہ قیمتی کتابوں پر مشتمل اس کی لائبریری کو سکھوں نے نذر آتش کرنے کی کوشش کی۔ کالج کے انسٹرکٹر لیفٹیننٹ کرنل یحییٰ خاں، جو بعد ازاں صدر پاکستان بنے، کا کہنا تھا کہ انہیں اس سکیم کا پتہ چلا تو وہ رائفل لے کر لائبریری میں سو گئے۔ اس طرح یہ لائبریری محفوظ رہی۔ یوں یہ سٹاف کالج ایک انگریز بریگیڈئر جے سی اے لاڈر (Lauder) کی سربراہی میں 2 فروری 1948ء کو دوبارہ کھلا۔

آرمرڈ فائٹنگ وہیکلز، ریڈار مرمت اور کرسٹل کٹنگ کی تین بنیادی کمانڈ ورکشاپیں بھی بھارتی علاقوں سکندر آباد، کرکی اور آگرہ میں تھیں۔ کل 40 آرڈیننس ڈپوؤں میں سے صرف 5 ریٹیل ڈپو پاکستانی علاقوں میں تھے اور ان میں سٹاک بھی انتہائی کم تھا۔ 12 انجینئر سٹورز ڈپوؤں میں سے صرف تین، وہ بھی چھوٹے، پاکستانی علاقوں میں تھے۔ 17 آرڈیننس فیکٹریوں میں سے 3 پاکستان کے حصے میں آئیں۔

پاکستان کے حصے کا اسلحہ و بارود پاکستان بھیجنے کے سلسلے میں بھی حکومت ہند ارادی سست روی کا شکار رہی۔ جس کا ذکر لیفٹننٹ جنرل ایس پی پی تھورات (Thorat) نے یوں کیا ہے کہ انہیں ڈپٹی پرائم منسٹر انڈیا سردار (ولبھ بھائی) پٹیل نے کہا، ''اپنے فرض کی ادائیگی میں اتنی بھی عجلت نہ دکھائیں''۔ تھورات اپنی سوانح میں لکھتا ہے، ''پاکستان کو بھیجے جانے والے اسلحہ و بارود کے حجم میں خاصی کمی آگئی اور وزن بڑھانے کے لئے اس کے مماثل غیر ضروری اشیا بھیج دی جاتیں''۔ (فرام ریولی ٹو ریٹریٹ، از لیفٹننٹ جنرل ایس پی پی تھورات۔ الائیڈ پبلشرز انڈیا۔ 1985ء۔ صفحات: 100، 101۔ بحوالہ: کراسڈ سورڈز۔ از: شجاع نواز۔ صفحہ 32۔ 2008ء۔ آکسفورڈ)۔

تقسیم کے معاہدہ کے مطابق پاکستان کے حصے میں آنے والے فوجی سامان کا وزن ایک لاکھ 65 ہزار ٹن تھا۔ اس میں سے 31 مارچ 1948ء تک بھارت نے صرف چار ہزار سات سو تین ٹن پاکستان کو دیا۔

یہی نہیں، اوپر سے لکھوکھا مہاجرین کی آمد۔ غیر ملکیوں کا خیال تھا کہ یہ ملک مہاجرین کے دباؤ تلے ہی ختم ہو جائے گا۔ ایسے میں کشمیر میں ایسی فوجی مہم جوئی کیونکر نتیجہ خیز ہو سکتی تھی جو کھلی پاک بھارت جنگ کا باعث بن جاتی۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے، کیا قائداعظمؒ اپنی کمزور عسکری پوزیشن سے آگاہ نہیں تھے؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ اس سے آگاہ نہ ہوں۔ پھر انہوں نے جنرل مسروی کے قائم مقام جنرل گریسی کو کشمیر میں فوج بھیجنے کا کیوں کہا؟ قائداعظمؒ ایک زبردست سیاسی مدبر تھے۔ انہوں نے انگریز اور برہمن کی ہر چال الٹ ڈالی تھی۔ کیبنٹ مشن کو ہی لیں۔ اسے قبول کر کے انہوں نے ہندو کانگریس کو ایسی پریشانی میں ڈال دیا کہ اس کی وہ قیادت آج تک اس میں سے نہیں نکل سکی۔ آج کا بھارتی مؤرخ بھی اس وقت کی ہندو قیادت کو لعن طعن کر رہا ہے۔ اسی طرح کشمیر پر بھارتی حملے کے جواب میں قائداعظمؒ کی طرف سے پاکستانی کمانڈر انچیف کو کشمیر میں فوج بھیجنے کے حکم کے نتیجے میں سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکن لیک کی بھارتی اور پاکستانی گورنرز جنرل اور وزرائے اعظم کی فی الفور کانفرنس کی تجویز سے کشمیر میں بھارتی فوج کی وہ خوفناک کارروائی رک گئی جس کے لئے اسے وہاں بھیجا گیا تھا۔ پھر اس کانفرنس میں بھارتی وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے عدم شرکت کے لئے بیماری کا بہانہ اور اکیلے بھارتی گورنر

جنرل لارڈ مونٹ بیٹن کی شرکت نے بھارت کو عالمی برادری میں سفارتی اور ڈپلومیٹک محاذ پر ایک اور ضرب لگائی۔ یوں قائداعظمؒ کی اس سٹیٹس مین شپ نے پاکستانی فوج کو ایک ایسی جنگ سے دور رکھا جس میں بھارت کا پلہ خاصہ بھاری ہوتا، دوسری طرف سیاسی محاذ پر بھارت کی وعدہ خلافی اور لیت ولعل کی پالیسی سے دنیا پر ثابت ہو گیا کہ برصغیر کے حالات بگاڑنے کا وہی ذمہ دار ہے۔

ایسے میں قائداعظمؒ جنرل گریسی کے خلاف ایکشن کیوں لیتے؟ قائداعظمؒ جن کے سامنے غلطی کی گنجائش ہی نہ ہوتی تھی اور جو غلطی پر فی الفور ایکشن لیتے تھے، اگر انہوں نے جنرل گریسی کی اس ظاہری حکم عدولی پر ایسا نہیں کیا تو اسے قائداعظمؒ کی غلطی کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟ 65ء اور 71ء کی پاک بھارت جنگوں کے مواقع، جن میں پاکستان 47ء والی پوزیشن سے کوسوں آگے تھا، نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل آکن لیک کے اس کہے پر کہ اس طرح اوپن پاک بھارت جنگ چھڑ جائے گی، قائداعظمؒ کا فوج کشمیر میں بھیجنے کا فیصلہ واپس لینا انتہائی دانشمندانہ تھا اور اس ظاہری حکم عدولی پر جنرل گریسی کے خلاف ایکشن نہ لینا غلطی قطعاً نہ تھا۔ جب قائداعظمؒ ایک مضبوط دلیل یا اپنی طرف سے ایک اثر انگیز وار کے خاطر خواہ نتائج دیکھ کر اپنا فیصلہ خود ہی واپس لے چکے ہوں تو وہ جنرل گریسی کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ کیوں اپناتے؟ جبکہ جنرل گریسی کے سپریم کمانڈر جنرل آکن لیک کے ساتھ رابطے نے پاکستان کے حق میں اچھے نتائج دیئے۔ یہ امکان بھی مسترد نہیں کیا جا سکتا کہ قائداعظمؒ کا حکم، جنرل گریسی کی حکم عدولی اور اس کا سپریم کمانڈر آکن لیک سے رابطہ یہ سب ایک سوچی سمجھی سکیم کا حصہ ہو، جس نے پھر مطلوبہ نتائج دیئے۔

مسٹر عطا ربانی جنرل گریسی کے خلاف انضباطی کارروائی نہ کرنے پر قائداعظمؒ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''میرے نزدیک اس موقعہ پر گورنر جنرل ڈگمگا گئے اور گفتگو کے لئے فیلڈ مارشل آکن لیک کے ساتھ ملاقات کرنے پر تیار ہو گئے''۔

قائداعظمؒ کے بارے میں کسی بھی مرحلے پر ڈگمگانے کا لفظ تو ان کے سخت بیریوں نے بھی استعمال نہیں کیا۔ یہ ''شرف'' ان کے ایک اے ڈی سی کا ہی نصیبہ ہے جسے انہوں نے سات ماہ بعد ہی واپس ائر فورس میں بھیج دیا تھا۔ مسٹر عطا ربانی کو اس کی وجہ نہیں بھولی ہوگی۔ بہر حال، قائداعظمؒ کے حوالے سے یہ سوچ بڑی لغو ہے کہ انہوں نے جنگ پر گفتگو کو کیوں فوقیت دی، جبکہ قائداعظمؒ نے پاکستان کسی فوجی مہم جوئی سے نہیں گفتگوؤں اور مذاکرات کے ذریعے حاصل کیا تھا۔ انہوں نے ان مذاکرات اور گفتگوؤں کے ذریعے ہمیشہ ملک وقوم کے لئے مفید نتائج حاصل کرنے کی کوشش کی۔

عطار ربانی صاحب قائداعظم کی دوسری غلطی کے ضمن میں مزید لکھتے ہیں: ''بریگیڈیئر ایم اکبر خاں جو رخصت پر تھے پہلے ہی اوڑی میں داخل ہو چکے تھے، جہاں انہوں نے اپنا ہیڈکوارٹر قائم کرلیا تھا اور وہ اپنے ان آدمیوں کے ساتھ جنہوں نے پانڈو کی پہاڑیوں کا کنٹرول سنبھال لیا تھا بڑی دلجمعی کے ساتھ پیش قدمی کرتے کشمیر آپریشن مکمل کر سکتے تھے۔ لشکر کے کنٹرول میں آئے ہوئے ہوائی اڈے پر دہلی سے کسی قسم کی بھارتی کمک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ اور وادی میں محصور بھارتی فوجی چھاؤنی کے لئے ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور کشمیر میں جو آج صورت حال ہے وہ الٹ ہوتی''۔

اس ضمن دوسرا حوالہ ملاحظہ ہو: ''کشمیری علاقے میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائلیوں نے آزاد کشمیر فورسز کے ساتھ رابطہ استوار کیا۔ بھارتی رپورٹس کے مطابق وہ'' پیادہ فوج کے استعمال میں آنے والے تمام ہتھیاروں بشمول مشین گنوں اور بھاری گولوں سے اچھی طرح مسلح تھے''۔ (آپریشن ریسکیو۔ از: لیفٹیننٹ جنرل ایس کے سنہا۔ پبلشر، ویژن بکس نئی دہلی، 1977ء، صفحہ 17)۔ لیکن اکبر خاں بیان کرتے ہیں، ''قبائلی رائفلوں یا صوبہ سرحد کی اسلحہ فیکٹریوں میں بنے بھونڈے ہتھیاروں سے لیس پھٹیچر فورس۔ بلاشبہ 1000 آدمی، جن کے متعلق خیال تھا کہ وہ جموں کٹھوعہ روڈ کاٹ ڈالنے کے لئے تیار تھے، اب وہاں نہیں تھے'' کیونکہ ان کی مقامی ساختہ رائفلیں اب ناکارہ ہوگئی تھیں اور وہ پاکستان واپس جاچکے تھے۔ اور سری نگر کے ہوائی اڈے کے لئے مخصوص 200 رائفلیں خورشید انور نے متعلقہ لوگوں کو نہیں دی تھیں''۔ ایک سورضا کار، جو سابقہ سرکاری ملازم تھے، کی راولپنڈی سے کمک مہیا کی گئی، لیکن جیسا کہ اکبر تسلیم کرتے ہیں: ''تب بہت دیر ہو چکی تھی..... کیونکہ بھارتی دستے پہلے ہی ہوائی اڈے کا دفاع سنبھال چکے تھے''۔ تاہم اس روز سے آج تک پاکستانیوں کے دماغوں میں یہ کہانی راسخ ہے کہ حملہ آور سری نگر کے گرداگرد پہاڑیوں پر قبضہ کر چکے تھے اور انہیں وہاں سے شہر کی روشنیاں نظر آرہی تھیں''۔ (کراسڈ سورڈز۔ صفحہ 50)۔

لیکن وہ روشنیاں عطار ربانی کو ابھی تک نظر آرہی ہیں۔ بہرحال، شجاع نواز اپنی اس تحقیقی تصنیف میں یہ بھی لکھتے ہیں: ''جس شام بھارتی فوجیں سری نگر میں اتریں، وزیراعظم پاکستان نے صورت حال جانچنے کے لئے لاہور میں ایک ''غیر سرکاری کانفرنس'' بلائی جس میں ان افراد نے شرکت کی: سکندر مرزا (ڈیفنس سیکرٹری)، چودھری محمد علی (تب سیکرٹری جنرل)، عبدالقیوم خاں (وزیراعلیٰ سرحد)، نواب ممدوٹ (وزیراعلیٰ پنجاب) اور کرنل شیر خاں اور اکبر خاں۔ اکبر کا کہنا ہے کہ اس نے جموں روڈ ایک ایک ہزار قبائلیوں کے تین لشکروں سے کاٹنے کی تجویز دی اور پیش کش کی کہ وہ ان کے ساتھ ہوں گے۔ صوبہ

سرحد و پنجاب کے وزرائے اعلیٰ کے سوا ہر کسی نے اس آئیڈیا کی اس خدشے کی بنا پر مخالفت کی کہ اس سے پاکستان اور بھارت میں بھرپور جنگ چھڑ سکتی ہے"۔ (ایضاً۔ صفحات: 50، 51)

وزیراعظم لیاقت علی خانؒ، سیکرٹری دفاع سکندر مرزا، حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی اور کرنل شیر خاں نے اکبر خاں کی تجویز کی محض اس بنا پر مخالفت کی کہ ایسا کرنے سے فل سکیل پاک بھارت جنگ چھڑ سکتی ہے۔ مصنف "کراسڈ سورڈز" جس نے اس کتاب کی تیاری میں تمام اہم دستاویز اور ذرائع معلومات تک رسائی کی، بریگیڈیئر اکبر خاں کے بھارتی فوج کے بارے میں اندازے کو غلط قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ انہیں (بریگیڈیئر اکبر خاں کو) علم نہیں تھا کہ کشمیر میں بھارتی فوجی مداخلت پر اسی شام مسٹر جناح نے قائم مقام کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو جواب کے طور پر پاکستانی فوج کشمیر میں بھیجنے کا حکم دیا تھا، جنرل گریسی نے جس کی تعمیل نہ کی۔ اس عدم تعمیل کی دو امکانی وجوہ کے علاوہ مصنف نے ایک تیسری مگر حقیقی وجہ بیان کی ہے: "مزید برآں، اس وقت پاکستانی فوج بھارت کے خلاف ایک ملٹری آپریشن شروع کرنے اور اسے برقرار رکھنے کی پوزیشن میں نہ تھی۔ آکن لیک بذریعہ ہوائی جہاز لاہور پہنچا، مسٹر جناح سے ملاقات کی اور ان پر وہ افادیت بیان کی جو ان کے اپنے حکم سے دستبرداری میں پنہاں تھی..... "(صفحہ 51)۔

گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ، وزیراعظم لیاقت علی خانؒ، سیکرٹری دفاع سکندر مرزا، سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی، سپریم کمانڈر فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکن لیک وغیرہ کی اس پختہ رائے کے باوجود کہ کشمیر میں پاکستانی فوج بھیجنے سے وسیع پیمانے کی پاک بھارت جنگ چھڑ جائے گی، مسٹر عطا ربانی مصر ہیں: "پاک و ہند کی عسکری تاریخ میں یہ انتہائی فیصلہ کن لحہ تھا۔ گورنر جنرل کے حکم کے فوری نفاذ سے نوزائیدہ بھارتی اور پاکستانی مملکتوں کے مابین تعلقات کو نیا رخ ملتا۔ دونوں ملکوں کے درمیان تین بے مصرف جنگوں اور سیاچن اور کارگل جیسی کئی لڑائیوں سے بچا جا سکتا تھا۔ اور خطہ اس ٹینشن سے محفوظ رہتا جو اس پر 60 برس سے مسلسل چھائی ہوئی ہے"۔

عطا ربانی مزید رقم طراز ہیں: "گورنر جنرل کی پہلی غفلت کا قدرتی نتیجہ حکم عدولی کے مرتکب لیفٹیننٹ جنرل گریسی کے کورٹ مارشل کا آرڈر جاری نہ کرنا ایک دوسری غفلت تھا۔ کمان سے لیفٹیننٹ جنرل گریسی کی برطرفی اور کورٹ مارشل کے آرڈر کا بڑا گہرا اثر ہوتا اور یہ مستقبل کے کسی مہم جو کے لئے ایک شدید انتباہ ہوتا۔ عسکری تعامل کے فیصلہ کن لمحے بالخصوص تاریخ پاکستان کے اس ابتدائی مرحلے پر گورنر جنرل کی ثابت قدمی نے تمام ریاستی اداروں بشمول مسلح افواج پر جمہوری سیاسی حکومت کی اتھارٹی

اور بالادستی ہمیشہ کے لئے قطعی طور پر قائم کر دی ہوتی''۔

گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کی اس ثابت قدمی اور انتباہ بلکہ ہدایت اور رہنمائی کا آنے والے مہم جوؤں پر کیا اثر پڑا جس میں انہوں نے کہا تھا:

''میں یہاں ایک اور بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں اور مجھے یہ کہنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ اعلیٰ عہدوں پر فائز ایک دو افسروں کے ساتھ گفتگو کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اس حلف کے منشا سے کما حقہٗ آگاہ نہیں ہیں جو افواجِ پاکستان نے اٹھایا ہے۔ بلاشبہ حلف اٹھانا محض ایک رسم ہے مگر اس سے کہیں زیادہ اہم جذبے اور دل کی سچائی ہے۔ یہ ایک نہایت اہم رسم ہے اور میں اس موقع پر آپ کی یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے حلف کی عبارت کو دہرانا چاہتا ہوں:-

''میں اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر صدقِ دل سے عہد کرتا ہوں کہ میں آئین اور ڈومینین آف پاکستان کا وفادار رہوں گا-- آئین اور حکومت ڈومینین آف پاکستان کے الفاظ نوٹ کیجئے--اور یہ کہ میں مسلح افواج میں اپنی شرائطِ شمولیت کے مطابق فضا، خشکی یا سمندر میں انتہائی دیانتداری اور وفاداری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دوں گا اور اپنے آفیسر کے تمام احکامات کی تعمیل کروں گا.....

''جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے کہ جذبہ ہی اصل چیز ہے جو اہمیت رکھتا ہے۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ جب آپ یہ کہتے ہیں کہ آپ آئین اور ڈومینین کے وفادار رہیں گے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آپ پاکستان میں نافذ العمل موجودہ آئین کا مطالعہ کریں اور اس کے صحیح آئینی اور قانونی منشا اور معانی کو سمجھیں''۔(حوالہ: میرا بھائی۔ مصنفہ: محترمہ فاطمہ جناحؒ۔ صفحہ 95,92۔ آتش فشاں، لاہور)۔

یہ تنبیہ انہوں نے سٹاف کالج کوئٹہ میں فوجی افسروں سے خطاب کے دوران میں کی تھی۔ پھر بھی آئین کا وفادار رہنے کی بجائے آرمی چیفس جنرل محمد ایوب خاں، جنرل آغا محمد یحییٰ خاں، جنرل محمد ضیاء الحق اور جنرل سید پرویز مشرف آئین توڑتے اور معطل اور غیر فعال کرتے رہے۔ اگر قائداعظمؒ جنرل گریسی کو برطرف کر دیتے اس کے کورٹ مارشل کا آرڈر کرتے، کیا یہ طالع آزما خاموش رہتے؟ قائداعظمؒ نے کہا تھا، جمہوریت مسلمان کے رگ و ریشے میں ہے، یہ چاروں اور ان کے رفقائے کار جمہوریت کا تمسخر اڑاتے رہے۔ ملک میں سیاسی قوتوں کے ساتھ محاذ آرائی کر کے وفاق کو کمزور کرتے رہے۔



قائداعظمؒ اور میجر جنرل (تب لیفٹنٹ کرنل) اکبر خاں ، درمیان میں شاہد حامد

بریگیڈئر اکبر خاں، جو ربانی صاحب کے نزدیک فاتح کشمیر تھے، قائداعظمؒ کی نصیحت کا ان پر کیا اثر ہوا؟ بقول ائر مارشل (ر) اصغر خاں: "14 اگست 1947ء۔ قائداعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کو استقبالیہ دیا۔ مسلح افواج کے افسروں کا ایک گروپ بھی مدعو تھا۔ میں اور اکبر خاں اس میں شامل تھے۔ اکبر خاں کہنے لگے: "چلیں قائدؒ کے ساتھ بات کرتے ہیں"۔ چنانچہ ہم ان کے پاس گئے۔ اکبر خاں نے کہا: "سر، ہم آزادی اور ظہور پاکستان پر بہت خوش ہیں۔ لیکن نئے نظام کے متعلق ہماری امیدیں پوری نہیں ہوئیں۔ ہمارے ہاں ابھی تک وہی نوآبادیاتی ڈھانچہ ہے (انہوں نے خاص طور پر انگریز افسروں کا حوالہ دیا)۔ ہمیں ان کی جگہ اپنے جینئس لوگ لا کر تبدیلی لانی چاہئے"۔ وہ اسی انداز میں بولتا چلا گیا۔ قائدؒ نے اکبر خاں پر حقارت کی نگاہ ڈالی اور اپنے مخصوص انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے اسے ڈانٹا: "دیکھیں! آپ ایک سپاہی ہیں۔ آپ کا کام حکومت پر تنقید کرنا نہیں۔ آپ کو اپنے پیشے کی طرف توجہ دینی چاہئے"۔

(راولپنڈی کانسپریسی 1951ء۔ حسن ظہیر۔ 1998ء۔ صفحہ XIV۔ آکسفورڈ)۔

اس جنرل اکبر خاں نے قائداعظمؒ کی تنبیہ اور رہنمائی کا کیا اثر لیا؟ یہی کہ 1949ء میں ہی جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش تیار کرنا شروع کر دی۔ یہ ہمارے ملک کی پہلی فوجی سازش تھی جس میں ہمارے ترقی پسند شاعر فیض احمد فیض بھی پوری شدومد سے شامل تھے۔

گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ نے افواج پاکستان کو نصیحت کی تھی: "..... مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ اگر کبھی کوئی ایسا وقت آ جائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لئے جنگ لڑنی پڑے تو کسی صورت ہتھیار نہ ڈالیں اور پہاڑوں میں، جنگلوں میں، میدانوں میں اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں"۔ اس کے باوجود جنرل نیازی نے مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈال کر بھارتی وزیراعظم اندرا گاندھی کو اس لغو استدلال کا موقعہ فراہم کیا کہ ہم نے دوقومی نظریہ خلیج بنگال میں ڈبو دیا ہے اور یہ بھی کہ بھارت میں سکول کے بچوں کی نوٹ بکس پر جنرل نیازی کے بھارتی جنرل اروڑا کے آگے ہتھیار پھینکنے کی تصاویر چھاپی گئیں۔

جب جنرل ایوب خاں نے ملک پر مارشل لا نافذ کیا اور سیاست دانوں کو برا بھلا کہنا اور جمہوری اداروں کو تہس نہس کرنا شروع کیا تو ایک غیر ملکی دانشور کا تبصرہ تھا، اب پاکستان پر سے فوجی حکمرانی اس وقت ٹلے گی جب اس فوج کو میدانِ جنگ میں شکست ہوگی۔ لیکن مشرقی پاکستان میں اذیت ناک فوجی شکست کے باوجود جنرل یحیٰی خاں مغربی پاکستان پر اپنا حکومتی قبضہ مستحکم کرنے کی سکیمیں بنا رہا تھا۔ جب اسے بامر مجبوری بچے کھچے پاکستان پر دوسری بڑی سیاسی پارٹی کو اقتدار منتقل کرنا اور خود کو اقتدار سے علیحدہ کرنا پڑا تو صدر ذوالفقار علی بھٹو نے اس کی جگہ 20 دسمبر 1971ء کے روز ہی لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کو

کمانڈر انچیف مقرر کیا، لیکن انہیں دو ماہ بارہ روز بعد 3 مارچ 1972ء کو ہی اس عہدے سے ہٹانا پڑا کہ وہ منتخب صدر کو ہٹا کر اقتدار پر قبضہ کرنے کی منصوبہ بندی کرر ہے تھے۔ اور نہ منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف ایجی ٹیشن کی منصوبہ بندی اور پشت پناہی کرتے، اس کا تختہ الٹتے اور پھانسی پر چڑھاتے وقت حیا جنرل محمد ضیاء الحق کے آڑے آئی۔ رہی سہی کسر جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف کی منتخب حکومت الٹ کر نکال دی۔

قائداعظمؒ کی ثابت قدمی اور انتباہ کا مہم جوؤں نے کیا اثر لیا؟ جو وہ ایک بے گناہ جنرل گریسی کے خلاف خواہ مخواہ کی کارروائی پر لے لیتے۔

اپنی طرف سے بیان کردہ قائداعظمؒ کی دوسری غلطی کے اخیر میں عطار بانی لکھتے ہیں: ''تاریخ ان جکڑ بندیوں اور مجبوریوں پر خاموش ہے جنہوں نے مسٹر جناح جیسے نظم وضبط کے تحت پابند اور ایک مضبوط انسان کو حکم عدولی کرنے والے لیفٹیننٹ جنرل گریسی کے خلاف ایکشن نہ لینے سے روکے رکھا اور بعد ازاں خلاف توقع اسے جنرل کے عہدے تک ترقی دی اور بحیثیت کمانڈر انچیف آف پاکستان آرمی اس کی تقرری کنفرم کی۔ یہ ایک راز ہے اور راز ہی رہے گا، کیونکہ گورنر جنرل نے اس معاملے پر اپنی سوچ میں کسی کو اعتماد میں نہ لیا''۔

یہ راز ہے نہ راز رہے گا۔ قائداعظمؒ کو کسی جکڑ بندی اور مجبوری نے جنرل گریسی کے خلاف اقدام کرنے سے باز نہیں رکھا تھا۔ جب وہ سپریم کمانڈر جنرل آکن لیک کے ساتھ ملاقات کے نتیجے میں اپنا حکم واپس لے چکے تھے تو عملاً انہوں نے جنرل گریسی کے فی الفور کشمیر میں فوج نہ بھیجنے کو درست تسلیم کیا۔ اپنے اس آرڈر سے جو فائدہ قائداعظمؒ اٹھانا اور بھارت کو کارنر کرنا چاہتے تھے وہ انہوں نے کر لیا۔ تو پھر جنرل گریسی کو برطرف کرنے اور اس کا کورٹ مارشل کرنے کا کوئی جواز اور وجہ نہ تھی۔ اگر قائداعظمؒ نے 10 فروری 1948ء کو جنرل گریسی کو کمانڈر انچیف مقرر کیا تو یہ بالکل درست تھا، کیونکہ جنرل گریسی نے پاک فوج کو جس طرح مضبوط کیا وہ ہماری عسکری تاریخ کا ایک تابناک باب ہے۔ اور جنرل گریسی کے بارے میں گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کے فیصلوں اور اقدامات کی توثیق کرتا ہے۔ مثلاً: ''..... برطانوی آفیسرز پر دونوں ڈومینین کے درمیان جنگی اقدامات میں براہِ راست حصہ لینے پر پابندی کے باوجود نئے آرمی چیف جنرل گریسی نے، 20 اپریل 1948ء کو راولپنڈی ڈلیوری کے لئے، کشمیر کی صورت حال کا ایک جائزہ تیار کیا۔ (کراسڈ سورڈز۔ شجاع نواز۔ صفحہ 62۔ بحوالہ: ڈاکومینٹ نمبر C014/58/DMO پاکستان آرمی، جی ایچ کیو، راولپنڈی، آرکائیوز)۔ انہوں نے کشمیر میں بھارتی

افواج کی تیز رفتار اٹھان کی عمومی صورت حال کا خلاصہ تیار کیا۔ اس حساب سے جموں کشمیر میں بھارت کے 8 بریگیڈ گروپ کی مدد کے لئے توپ خانہ، بکتر بند، انجینئر ز، بمبار بلز ا کا اور ٹرانسپورٹ جہاز موجود تھے۔

''گریسی کا تجزیہ'' کے عنوان سے مصنف کراسڈ سورڈ ز لکھتا ہے، بھارتی وزیر دفاع نے 15 مارچ کو ملکی دستور ساز اسمبلی کو بتایا تھا کہ بھارتی فوج اگلے دو یا تین ماہ میں کشمیر کو حملہ آوروں سے پاک کر دے گی۔ راجوڑی میں کی گئی جارحیت پہلے ہی پکڑی جا چکی ہے۔ اس پر گریسی نے لکھا: ''اس کے نتیجے میں خوف و ہراس کا دور چھایا رہا جس میں دیہات نذر آتش، شہری آبادی کا قتل عام اور دیگر انتہائی ظالمانہ اقدامات شامل تھے۔ رپورٹ کے مطابق چار ہزار افراد اس عمل کی بھینٹ چڑھے اور علاقے میں دہشت اور ابتری غیر معمولی طور پر چھائی ہوئی ہے''۔ (صفحہ 62)۔ گریسی کو توقع تھی کہ ''بالکل پاکستانی سرحد تک'' پہنچنے کے لئے بھارت کی طرف سے بہت جلد بھمبر اور میرپور پر بڑا حملہ کیا جائے گا۔

گریسی کو خوف تھا کہ بھارت کی طرف سے ایسی کسی کارروائی سے، جیسا کہ بھارت کے زیر قبضہ آنے والے علاقوں کی شہری آبادی پر حالیہ برے اثرات ہوئے ہیں، پاکستان کو ''بڑے مہاجر مسئلے..... جس طرح کہ راجوڑی کے علاقے میں پہلے ہی ایسی کارروائی ہو چکی ہے'' کا سامنا ہو سکتا ہے۔ گریسی کے خیال میں اس طرح دریائے جہلم کے اس پار منگلا ہیڈ ورکس کا دفاع ناممکن ہو گا اور اگر بھارتی افواج بھمبر اور میرپور پر قبضہ کر لیتی ہیں تو وہ ''دریائے راوی اور چناب عبور کر چکی ہوں گی اور جہلم کا پل ان کی گولہ باری کی زد میں آ چکا ہو گا۔ اس سے پاکستان پر براہِ راست فوجی خطرہ متشکل ہو گا''۔ گریسی کے نزدیک جنوب میں واقع پونچھ کے علاقے تک ایسی ہی صورت پیدا ہو جائے گی کہ آزاد فورسز راجوڑی اور پونچھ کے درمیان کثیر بھارتی فوج کی موجودگی روک نہیں سکیں گی۔ نتیجتاً پاکستان کے خوراک اور دیگر وسائل پر دباؤ بڑھے گا''۔

اطلاعات کے مطابق خود وادیٔ کشمیر میں مظفر آباد اور کوہالہ پر قبضہ کرنے کے لئے بھارت سری نگر۔ بارہ مولا۔ مظفر آباد روڈ پر حملہ کی تیاری کر رہا ہے۔ ایک بار پھر گریسی نے انڈین فورسز کے جدید آلات اور بالادستی، اس کے علاوہ فضا میں ان کی مکمل بالادستی کا ذکر کیا، ''یہ آزاد کشمیر فورسز پر انہیں واضح برتری ہے جو زوردار حملے کی تاب نہیں لا سکتیں''۔ ایسی کارروائی کے عسکری الجھیڑے پاکستان کے لئے بہت برے ثابت ہوں گے۔ چونکہ مظفر آباد یا کوہالہ پر بھارتی قبضے کا مطلب ہو گا کہ بھارتی فوجیں دریائے جہلم عبور کر لیں گی اور وہ ''پاکستان کا عقبی دروازہ کھٹکھٹا رہی ہوں گی''۔ ''ایبٹ آباد، راولپنڈی اور بالآخر پشاور کو عقب سے سنگین اور براہ راست دھمکی کا باعث بنیں گی''۔ مہاجرین کا مسئلہ اتنا ہی شدید ہو گا جتنا کہ

پونچھ میں توقع کیا گیا تھا۔

سیاسی محاذ پر، گریسی کے مطابق، بھارت پٹھان لیڈر خان عبدالغفار خاں کے ساتھ سلسلۂ جنبانی کا آغاز کررہا ہے، جو سرحدی گاندھی کے نام سے معروف ہیں اور بھارتی قیادت کے قریب ہیں۔ بھارتیوں نے افغان حکام کے ذریعے فقیر آف اپی کے ساتھ بھی بات چیت کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ افغان حکام وزیرستان میں وسیع پیمانے پر کشیدگی بھڑکانے کے لئے اسے فنڈز مہیا کررہے ہیں''۔ غفار خاں کے متعلق اطلاعات ہیں کہ وہ فقیر اپی کو پیغامات بھیج رہے ہیں اور دونوں کو دیکھا گیا'' حکومت کا تختہ الٹنے کی متحدہ کوششیں کررہے ہیں''۔ افغانستان کے متعلق بھی اطلاعات ہیں کہ اسے شمال مغربی سرحدی صوبہ میں کشیدگی بھڑکانے کے لئے بھارت سے پشت پناہی اور مالی امداد حاصل ہے۔ (ایضاً صفحہ 62، 63)

جنرل گریسی نے یہ سب کچھ 20 اپریل 1948ء کو پیش کیا۔

کراسڈ سورڈز کے مصنف کی طرح چودھری محمد علی بھی ''ایمرجنس آف پاکستان'' میں گریسی کے تجزیے کا یوں اختتام کرتے ہیں:۔

> القصہ، گریسی کی فراہم کردہ دوررس نتائج کی حامل سفارشات سے صرف یہی واحد نتیجہ نکلتا ہے، کشمیر میں بھارتی فوج کے ساتھ پاکستانی فوج کی جنگ اسی صورت نتیجہ خیز ہوسکتی ہے: ''اگر پاکستان کو بے گھر کئے ہوئے ستائیس لاکھ پچاس ہزار مہاجرین کے ایک اور گمبھیر مسئلے کا سامنا نہیں کرنا، اگر بھارت کو یہ سہولت بہم نہیں پہنچانا کہ وہ عقب اور سامنے سے پاکستان کی دہلیز پر آ بیٹھے اور جب چاہے اس میں داخل ہوجائے، اگر عوامی اور فوجی حوصلہ خطرناک حد تک ڈانواڈول نہیں کرنا، اور اگر تخریبی قوتوں کی پاکستان کے اندر حوصلہ افزائی نہیں کرنی اور انہیں کھلی چھٹی نہیں دینی، تو پھر بھارتی فوج کو اوڑی -- پونچھ -- نوشہرہ کی جنرل لائن سے پرے پیش قدمی کی اجازت نہ دینا ناگزیر ہے۔
>
> (صفحات کراسڈ سورڈز 63 و 64۔ ایمرجنس آف پاکستان 305)۔

چودھری محمد علی مزید لکھتے ہیں: ''حکومت پاکستان نے کمانڈر انچیف کی سفارش منظور کی اور بعض دفاعی پوزیشنوں پر محدود فوج بھیج دی۔ فوج کو ہدایت تھی، ''بھارت کو فوجی طاقت کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کرنے سے روکیں''۔ اس اہم دفاعی کام پر صرف بری فوج ہی تعینات تھی، ائرفورس استعمال نہیں کی گئی۔ یوں بھارت کو فضا میں بلا مقابلہ کنٹرول حاصل تھا۔ اس اور دیگر خامیوں کے باوجود پاکستانی فوج بھارتی حملہ روکنے میں کامیاب رہی''۔ (صفحہ 306)۔

• جنرل سر ڈگلس گریسی کی جگہ 17 جنوری 1951ء کو جنرل محمد ایوب خاں کمانڈر انچیف بنے۔ اس دوران میں جنرل گریسی نے کس طرح انتہائی وفاداری اور فرض شناسی سے پاکستانی فوج کی خدمات سرانجام دیں، اسے مضبوط بنایا اور بھارتی فوجی برتری کے باوجود اس کے مذموم ارادوں کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتے رہے۔ اب تک کی دستیاب معلومات بلکہ دستاویزات کے مطابق یہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ اس کے باوجود عطار بانی انہیں برطرف اور ان کا کورٹ مارشل نہ کرنے پر بلاوجہ اور خواہ مخواہ ہدف تنقید بناتے ہوئے بطور گورنر جنرل اسے قائداعظمؒ کی دوسری غلطی قرار دیتے ہیں جبکہ اوپر بیان کردہ واقعات وشواہد قائداعظمؒ کے فیصلے اور اقدامات کی سخت تائید کرتے ہیں۔

عطار بانی گورنر جنرل آف پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کی ''تیسری غلطی'' کے تحت رقم طراز ہیں:

''پاکستان کی ایک قومی زبان کے انتخاب کا سوال اس نئی ریاست کو درپیش کئی نازک مسائل میں سے ایک تھا۔ آزادی سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کی زبان ہونے کے سبب عمومی تاثر یہی تھا کہ اردو ہماری قومی زبان ہوگی، لیکن تقسیم ہند نے نئے ملک میں آبادی کی ترکیب تبدیل کردی، جس سے ایک پیچیدہ صورت حال پیدا ہوگئی۔ ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان 12 سو میل کا فاصلہ تھا۔ ایک بازو کی آبادی 46 فی صد جبکہ دوسرے بازو کی 54 فی صد تھی۔ ملک کے دونوں بازوؤں میں دو مختلف زبانیں بولی جاتی تھیں۔ چنانچہ زمینی حقیقت یہ تھی کہ ایک بازو میں بولی جانے والی زبان دوسرے میں غیر مانوس تھی''۔

ربانی صاحب ایک طرف فرماتے ہیں: ''پاکستان کی ایک قومی زبان کے انتخاب کا سوال اس نئی ریاست کو درپیش کئی مسائل میں سے ایک تھا''۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں: ''آزادی سے قبل برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت کی زبان ہونے کے سبب عمومی تاثر یہی تھا کہ اردو ہماری قومی زبان ہوگی''۔ جب ایک معاملہ تحریک قیام پاکستان کے دوران میں ہی طے تھا تو پھر اسے نوزائیدہ پاکستان کے لئے ایک نازک مسئلہ کیسے قرار دیا جاسکتا ہے؟ اگرچہ اسے نازک مسئلہ ثابت کرنے کے لئے ربانی صاحب کہتے ہیں: ''لیکن تقسیم ہند نے نئے ملک میں آبادی کی ترکیب تبدیل کردی جس سے ایک پیچیدہ صورت حال پیدا ہوگئی''۔ کیا ترکیب بدلی؟ یہی کہ جو علاقے پاکستان کا حصہ بنے وہاں سے ہندو سکھ نقل مکانی کرکے بھارت چلے گئے۔ اور برصغیر کے اقلیتی صوبوں، جہاں اردو بولی جاتی تھی اور مشرقی پنجاب کی مسلم آبادی کو پاکستان میں دھکیل دیا گیا۔ جب ربانی صاحب خود تسلیم کرتے ہیں کہ قیام پاکستان کی صورت میں اس ملک کی ممکنہ زبان اردو تھی اور یہ بھی حقیقت کہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی شناخت تھی اور اس پر ہندو کانگریس قیادت بھی سخت تعصب کا شکار رہی تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ تقسیم ہند کے بعد

نئے ملک میں آبادی کی ترکیب بدلنے سے ایک پیچیدہ صورت حال پیدا ہوگئی۔ بلکہ ترکیب کی یہ تبدیلی بھی اردو کے حق میں جاتی تھی کہ اردو کے مقابلے میں ہندی کو اپنی زبان قرار دینے والے تو یہاں سے چلے گئے تھے۔ ان کی جگہ وہ لوگ یعنی مسلمان آ گئے جن کی شناخت اردو تھی۔ اس لئے قومی زبان کی صورت میں نوزائیدہ پاکستان کو نازک صورت حال قطعاً درپیش نہ تھی۔

عطا ربانی صاحب کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان کی زبان بنگالی تھی جبکہ مغربی پاکستان کی اردو۔ حالانکہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان میں الگ الگ زبانیں رائج تھیں۔ پھر ایک صوبے میں ایک سے زائد زبانیں مستعمل تھیں۔ اس لئے اردو کو مغربی پاکستان کے صوبوں میں روزمرہ کی اور رائج زبان قرار نہیں دیا جا سکتا، اور یہ صورت قیام پاکستان سے قبل بھی قائم تھی۔ پھر بھی اردو کو مسلمانوں اور تحریک قیام پاکستان کے دوران میں پاکستان کی زبان سمجھا جاتا تھا۔ اور پاکستان موومنٹ کے دوران میں قومی قیادت، جس کا تعلق مختلف علاقوں اور صوبوں سے تھا، جب پورے متحدہ ہندوستان کا دورہ کرتی تو اس کا ذریعۂ اظہار اردو ہوتا۔ اسی لئے، متحدہ ہندوستان کی آخری مردم شماری کے موقعہ پر اور ویسے بھی متحدہ ہندوستان کے مسلمان اپنی زبان اردو قرار دیتے رہے۔ ربانی صاحب نے مشرقی پاکستان کی بات کی ہے، متحدہ بنگال کی مسلم قیادت خود اردو کانفرنسوں میں شریک ہی نہیں ہوتی رہی ان کی صدارت کرتی رہی اور اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیتی رہی۔ اور بنگال میں اردو بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ برصغیر کے دوسرے حصوں کی طرح اگر بنگال میں بھی اردو کی کوئی مخالفت کرتا تھا تو وہ ہندو عناصر تھے۔

اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ سعد راشد الخیری نے ''آپ بیتی جگ بیتی''۔ 2004ء۔ صفحہ 33، 34 پر بیان کیا ہے: دلی میں سردیوں کے موسم میں سیاسی سرگرمیاں زوروں پر ہوتیں اور بڑے بڑے عمائدین آتے جن کو اپنے کالج میں بلانا کوئی مشکل نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ 39-1938ء میں مولوی فضل الحق کو، جو اس وقت بنگال کے وزیر اعلیٰ تھے، ہم نے مدعو کیا۔ انہوں نے اپنی تقریر میں اردو کی حمایت کرتے ہوئے کہا کہ ''جب میں نے بنگال اسمبلی میں کہا کہ تم لوگوں کو اردو سیکھنی پڑے گی تو ہندوؤں نے بڑا واویلا کیا اور کہا کہ یہ ہماری مادری زبان نہیں ہے۔ اس پر میں نے کہا کہ ہاں مادری زبان نہیں ہے، لیکن پدری زبان تو ہے''۔

مشرقی بنگال، جو پاکستان موومنٹ کے زمانے میں عوامی سطح پر ایسٹرن پاکستان کہلاتا تھا، کی اگر اردو کے لئے خدمات اور وہاں اردو بلکہ فارسی تک کی اہمیت اور رواج کا اگر میں ذکر لے بیٹھوں تو میرے پاس اس قدر مواد ہے کہ اس پر اچھی خاصی کتاب، جو ہو سکتا ہے ایک سے زائد جلدوں میں ہو، تیار ہو سکتی ہے۔

لیکن یہ کام اداروں کا ہے فرد واحد کدھر کدھر جائے۔

اس لئے عطار بانی کا یہ کہنا خلاف واقعہ ہے کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہی نہ تھی ایک کی دوسرے کے ہاں غیر مانوس بھی تھی۔ پھر تو جیسا کہ میں ذکر کر چکا ہوں، مغربی پاکستان کے بھی چار صوبے تھے اور چاروں صوبوں کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور ایک دوسرے کے لئے غیر مانوس بھی۔ حیرت ہے عطار بانی صاحب اردو کو برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریتی زبان تسلیم کرتے ہیں لیکن پاکستان بن جانے کے بعد وہی زبان ان کے نزدیک غیر مانوس ہو جاتی ہے۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی، کیونکہ اس کے قومی زبان قرار دیئے جانے سے قبل بھی یہی رابطے کی زبان تھی۔ یہ 2 فی صد آبادی کی زبان نہ تھی۔

اس کے بعد عطار بانی اپنے اصل مقصد کی طرف آتے ہیں اور انہیں اس پر سخت اعتراض بھی ہے کہ:

''گورنر جنرل نے مارچ 1948ء میں اپنے دورۂ مشرقی پاکستان کے موقعہ پر مشرقی بازو کی قیادت کو اعتماد میں لئے بغیر پلٹن میدان ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام سے خطاب کے دوران میں محض دو فیصد آبادی کی زبان اردو کو قومی زبان قرار دیدیا۔ ایسا قومی یکجہتی کی امید پر کیا گیا، لیکن اس کا برا مانا گیا اور اسے غلط سمجھا گیا۔ دیگر امور کو ایک طرف رکھیں، ملک کی اکثریتی آبادی، جو اردو پڑھ، لکھ اور بول نہیں سکتی تھی، پر اردو کے بحیثیت قومی زبان نفاذ نے مشرقی بازو، جو پاکستان کی کل آبادی کے 54 فیصد پر مشتمل تھا، کو برگشتہ کر دیا۔ بنگالیوں کے خیال میں اس اقدام سے ان کی زبان اور ثقافت کو کچلا جا رہا تھا۔ وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھے کہ یہ قدم ان کے حقوق کی تکذیب ہے، جبکہ اکثریت ہونے کے ناتے ان کا یہ دعویٰ منطقی طور پر درست تھا کہ بنگالی کو پاکستان کی مشترکہ زبان قرار دینا چاہئے تھا۔ انہوں نے جلسے میں غدر مچایا اور بعد ازاں وہاں تصادم ہوئے اور تین طلبہ مارے گئے۔ مزید برآں یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے قائداعظمؒ کے فیصلے کے خلاف عوامی سطح پر آوازیں بلند کی''۔

مسٹر عطار بانی کے اس بیان کے مختلف اجزا کا ہم ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں۔ اولاً یہ کہ بقول ان کے، گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ نے مشرقی پاکستانی قیادت کو اعتماد میں لئے بغیر پلٹن میدان ڈھاکہ میں 2 فی صد آبادی کی زبان اردو کو قومی زبان قرار دیدیا۔

یہ موصوف کی حقائق سے سراسر لاعلمی اور جہالت ہے۔ قائداعظمؒ نے مشرقی پاکستان ہی نہیں پوری



قائداعظمؒ پاکستان دستور ساز اسمبلی کی صدارت کرتے ہوئے

قوم کی قیادت کو اعتماد میں لے کر یہ اعلان کیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ قوم سے منتخب عوامی نمائندوں کی خواہش اور فیصلے کا احترام کرتے ہوئے انہوں نے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا تھا۔ اس کی تفصیل اس طرح ہے:۔

بدھوار، 25 فروری 1948ء۔ اسمبلی چیمبر کراچی میں پاکستان دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ قائداعظمؒ پاکستان دستور ساز اسمبلی کے صدر تھے۔ یہ اجلاس ان کی زیر صدارت ہوا۔ اس اجلاس میں مشرقی پاکستان، جو اس وقت مشرقی بنگال کہلاتا تھا، کی طرف سے ہندو رکن اسمبلی مسٹر دھریندر ناتھ دتہ نے تحریک پیش کی: ''کہ رول 29 کے سب رول (1) سطر 2 میں لفظ ''انگلش'' کے بعد ''یا بنگالی'' کے الفاظ شامل کئے جائیں''۔ اس کے بعد مسٹر دتہ صدر اسمبلی سے اجازت طلب کرتے ہیں۔ ''کیا میں ایک اور تحریک پیش کر سکتا ہوں جیسا کہ ان دونوں پر اکٹھا غور ہو سکتا ہے کہ یہ ایک ہی رول سے متعلق ہیں؟''۔

مسٹر پریذیڈنٹ (قائداعظم محمد علی جناحؒ): ''میرے خیال میں آپ ان دونوں کو اکٹھا نہیں الگ الگ لیں۔ آپ اسے ایجنڈے پر آئٹم نمبر 2 رکھ سکتے ہیں۔ یہ کہہ کر

قائداعظمؒ (صدر اسمبلی) نے کہا: اپنی پہلی ترمیم کی طرف آیئے۔

مسٹر دھریندر ناتھ دتہ: سر، مجھے بولنے کی اجازت ہے؟

مسٹر پریذیڈنٹ: ہاں، بولیں۔

اس کے بعد مسٹر دھریندر ناتھ دتہ اپنی ترمیم پیش کرتے ہیں۔

''مسٹر پریذیڈنٹ، سر، تحریک جو میرے نام سے ہے، اسے پیش کرتے ہوئے میں ایوان کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایسا تنگ نظر صوبائیت کے تحت نہیں کر رہا بلکہ سر، میں اس جذبے کے تحت پیش کر رہا ہوں کہ اس تحریک کو حاضر ارکان کی طرف سے پورا غور و فکر ملے گا۔ سر، میں جانتا ہوں، بنگالی ایک صوبائی زبان ہے، لیکن جہاں تک ہماری ریاست کا تعلق ہے یہ ریاست کے اکثریتی عوام کی زبان ہے، لہٰذا اگرچہ یہ صوبائی زبان ہے، ہماری ریاست کے اکثریتی عوام کی زبان ہونے کے سبب اس کی حیثیت مختلف ہو جاتی ہے۔ اس ریاست کے 6 کروڑ 90 لاکھ باشندوں میں سے 4 کروڑ 40 لاکھ لوگ بنگالی زبان بولتے ہیں۔ لہٰذا، سر، ریاست کی سرکاری زبان کونسی ہونی چاہئے؟ ریاست کی سرکاری زبان وہی ہونی چاہئے جسے ریاست کی اکثریت استعمال کرتی ہو۔ اس کے لئے میں سمجھتا ہوں، سر، بنگالی زبان ہماری ریاست کی Lingua Franca (رابطے کی زبان۔ مشترکہ زبان۔ بین الاقوامی زبان) ہے۔ یہ مؤقف اختیار کیا جاسکتا ہے۔ حتیٰ کہ ہماری سسٹر ڈومینین میں بھی صوبائی زبانوں نے رابطے کی زبان کا

مقام حاصل نہیں کیا، کیونکہ ہماری ایسٹرن ڈومینین آف انڈیا میں دستور ساز اسمبلی کی کارروائی ہندوستانی، ہندی یا اردو یا انگریزی میں ہوتی ہے۔ یہ بنگالی زبان میں نہیں ہوتی، لیکن جہاں تک بنگالی کا تعلق ہے ایسٹرن ڈومینین کے 30 کروڑ باشندوں میں سے ڈھائی کروڑ بنگالی زبان بولتے ہیں۔ ہندوستانی، ہندی یا اردو کو ایسٹرن ڈومینین میں باوقار مقام حاصل ہے، کیونکہ انڈین ڈومینین کی اکثریت یہ زبان بولتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اس پر غور کرنا ہے کہ اگر ہماری ریاست میں عوام کی اکثریت یقینی طور پر بنگالی زبان بولتی ہے تو پھر بنگالی کو مرکزی حکومت میں بھی ایک باوقار مقام ملنا چاہئے۔

''سر، میں جانتا ہوں میں اپنی مملکت کی اکثریت (Vast Millions) کے جذبات کی ترجمانی کر رہا ہوں، اس اثنا میں میں اپنی ریاست کی واضح اکثریت (Vastest Millions) کے جذبات سے ایوان کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ حتیٰ کہ، سر، ایسٹرن پاکستان میں جہاں 4 کروڑ 40 لاکھ کی تعداد میں لوگ بنگالی زبان بولتے ہیں، عام آدمی اگر ایک ڈاک خانے میں بھی جائے اور وہاں منی آرڈر فارم مانگے تو وہ دیکھے گا منی آرڈر فارم بنگالی زبان میں نہیں بلکہ اردو زبان میں چھپا ہوا ہوگا یا وہ انگریزی میں چھپا ہوگا۔ ایک غریب کسان، جس کا بیٹا ڈھاکہ یونیورسٹی میں طالب علم ہے، اور وہ اسے پیسے بھیجنا چاہتا ہے، گاؤں کے ڈاک خانے میں جا کر منی آرڈر فارم کا تقاضا کرتا ہے، اسے پتہ چلتا ہے منی آرڈر فارم تو اردو زبان میں ہے۔ وہ منی آرڈر نہیں بھیج سکتا، بلکہ اسے دور دراز کے قصبے کی طرف بھاگنا ہوگا۔ وہاں وہ اس منی آرڈر فارم کا ترجمہ کرائے گا تب کہیں وہ منی آرڈر کرے گا۔ سر، اسے اپنے بیٹے کو پیسے بھیجنے کے لئے ایسا کرنا لازمی ہے۔ سر، غریب کسان زمین کا ٹکڑا بیچنا یا خریدنا چاہتا ہے اور سٹامپ فروش کے پاس جاتا ہے اور اسے پیسے ادا کرتا ہے لیکن اسے علم نہیں کہ اس نے اسٹامپ فروش کو جتنے پیسے ادا کئے ہیں اتنی قیمت کا اسٹامپ اسے مل گیا ہے کہ نہیں، اس لئے کہ، سر، سٹامپ کی ویلیو بنگالی میں نہیں اردو اور انگریزی میں لکھی ہوتی ہے۔ لیکن، سر، وہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے سٹامپ کی اصل ویلیو وصول کر لی ہے۔ ہماری ریاست کے عام آدمی کو یہ مشکلات درپیش ہیں۔ ریاست کی زبان ایسی ہونی چاہئے جو ریاست کے عام افراد کی سمجھ میں آ جائے۔ سر، ریاست کے 4 کروڑ 40 لاکھ عام افراد دیکھتے ہیں کہ اس اسمبلی، جو ان کی پارلیمنٹس کی ماں ہے، کی کارروائی اس زبان میں ہو رہی ہے، سر، جو ان کے لئے اجنبی ہے۔ پھر، سر، انگریزی کو رول 29 میں باوقار مقام حاصل ہے۔ سر، میں جانتا ہوں، انگریزی کو باوقار مقام اس کی بین الاقوامی حیثیت کے سبب ملا ہے۔

''لیکن، سر، اگر انگریزی رول 29 میں باوقار مقام حاصل کر سکتی ہے -- کہ اسمبلی کی کارروائی اردو یا

انگریزی میں ہوگی تو، سر، پروسیجر رول کے رول 29 میں بنگالی زبان، جسے 4 کروڑ 40 لاکھ افراد بولتے ہیں، کیوں نہیں باوقار مقام حاصل کرسکتی۔ لہٰذا سر، میں جانتا ہوں کہ میں اپنی ریاست کی وسیع آبادی (Vast Millions) کی ترجمانی کررہا ہوں، اس لئے بنگالی کے ساتھ صوبائی زبان کا سلوک نہ کیا جائے۔ اسے ریاست کی زبان کا درجہ دیا جائے۔ سر، اس لئے میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ رول 29 میں لفظ ''انگلش'' کے بعد ''یا بنگالی'' کے الفاظ شامل کئے جائیں۔

''سر، میں ایوان کو رد کے رکھنا نہیں چاہتا لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہاں موجود ارکان ہماری ریاست کی وسیع آبادی (Vast Millions) کے جذبات پر غور و خوض کریں۔ اور جو ترمیم میں نے پیش کی ہے، اسے قبولیت بخشیں''۔

مسٹر دتہ جن کی اس تحریک کی مشرقی پاکستان کے ہی ایک ہندو رکن اسمبلی مسٹر پریم ہری برمانے تائید کی، وزیراعظم و وزیر دفاع لیاقت علی خاںؒ (مشرقی بنگال)، سردار عبدالرب نشتر (سرحد)، راجہ غضنفر علی خاں (پنجاب)، خواجہ ناظم الدین (مشرقی بنگال)، محمد ہاشم گزدر (سندھ)، مولوی تمیز الدین خاں (مشرقی بنگال) نے اپنی تقاریر میں اس کا بھرپور تجزیہ کیا۔ ان معزز ارکان اسمبلی کے نقطہ ہائے نظر پیش کرنے سے پہلے میں مسٹر دھریندر ناتھ دتہ کی تحریک کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہوں گا، جن کا ان معزز ارکان نے نوٹس نہیں لیا یا بھرپور توجہ نہیں دی۔

اولاً، مسٹر دتہ اپنی اس تحریک کا آغاز اس جملے سے کرتے ہیں: ''میں ایسا صوبائی تنگ نظری کے تحت نہیں کررہا''۔ اس ابتدائی جملے سے قاری کا فی الفور ماتھا ٹھنکتا ہے کہ انہیں ایسا کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ وہ یہ تحریک پیش کرنے پر اس قدر Guilty Conscious (احساس جرم کا شکار) کیوں ہیں؟ صاف ظاہر ہے ان کا مقصد صوبائی تنگ نظری کو ہوا دینا تھا، کیونکہ جب وہ اردو کی جگہ بنگالی کو قومی زبان قرار دینے پر زور دیتے ہیں تو وہ ایک یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ جب ایک غریب بنگالی کسان کو ڈھاکہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم اپنے بیٹے کو منی آرڈر کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو اسے جو منی آرڈر فارم دیا جاتا ہے وہ اردو یا انگریزی میں ہوتا ہے جن سے وہ نابلد ہے، دوسرے ایک غریب بنگالی کسان کو زمین کا ایک ٹکڑا خریدتے یا بیچتے وقت جس اسٹامپ پیپر سے واسطہ پڑتا ہے تو وہ بھی اردو اور انگریزی میں ہوتا ہے۔

بنگالی کو قومی زبان بنائے جانے کے حق میں ہندو کانگریسی رکن اسمبلی مسٹر دتہ نے اپنے تئیں یہ بھی بڑی ٹھوس دلیل دی۔ حالانکہ یہ سطحی دلیل ہے۔ پہلی بات یہ کہ 25 فروری بروز بدھ، 1948ء، پاکستان میں خواندگی کا تناسب کیا تھا؟ 1947ء میں یہ تناسب گیارہ فی صد تھا۔ اس میں وہ لوگ بھی خواندہ شمار

ہوتے تھے جو محض اپنے دستخط کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ پھر مغربی پاکستان کے مقابلے میں مشرقی پاکستان میں یہ تناسب بہت کم تھا کہ وہاں شدید غربت کے باعث مسلمان اپنے بچوں کو تعلیم نہیں دلوا سکتے تھے۔ جب خواندگی کا تناسب یہ تھا تو منی آرڈر کرنے والے اور زمین کا کوئی ٹکڑا خریدنے یا بیچنے والے ایک غریب بنگالی کسان کے لئے چاہے وہ منی آرڈر فارم یا اسٹامپ پیپر بنگالی زبان میں ہی کیوں نہ ہو، ایک ہی بات تھی۔ اس کے لئے انگریزی، اردو، بنگالی ایک ہی صف میں تھیں۔ جیسا کہ مغربی پاکستان میں تھا کہ ان پڑھ شخص کو ایسی صورت میں کسی پڑھے لکھے فرد کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا اور آج بھی ایسا ہی ہے۔

مسٹر دتہ کی تحریک میں صوبائی تنگ نظری کا زہریلا بیج بونے کی بو اس لئے بھی آتی ہے کہ ایک منی آرڈر فارم یا اسٹامپ پیپر کو بنگالی میں چھاپنے کے لئے بنگالی کا قومی زبان قرار دیا جانا کیونکر ضروری ٹھہرتا ہے، جبکہ ناخواندگی کا یہی مسئلہ پاکستان کے دوسرے صوبوں اور علاقوں میں بھی پوری شد و مد سے موجود تھا۔

اس تحریک میں صوبہ پرستی اور مرکز گریز رجحان کا زہر اس لئے بھی گھلا ہوا ملتا ہے کہ اس کے بعد پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے لئے اپنی اپنی زبان کو قومی زبان قرار دینے کی سوچ پنپ سکتی تھی۔ اس طرح صوبائی زبانوں کو قومی قرار دینے کا پنڈورا باکس کھل جاتا۔ اور بات یہیں نہ رکتی، قوم میں انتشار اس وقت خوفناک رخ اختیار کرتا جب ایک ہی صوبے میں رائج دوسری زبانیں بولنے والے بھی دھریندر ناتھ دتہ بن جاتے، کیونکہ ہر صوبے کے مختلف حصوں کی اپنی اپنی زبان ہے۔

اردو جو پورے برصغیر میں بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی تھی، وہ تو مسٹر دھریندر ناتھ دتہ کو نظر نہیں آتی، اسے تو وہ بیک جنبشِ قلم قومی منظر سے ہٹانا چاہتے ہیں لیکن انگریزی کے متعلق ان کا ارشاد ہے: "انگریزی نے باوقار مقام اپنے بین الاقوامی تشخص سے حاصل کیا ہے"۔

مشرقی بنگال سے ایک اور ہندو رکن اسمبلی پریم ہری برمانے دھریندر ناتھ دتہ کی ترمیمی تحریک کی حمایت میں یہ بھی کہا: "سر، اس ترمیم کا مقصد انگریزی یا اردو کو کلیتہً بے دخل کرنا نہیں۔ بلکہ یہ چاہتی ہے کہ ارکان اسمبلی کے لئے بنگالی زبان بھی ذریعۂ اظہار ہو"۔

اب ہم مسٹر دھریندر ناتھ دتہ کی اس تحریک کے جواب میں ارکان اسمبلی کے دلائل پیش کرتے ہیں:

قائد ایوان خان لیاقت علی خان (وزیر اعظم و وزیر دفاع) نے کہا: "میں نے فاضل محرک کی اپنی ترمیم پر کی گئی تقریر بہت زیادہ احتیاط اور توجہ سے سنی ہے۔ کاش معزز رکن نے یہ ترمیم پیش نہ کی ہوتی اور پاکستان کے مختلف حصوں میں غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی۔ میرے معزز دوست نے دھواں دھار تقریر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ حقیقتاً بنگالی پاکستان کی قومی زبان ہونی چاہئے۔ دوسرے لفظوں

میں وہ صرف بنگالی کو اس ایوان میں ذریعۂ اظہار نہیں چاہتے۔ لیکن انہوں نے بلاشبہ ایک بہت اہم سوال اٹھادیا ہے۔ انہیں احساس کرنا چاہئے کہ پاکستان اس برصغیر کے دس کروڑ مسلمانوں کے مطالبے کے باعث وجود میں آیا ہے اور دس کروڑ مسلمانوں کی زبان اردو ہے۔ اس لئے اب ان کی طرف سے یہ صورت حال پیدا کرنے کی کوشش کرنا غلط ہے، چونکہ پاکستان کے عوام کی اکثریت کا تعلق پاکستان کے ایک حصے سے ہے، اس لئے جو زبان وہاں بولی جاتی ہے وہ پاکستان کی قومی زبان ہونی چاہئے۔ پاکستان ایک مسلم ریاست ہے۔ اس کی قومی زبان وہی ہونی چاہئے جو مسلم قوم کی زبان ہو۔ میرے معزز دوست اس پر ناراض ہیں کہ انگریزی کی جگہ اردو کیوں لائی جارہی ہے۔ اس میں نیت یہ ہے کہ انگریزی، جو اتنا طویل عرصہ سرکاری زبان رہی ہے، کی جگہ اردو کو سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ سر، جب تک انگریزی سرکاری زبان رہی میرے معزز دوست نے کبھی اس کا برا نہیں مانا، کبھی بنگالی کے لئے اصرار نہیں کیا۔ میں نے سالہا سال کے دوران میں مرکزی اسمبلی میں بنگال سے کسی رکن کی طرف سے کوئی آواز بلند ہوتے نہیں سنی کہ بنگالی سرکاری زبان ہونی چاہئے۔ میں جاننا چاہوں گا آج یہ آواز کیوں بلند کی جارہی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ معزز رکن نے یہ سوال اٹھانا ضروری جانا ہے۔ ہم بنگالی کی اہمیت یقینی طورر پر سمجھتے ہیں۔ بنگالی کو بنگال سے مکمل طور پر بے دخل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ کسی کی طرف سے غلط ہوگا کہ وہ کسی دوسرے صوبے کے عوام پر ایک ایسی زبان تھونپے جو اس صوبے کی مادری زبان نہ ہو، لیکن ساتھ ہی ہماری ایک قومی زبان ضرور ہونی چاہئے۔۔ ایسی زبان جو بین الصوبائی رابطوں کے لئے پاکستان کے مختلف حصوں کے مابین استعمال کی جاسکتی ہو۔ سر، صرف آبادی کو زیرِغور نہیں لانا ہوگا۔ اور بھی کئی عوامل ہیں۔ اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو ایسٹ بنگال یا ایسٹرن زون اور مغربی زون کے عوام کو اکٹھا رکھ سکتی ہے۔ ایک قوم کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ایک زبان ہو اور وہ زبان کوئی اور نہیں صرف اردو ہی ہوسکتی ہے۔ سر، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، حکومت یا کسی بھی فرد کا بنگالی کو ختم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ حقیقت کے طور پر میں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے اور طویل تجربے کی بنیاد پر یہ میرا ذاتی نقطۂ نظر ہے کہ آپ کو ایک بچہ اس کی مادری زبان کے علاوہ کسی اور زبان میں پڑھانا نہیں چاہئے۔ ایک ملک کے ہر حصے میں وہاں کی مادری زبان ذریعۂ تعلیم ہونی چاہئے۔ مجھے پورا احساس ہے کہ آنے والے برسوں میں یہ محض ایک خواب ہوگا۔۔ اگر کوئی ایسا خواب دیکھتا ہو۔۔ یہ سوچنا کہ اردو بنگال میں مکمل طور پر بنگالی کی جگہ لے لے گی، ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ لہٰذا، سر، مجھے افسوس ہے میں ترمیمی تحریک سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اس ترمیم کے لئے نوٹس دیا گیا تو مجھے خیال گزرا کہ اس کا مقصد سادہ

(Innocent) ہے۔ بنگالی کو شامل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ایسے لوگ جنہیں انگریزی یا اردو پر عبور نہیں اپنے خیالات کا اس زبان میں اظہار کر سکتے ہیں، لیکن مجھ پر اب عیاں ہوا، مقصد اس قدر سادہ نہیں، جیسا میں نے خیال کیا تھا۔ اس ترمیم کا مقصد پاکستانی عوام کے درمیان دراڑ پیدا کرنا ہے۔ ترمیم کا مقصد مسلمانوں کو یکجا کرنے والی اس قوت سے محروم کرنا ہے جو انہیں اکٹھا کرتی ہے''۔

خان لیاقت علی خانؒ کے اس اظہار پر مسٹر دھریندر ناتھ دتہ نے کہا، اس کا مقصد یقیناً یہ نہیں۔ اس پر لیاقت علی خانؒ نے کہا: ''میرے معزز دوست اپنی باقی ماندہ زندگی میں سوال کرتے رہیں گے۔ وہ ایسا کر چکے ہیں۔ کیا بنگال کے عوام کے لئے ضروری نہ تھا-- بنگالی بولنے والے عوام-- کہ وہ متحد رہتے؟ نہیں، اس لئے کہ یہ ایک ایسی ریاست تشکیل پا رہی تھی جہاں مسلمان اکثریت میں تھے۔ لہٰذا بنگال کو تقسیم ہونا تھا۔ اس وقت بنگالی زبان یا بنگالی ثقافت کے سوال پر غور نہیں ہوا۔

سردار عبدالرب نشتر نے مسٹر دتہ کی اس تحریک پر کہا، معزز رکن نے تفریق پیدا کرنے کے لئے رائے دی ہے۔

قائد ایوان لیاقت علی خانؒ نے اپنی تقریر کا خاتمہ ان الفاظ سے کیا: ''تاہم، مجھے اس کے اُس حصے کے متعلق تشویش نہیں، میں سمجھتا ہوں میرے معزز دوست کی طرف سے یہ سوال اٹھانا غلط ہے۔ درحقیقت یہ بڑا اہم مسئلہ ہے، یہ صرف پاکستان ہی نہیں پورے برصغیر کی مسلمان قوم کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور میں پیش کی گئی اس تحریک کی پُرزور مخالفت کرتا ہوں۔ میں امید کرتا ہوں کہ اگر کبھی مستقبل میں بھی اس قسم کی کوئی تحریک پیش کی گئ ‌یوان اس کی حمایت نہیں کرے گا۔

مشرقی بنگال سے ایک اور ہندو رکن اسمبلی بھوپندر کمار دتہ نے بھی دھریندر ناتھ دتہ کی تائید کی اور یہ بھی کہا، ''انڈین یونین میں آبادی کے سب سے بڑے طبقے کی زبان اختیار کی گئی ہے''۔ اس پر ایوان میں بیشمار آوازیں ابھریں: Question, Question (سوال۔سوال)۔ بھوپندر کمار دتہ کا یہ بھی کہنا تھا: ''یہ ہر لحاظ سے برصغیر کی الفاظ سے مالا مال زبان ہے''۔

اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بنگالی زبان اس قدر طاقتور تھی تو بھارت نے اسے کیوں نہ سرکاری زبان قرار دیا۔ جبکہ ترمیمی تحریک کے محرک دھریندر ناتھ دتہ اپنی تقریر میں تسلیم کر چکے تھے کہ وہاں اسمبلی کارروائی ہندوستانی، ہندی یا اردو یا انگریزی میں ہوتی ہے۔ بھوپندر کمار دتہ کے نقطۂ نظر پر بھی لیاقت علی خانؒ کی زبان میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں کسی بھی بنگالی اسمبلی ممبر نے کبھی اسے سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔

اس ترمیم کے محرک اور اس کے حامیوں کا مرکزی اسمبلی میں بنگالی کے ذریعہ اظہار کی آڑ میں سارا زور بنگالی کو قومی زبان بنانے پر رہا۔

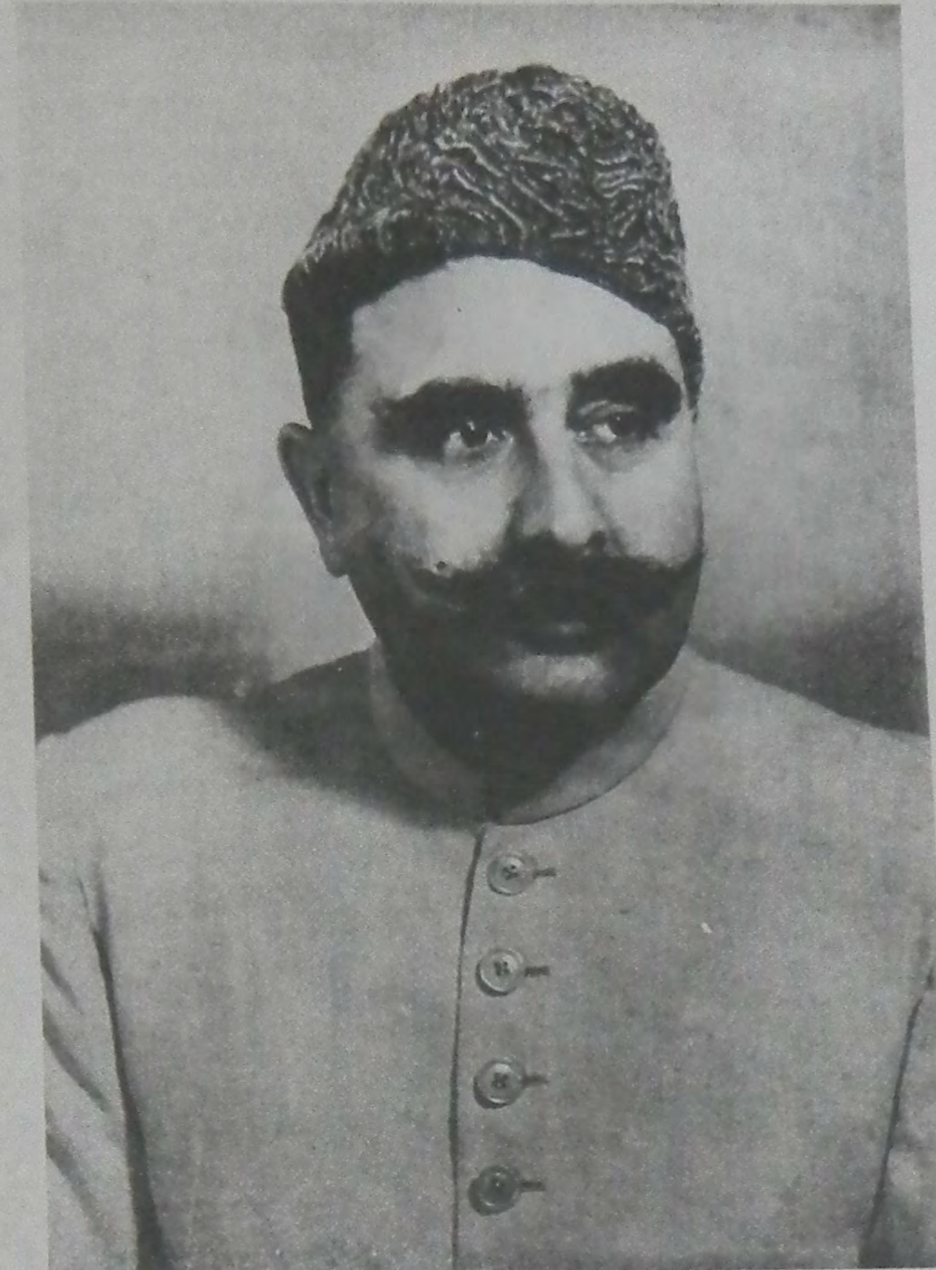
اس آڑ پر اظہار خیال کرتے ہوئے وزیر مہاجرین و بحالیات راجہ غضنفر علی خاں نے کہا: "درحقیقت، اگر کوئی رکن بنگالی زبان کو ایوان میں ذریعہ اظہار بنانا چاہے تو اس پر کوئی قدغن نہیں۔ میں معزز ارکان کو یاد دلا دوں: رول 29 کی رو سے جو معزز رکن اردو یا انگریزی میں اظہار خیال کرنے پر قادر نہ ہو چیئرمین اسے اس کی مادری زبان میں اسمبلی کو خطاب کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ چنانچہ رول، جیسا کہ اس میں درج ہے کوئی بنگالی رکن جو اردو یا انگریزی میں اظہار خیال کی قدرت نہ رکھتا ہو، چیئرمین کی اجازت سے بنگالی میں اظہار خیال کر سکتا ہے۔ لہٰذا، سر، جہاں تک موجودہ رول کا تعلق ہے، پیش کیے گئے دلائل غیر متعلقہ ہیں۔ جہاں تک کسی ایک خاص صوبے کی زبان کو اہمیت دینے کا سوال ہے کیا میں اس ترمیم کے محرک سے پوچھ سکتا ہوں کہ اگر دوسرے ارکان نے اس نوع کی ترامیم پر مشتمل تحاریک پیش کر دیں کہ "پنجابی"، "پشتو"، اور "سندھی" کو بھی رول میں شامل کیا جائے تو ایسی تجویز پر رد عمل کیا ہوگا؟"۔

بھوپندر کمار دتہ نے کہا: "ریاست کے عوام کی اکثریت کی زبان ہونی چاہئے"۔

جب رول 29 میں واضح طور پر درج تھا کہ جس رکن اسمبلی کو اردو یا انگریزی پر عبور نہ ہو وہ اپنی مادری زبان میں اظہار خیال کر سکتا ہے تو پھر اسمبلی میں بنگالی زبان کی آڑ میں اسے قومی زبان بنانے پر جو زور دیا گیا واضح طور پر وہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت تھا اور اس میں ہندو ارکان ہی مصر تھے جبکہ مسلمان بالخصوص بنگالی ارکان اردو کو ہی قومی زبان قرار دیئے جانے کے حامی تھے اور پورے دلائل اور شد و مد کے ساتھ۔

راجہ غضنفر علی خاں نے ایک دوسری شرارت کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا: "..... میں اپنے معزز دوست پر واضح کر دوں کہ جب وہ ریاست بنگال کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو وہ شدید غلطی پر ہیں۔ یہاں بنگال نام کی کوئی ریاست نہیں۔ یہاں صرف ایک ہی ریاست ہے اور وہ ریاست پاکستان ہے اور یہ تمام صوبے سٹیٹ آف پاکستان کے مختلف صوبے ہیں۔ یہاں ایک ہی ریاست ہے اور اس کی ایک ہی زبان ہونی چاہئے، قومی زبان، اور وہ اردو ہے..... سوال یہ نہیں کہ آیا اردو پنجابی زبان ہے یا یہ مغربی پاکستان کی زبان ہے۔ اردو پنجاب کی زبان یا بولی نہیں، یہ سندھ کی بولی نہیں، یہ شمال مغربی سرحدی صوبے کی بولی نہیں، بلکہ یہ مسلم ثقافت اور مسلم تہذیب کی زبان ہے۔ لہٰذا یہ ہماری قومی زبان ہے"۔

مسٹر دھریندر ناتھ دتہ نے اپنی ترمیمی تحریک میں منی آرڈر فارم بنگالی زبان میں نہ ہونے کو بہت بڑا مسئلہ قرار دیا تھا، اس پر راجہ غضنفر علی خاں نے کہا: "میں اپنے معزز دوست کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک



سردار عبدالرب نشتر



خواجہ ناظم الدین

منی آرڈر وغیرہ کا مسئلہ ہے، یہ معمولی نوعیت کی چیزیں ہیں۔ منی آرڈر فارم یا ٹیلی گرام فارم معمولی نوعیت کے معاملات ہیں اور مجھے ذرہ بھر شبہ نہیں کہ اگر یہ معاملات مناسب وقت پر اور مناسب طریق سے ایوان کے نوٹس میں لائے جاتے ہیں، انہیں عوامی خواہش کے مطابق حل کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی''۔

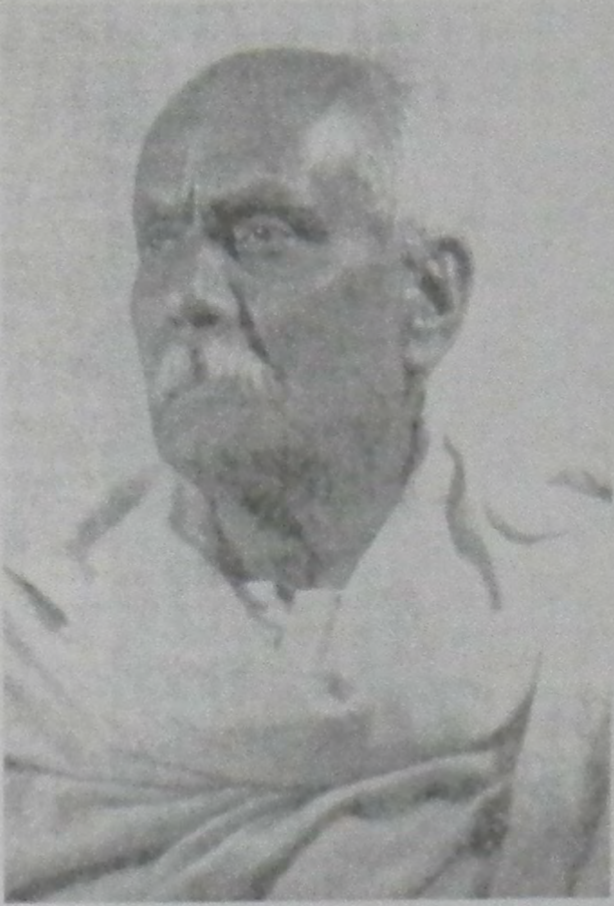
اس پر مرکزی وزیر مواصلات سردار عبدالرب نشتر نے کہا: ''اس سلسلے میں احکامات پہلے ہی جاری کردیئے گئے ہیں''۔

راجہ غضنفر علی خاں نے اس پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا: ''.... میں اپنے معزز دوست سے پوچھتا ہوں کہ انہیں اور کیا چاہیے؟ کیا یہاں کوئی قومی زبان نہیں ہونی چاہیے؟ وہ سسٹر ڈومینین کی بات کررہے تھے۔ وہاں بنگالیوں نے کیا کیا؟ کیا وہاں کسی نے ایسی ترمیم پیش کی کہ بنگالی کو وہی درجہ ملنا چاہیے جو ہندی کو دیا گیا ہے؟ وہاں مراٹھی ہے، تامل ہے۔ کیا وہاں کسی نے ترمیمی نوٹس دیا کہ تامل زبان کو ہندی یا ہندوستانی یا انگریزی کے برابر درجہ ملنا چاہیے؟ کیا یہاں کسی نے لفظ ''انگلش'' پر اعتراض کیا۔ یا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ دوسری ڈومینین کا ہر صوبہ اپنے صوبے کی بولی کو قومی زبان میں شامل کرنے کا جائز دعویٰ کرسکتا ہے۔ لہٰذا، سر، یہ سارے سوالات غیر متعلقہ ہیں۔ میں یہ دیکھ کر از حد خوش ہوں کہ مشرقی بنگال کے نمائندوں کی اکثریت نے یقینی طور پر محسوس کیا ہے کہ اگر انہوں نے یہ تنازعے شروع کردیئے اور ایوان، جو تمام صوبوں اور پاکستان کی آبادی کے تمام حصوں کی نمائندگی کرتا ہے، پر اپنا نقطہ نظر ٹھونسنے کی کوشش کی تو اس سے فی الواقع پاکستان کے وجود کو ہی ضرب لگے گی۔ مجھے قوی امید ہے معزز رکن مہربانی فرما کر اپنی یہ ترمیم واپس لے لیں گے، کیونکہ جب تک یہ واپس نہیں لی جاتی ان کی طرف سے یہ ترمیم پیش کرنے سے جو تاثر قائم ہوا ہے وہ بیرونِ ملک جائے گا کہ اس ترمیم کی غرض اور مقصد مختلف صوبوں کے اذہان میں کنفیوژن پیدا کرنا ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ میں اس ترمیم کی مخالفت کرتا ہوں''۔

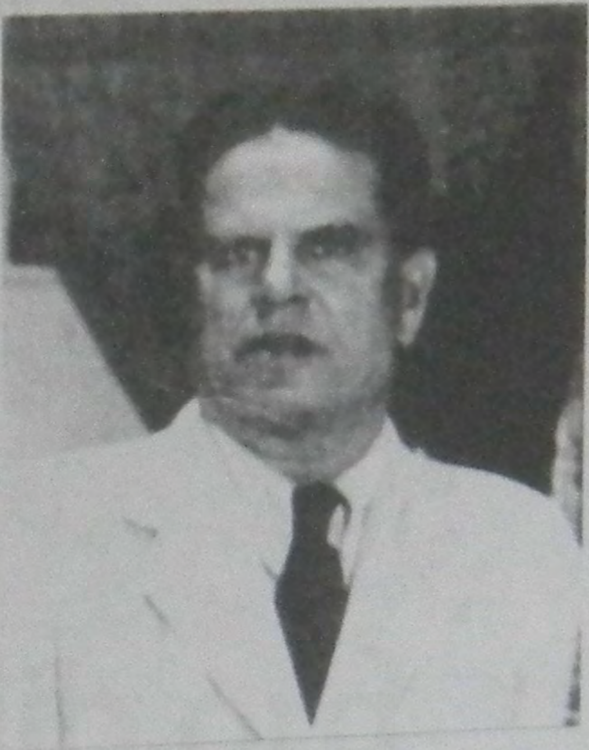
خواجہ ناظم الدین (مشرقی بنگال) نے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا: ''سر، میں ایوان کو اس سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ بنگالی زبان کے اس مسئلے پر ایسٹرن پاکستان کی زبردست اور غالب اکثریت کی رائے کیا ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ جہاں تک صوبوں اور مرکز کے مابین رابطے کا تعلق ہے ایسٹرن پاکستان کی اس زبردست اور غالب اکثریت کی اس پر کوئی دوسری رائے نہیں کہ اس مقصد کے لئے اردو ہی واحد زبان ہے جسے اختیار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن وہاں یہ احساس بہت توانا ہے کہ تعلیمی اداروں میں ذریعۂ تعلیم بنگالی ہونا چاہیے، اور جہاں تک صوبے کی ایڈمنسٹریشن کا تعلق ہے، صوبائی نظم ونسق کے



مولوی تمیز الدین خاں



سریش چندر چٹوپادھیا



محمد ہاشم گزدر



راجہ غضنفر علی

لئے بھی بنگالی زبان استعمال ہونی چاہئے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ معزز قائدایوان نے واضح کر دیا ہے کہ صوبے سے بنگالی کو نکال باہر کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں۔ میں اس پر پختہ ہوں کہ عوام کی غالب اکثریت مملکت پاکستان کیلئے کاملاً اردو کو قومی زبان بنانے کے حق میں ہے۔

''ایک اور نقطہ جس کی میں تصحیح کرنا چاہوں گا۔ پہلے مقررین، جنہوں نے اس ترمیم کی حمایت کی ہے، نے مؤقف اختیار کیا ہے کہ انڈین ڈومینین میں اکثریتی عوام کی زبان ہندی ہے۔ میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ جہاں تک مدراس، بمبئی، سی پی اور اوڑیسہ کا تعلق ہے، ان صوبوں میں عوام کی مادری زبان ہندی نہیں۔ میں یہ بھی واضح کردوں، حتیٰ کہ یوپی صوبے میں بھی عوام کی اکثریت اردو بولتی ہے اور وہ جنہوں نے ہندی کی وکالت کی انہیں اسمبلی یا عوامی جلسوں میں ہندی میں رواں تقریر کرنا ازحد مشکل محسوس ہوتا ہے۔ لہٰذا انڈین ڈومینین کے تمام صوبوں کی ہندی مادری زبان نہیں۔ اس کے باوجود وہاں ہندی سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کی گئی ہے۔ اس لئے، اس استدلال پر، سر، اس تصور (Theory) کی حمایت کرنے کی کوئی بنیاد نہیں کہ بنگالی پاکستان کی سرکاری زبان ہونی چاہئے۔ لیکن جہاں تک صوبۂ بنگال کا تعلق ہے میں زبان کے مسئلے پر بہت پختہ ہوں۔

''میں مناسب وقت پر یہ سوال اٹھاؤں گا اور اس معاملے پر زور دوں گا کہ صوبائی دائرۂ کار میں جہاں تک جنرل ایڈمنسٹریشن اور کاروبارِ حکومت کا تعلق ہے، بنگال میں بنگالی ہی استعمال ہونی چاہئے''۔

مسٹر سریس چندر چٹوپاڈھیا (مشرقی بنگال) نے اس ترمیم کی یہ تاویل کی: ''ترمیم میں سرکاری زبان کا کوئی ذکر نہیں، اس میں تو کہا گیا ہے کہ ایوان کی کارروائی کس طرح بروئے کار لائی جائے گی۔ اس میں اردو کا ذکر ہے اور ساتھ ہی انگلش کا بھی۔ محرک صرف بنگالی کا اضافہ چاہتا ہے۔ اگر ایوان کو یہ منظور ہے تو بسروچشم، لیکن جہاں تک رابطے کی زبان کا تعلق ہے تو آج کے اشو کا یہ موضوع نہیں، لیکن اگر پھر بھی اردو کو بیچ میں لایا جاتا ہے، مجھے اس کے قبول کرنے پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن کوئی بھی اردو نہیں جانتا۔ ہم نے انگلش سیکھی اور اگر ضروری ہوا تو اب ہم اردو سیکھیں گے۔ جب ہم جیل میں تھے تو میں نے اپنے معزز دوست مسٹر تمیزالدین احمد سے اردو سیکھنے کی کوشش کی، لیکن جیل سے باہر آکر میں اسے بھول گیا (قہقہہ)۔ لہٰذا ایوان کی کارروائی چلانا قومی زبان کے انتخاب سے کلیتہً مختلف چیز ہے۔ اس ترمیم میں ہے کہ ایوان کی کارروائی کیسے چلانی ہے؟ اردو میں، انگلش میں یا بنگالی میں؟ اس ترمیم میں یہی واحد نقطہ اٹھایا گیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ یہ ترمیمی تحریک پیش کرتے ہوئے محرک نے معزز قائدایوان کی ناراضی مول لینے کی کوشش نہیں کی۔ ان الفاظ کے ساتھ میں ترمیم کی حمایت کرتا ہوں۔

الحاج محمد ہاشم گذدر (سندھ) کا مؤقف: ''سر، میں اس ترمیم کی مخالفت کرتا ہوں۔ جو دلائل پیش کئے جاچکے ہیں میں انہیں دہرانا نہیں چاہتا، لیکن میں اس معزز ایوان اور اس معزز ایوان کے ذریعے پاکستانی عوام کی توجہ اس طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں کہ اگرچہ یہ ترمیم مجموعی طور پر بظاہر بڑی سادہ (Innocent) نظر آتی ہے، لیکن اس میں پاکستان توڑنے کا خطرہ موجود ہے۔ جیسا کہ یہ ترمیم دیکھنے میں بالکل سادہ ہے، لیکن میں اس ترمیم کے معزز محرک پر یہ واضح کرسکتا ہوں کہ یہ کوئی نیا نقطہ نہیں اور یہ کہ اس معزز ایوان میں بنگالی بولنے والے وہ حضرات، جو اپنا نقطۂ نظر انگریزی یا اردو میں بیان کرنے پر قادر نہیں، کو پہلے ہی رول کے تحت بنگالی میں اظہار خیال کی اجازت حاصل ہے۔ معزز محرک بلی تھیلے سے باہر لے آئے جب انہوں نے یہ کہا کہ پاکستان ڈومینین کی سرکاری زبان بنگالی ہونی چاہئے، کیونکہ بنگالی بولنے والے اکثریت میں ہیں۔ سر، یہ خطرناک تحریک ہے اور ہمیں اسے اسی طرح لینا چاہئے۔

''میں ترمیم کے محرک سے پوچھنا چاہوں گا، ہماری سسٹر ڈومینین، بھارت، نے ہندی کیوں اختیار کی؟ سر، اس کی یہی واحد وجہ ہے کہ وہ تمام ہندوستانیوں کو متحد کرنے کے لئے ایک قومی زبان چاہتے ہیں۔ سر، اگر بھارت کا نقشہ ملاحظہ کیا جائے تو اس پر بھارت بھر میں بولی جانے والی لاتعداد زبانیں ملیں گی اور یہ کہ ایک صوبے کے عوام کسی دوسرے صوبے کی زبان کا ایک لفظ تک نہیں سمجھتے۔ بنگالی، اور یا (Oriyya) زبانوں کو لیں اور پھر مدراس کی طرف آئیں، وہاں تامل، تلگو اور ملیالم زبانیں ملیں گی۔ بمبئی جائیں وہاں کناری، مراٹھی اور گجراتی زبانیں ہیں۔ سر، آپ دیکھیں گے کہ ہر طرف مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں۔ سر حتیٰ کہ یوپی میں آپ دیکھیں گے کہ موجودہ زبان جو اختیار کی گئی ہے ان لوگوں کی سمجھ سے بھی بالا ہے جو اردو یا ہندی بولنے میں معروف ہیں۔

''اس کے پیچھے قوم کو متحد کرنے کا تصور تھا، اس سے بے نیاز ہو کر آیا عوام یہ زبان سمجھتے ہیں یا نہیں، چاہے ایک کسان اس زبان میں ایک تار بھیج سکے یا نہیں، ایک منی آرڈر فارم لکھ سکے یا نہیں۔ لیکن پاکستان ایک ڈومینین ہے۔ اور ایسٹ بنگال سے ہمارا فاصلہ 1400 میل ہے۔ اس لئے اگر ہم مشترکہ زبان کا مضبوط تعلق نہ رکھیں، قدرتاً ہمارے روابط بہت کمزور ہوں گے۔ سر، ہم نہیں چاہتے کہ ہمارا پاکستان بے ضرر دکھائی دینے والی ترمیم اختیار کرنے سے ٹوٹ جائے۔ لہٰذا میں اس ایوان سے یہ ترمیم مسترد کردینے کی اپیل کروں گا۔ جہاں تک بنگال کے میرے دوستوں کا تعلق ہے، خواجہ ناظم الدین نے بنگالی زبان کی پوزیشن بیان کردی ہے کہ اُس صوبے میں اسے تحفظ دیا گیا ہے۔ اور مسٹر غضنفر علی خاں نے بھی واضح کردیا ہے کہ رولز میں یہ یقینی امر ہے کہ ہمارے بنگالی دوست اس ایون میں بنگالی زبان کو ذریعۂ

اظہار بنا سکتے ہیں۔لہٰذا میں ایوان سے یہ ترمیم مسترد کرنے کی اپیل کرتا ہوں''۔

مولوی تمیز الدین خاں نے اس تحریک کے متعلق کہا: ''میرے معزز دوست مسٹر دَتہ کی طرف سے پیش کی گئی ترمیم کے خلاف جو کچھ کہا جا چکا ہے میں اس میں کوئی اضافہ نہیں کر سکتا۔سر، میں ترمیم مسترد کرتا ہوں''۔

صدر پاکستان دستور ساز اسمبلی قائداعظم محمد علی جناحؒ نے مجوزہ ترمیم دہرائی۔سوال یہ ہے۔

''کہ رول 29 کے سب رول (1) میں سطر 2 میں ''انگلش'' کے لفظ کے بعد لفظ بنگالی شامل کیا جائے''۔

ایوان نے یہ ترمیمی تحریک مسترد کردی۔

یوں عوامی نمائندوں نے ،جن میں بنگالی مسلم نمائندے پیش پیش تھے، طے کردیا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔اس دستور ساز اسمبلی میں مشرقی بنگال سے یہ لوگ منتخب ہو کر آئے تھے۔عبداللہ المحمود، خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، نورالامین، اے کے فضل الحق، حمید الحق چودھری، عبدالحمید، مولوی تمیز الدین خاں، ایم اے ایچ اصفہانی، خواجہ شہاب الدین، ابوالمسعود ابوالحمید، عزیز الدین احمد، مفیض الدین احمد، ڈاکٹر اے ایم مالک، ابوالقاسم خاں اور مولوی ابراہیم خاں۔ بلکہ مولوی ابراہیم خاں نے اسی روز یعنی 25 فروری 1948ء، اسمبلی کارروائی شروع ہونے سے قبل اپنی اسنادِ رکنیت پیش کیں اور رول آف ممبرز پر دستخط کئے تھے۔ان ارکان میں سے کسی نے بھی مشرقی بنگال کے ہندو ارکان اسمبلی کی طرف سے بنگالی کو قومی زبان بنانے کے مؤقف کی حمایت وتائید نہ کی تھی۔

عطا ربانی یا کوئی اور کس طرح کہہ سکتا ہے کہ اردو کو قومی زبان بنانے کا فیصلہ محض قائداعظمؒ کا تھا۔ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ نے تو پاکستان دستور ساز اسمبلی کے اس فیصلے کا پابند ہو کر یہ اعلان کیا تھا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو ہوگی۔

پاکستان دستور ساز اسمبلی کے اس اجلاس کی کارروائی سے واضح ہے کہ ہر رکن کو کھل کر بولنے کی اجازت تھی۔اور یہ بھی سامنے آتا ہے کہ مشرقی پاکستان، جو اس وقت مشرقی بنگال تھا، کے کانگریسی ہندو ارکان نے کس ہوشیاری سے بنگالی کو اسمبلی کی زبان کے بنانے کے بہانے اسے قومی زبان بنانے پر زور دینا شروع کردیا۔جبکہ مسلمان نمائندے اردو کے زبردست حق میں تھے۔اس سلسلے میں مشرقی بنگال سے تعلق رکھنے والے مسلمان ارکان کے دلائل بھی خاصے مضبوط تھے۔



گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ - ڈھاکہ میں جلسۂ عام سے خطاب

اس پر عطار بانی کے اس مؤقف میں کیا وزن رہ جاتا ہے: ''اردو کے بحیثیت قومی زبان نفاذ نے مشرقی بازو، جو پاکستان کی کل آبادی کے 54 فی صد پر مشتمل تھا، کو برگشتہ کردیا۔ بنگالیوں کے خیال میں اس اقدام سے ان کی زبان اور ثقافت کو کچلا جارہا تھا۔ اور وہ یہ باور کرنے میں حق بجانب تھے کہ یہ قدم ان کے حقوق کی تکذیب ہے''۔

عطار بانی اور ہر اس شخص کو، جو قائداعظمؒ کی طرف سے اردو کو قومی زبان کے اعلان پر معترض رہا ہے، یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اس اعلان کے بعد بنگالیوں کا ردعمل ناراضی نہیں خوشی والا تھا۔

ربانی صاحب قائداعظمؒ کے اس اعلان پر فرماتے ہیں کہ ''ایسا قومی یکجہتی کی امید پر کیا گیا لیکن اس کا برامانا گیا اور اسے غلط سمجھا گیا''۔ بقول عطار بانی صاحب، جب گورنر جنرل نے یہ اعلان اچھی نیت سے کیا تو اس کا چاہے برامانا جائے یا اچھا، اسے غلط سمجھا جائے یا درست، گورنر جنرل کو آپ دوش نہیں دے سکتے۔ پھر تو نیک نیتی پر کئے گئے ایسے اعلان یا فیصلے کا برامانے والے اور اسے غلط سمجھنے والے آپ کا ہدف ہونے چاہئیں۔ لیکن الٹا آپ گورنر جنرل قائداعظم محمد علی جناحؒ کو قصوروار ٹھہرا رہے ہیں۔

ڈھاکہ کے جس جلسۂ عام میں قائداعظمؒ نے اردو کو قومی زبان کہا تھا وہ 21 مارچ 1948ء کو ہوا تھا۔ اس کے باوجود بنگالیوں کا جذبہ دیکھنے والا تھا۔ قومی زبان کے ضمن میں قائداعظمؒ نے کہا:

> ''زبان کے متعلق، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، یہ مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے کے لئے کیا جارہا ہے۔ آپ کے وزیراعظم نے ایک حالیہ بیان میں اس کی ٹھیک نشاندہی کردی ہے اور میں خوش ہوں کہ ان کی حکومت نے سیاسی تخریب کاروں یا ان کے ایجنٹوں کی طرف سے اس صوبے کا امن خراب کرنے کی ہر کوشش مضبوطی سے ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ آیا بنگالی اس صوبے کی سرکاری زبان ہوگی اس کا فیصلہ کرنا اس صوبے کے منتخب نمائندوں کا کام ہے۔ مجھے کوئی شبہ نہیں کہ یہ مسئلہ مناسب وقت پر صرف اور صرف اس صوبے کے باسیوں کی خواہشات کے مطابق حل کرلیا جائے گا۔
>
> ''میں واضح الفاظ میں آپ کو بتاتا ہوں، اس میں کوئی سچائی نہیں کہ بنگالی زبان کے حوالے سے آپ کی معمول کی زندگی کو چھیڑا یا درہم برہم کیا جارہا ہے۔ لیکن آخرکار آپ ہی کو، اس صوبے کے عوام کو ہی، یہ فیصلہ کرنا ہے کہ آپ کے صوبے کی زبان کیا ہونی چاہئے۔ لیکن میں واضح الفاظ میں کہتا ہوں کہ پاکستان کی قومی زبان کوئی اور زبان نہیں اردو ہوگی۔ جو کوئی آپ کو بھٹکائے وہ حقیقتاً پاکستان کا دشمن ہے۔ ایک قومی زبان کے بغیر کوئی قوم مضبوطی



24 مارچ 1948ء --- ڈھاکہ یونیورسٹی کانووکیشن سے خطاب کے بعد قائداعظمؒ واپس جارہے ہیں

سے اکٹھا رہ سکتی ہے نہ کام کرسکتی ہے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ پر نظر دوڑا ئیں۔ لہٰذا جہاں تک سرکاری زبان کا تعلق ہے پاکستان کی زبان اردو ہوگی، لیکن، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ایسا اپنے وقت پر ہوگا''۔

عطا ربانی کہتے ہیں: ''بنگالیوں نے جلسے میں غدر مچایا''۔ بالکل غلط۔ کوئی تنکا بھی نہیں ہلا، بلکہ جب، آگے چل کر، اردو کو قومی زبان کہنے کے بعد، اسی تقریر میں قائداعظمؒ نے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے انسانوں کے اس سمندر سے پوچھا: ''میں آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ کیا آپ کا پاکستان پر ایمان ہے؟''۔ جواب میں عوام نے پرزور اور پرجوش انداز میں ''ہاں، ہاں'' کہا۔ پھر دریافت کیا: ''کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایسٹ بنگال یا پاکستان کا کوئی حصہ انڈین یونین میں چلا جائے؟ جواب میں عوام چیخے: ''نہیں نہیں''۔

اب 60 برس بعد، 2008ء میں، عطا ربانی نامی ایک شخص کو قائداعظمؒ کے جلسے میں ہلڑ بازی نظر آتی ہے۔ قائداعظمؒ نے مشرقی پاکستان میں اپنے اس قیام کے دوران میں کئی عوامی جلسوں اور میٹنگوں سے خطاب کیا۔ سلیم اللہ ہال میں کانووکیشن سے خطاب کیا۔ کہیں بھی چڑیا کے پر پھڑ پھڑانے جتنی حرکت بھی نہیں ہوئی، بلکہ ہر جلسہ عقیدت مندانہ جوش سے معمور رہا۔ یہاں کے ہر عطا ربانی کو علم ہونا چاہئے کہ قائداعظمؒ ایک ہفتہ سے زیادہ وہاں رہے، 21 مارچ کو وہاں پہنچے، 29 مارچ کو واپسی ہوئی۔ ان کے وہاں قیام کے دوران میں بنگالیوں نے گھروں، دکانوں اور بازاروں وغیرہ میں چراغاں کئے رکھا۔ اور جیسا جوش وخروش قائداعظمؒ کی آمد پر مغربی پاکستان کے کسی شہر میں پایا جاتا تھا ویسا ہی جوش وخروش مشرقی پاکستان میں تھا جو اس وقت مشرقی بنگال کہلاتا تھا۔ یہ ہوائی نہیں ٹھوس اور دستاویزی بات ہے، اس کی تفصیل میری آنے والی کتاب، ''دی گریٹ لیڈر'' میں آئے گی۔ بنگالی قائداعظمؒ کے بارے میں اس قدر عقیدت بھرے جوش میں آجاتے تھے کہ جب انہوں نے اسی ڈھاکہ شہر، جہاں انہوں نے اردو زبان کو قومی زبان قرار دیا تھا، میں چکر لگانے کی خواہش کی تو آئی جی مشرقی بنگال ذاکر حسین نے اس بنا پر سیکورٹی کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کردیا کہ قائداعظمؒ کے شہر میں گھومنے پر اتنا بڑا ہجوم ہوجائے گا کہ میرے لئے ان کی سیکورٹی کے انتظامات کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اس کے دو تین روز بعد قائداعظمؒ نے کہا، میں ڈھاکہ شہر میں جاؤں گا، مجھے آپ کی سیکورٹی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور وہ بغیر سیکورٹی کے گئے۔ وہ جہاں جہاں سے گزرے لوگ بے پناہ ہجوم کی صورت ان کے گرد جمع ہوجاتے۔ زندہ باد کے نعرے

لگاتے۔ ان کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتے۔ اور آج مسٹر عطا ربانی پر منکشف ہوتا ہے کہ ''بنگالیوں نے قائداعظمؒ کے فیصلے کے خلاف عوامی سطح پر آوازیں بلند کیں''۔

جس تصادم اور تین طلبا کی مسٹر ربانی نے ہلاکت کا ذکر کیا ہے، وہ فروری 52ء کی بات ہے۔ اس کا قائداعظمؒ سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ قائداعظمؒ کی طرف سے اسمبلی کی منظوری اور اصرار کے بعد اردو کو قومی زبان ڈیکلیئر کرنے پر بنگالیوں کی سوچ یہ تھی: ''قائداعظمؒ ٹھیک بولےشین۔ اردو ہمارا مذہبی بھاشا آشن اور بنگلہ ہمارا امرراسٹو بھاشا''۔ (قائداعظمؒ نے ٹھیک کہا، اردو ہماری مذہبی زبان ہے اور بنگلہ ہماری سیاسی زبان ہے)۔ اور مشرقی پاکستان میں بنگلہ زبان کا یہ دوہا عام رہا ۔

اللہ قدرت اور جناحر شان

شا کالے اٹھلم تو دیکھلم پاکستان

(اللہ کی قدرت اور جناح کی شان، صبح اٹھتے ہیں تو پاکستان بنا دیکھتے ہیں)۔

ربانی صاحب فرماتے ہیں: ''اکثریت ہونے کے ناتے ان کا یہ دعویٰ منطقی طور پر درست تھا کہ بنگالی کو پاکستان کی مشترکہ زبان قرار دینا چاہئے تھا''۔ کہاں ان کا یہ دعویٰ تھا۔ چندارکان اسمبلی وہ بھی بندوارکان نے ایک سوچی سمجھی سکیم کے تحت ایسا ضرور کہا، لیکن اس کی مخالفت کرنے اور اردو کو ہی قومی زبان بنانے پر زور دینے میں بنگالی مسلمان ارکان اسمبلی پیش پیش تھے۔ اور دلائل کے ساتھ۔ مرکزی اسمبلی کے اس فیصلے کے برعکس اگر قائداعظمؒ ڈھاکہ جا کر اردو کے بجائے بنگالی کو قومی زبان قرار دیتے تو پھر انہی عطا ربانیوں نے کہنا تھا، ملک اس لئے ٹوٹا کہ قائداعظمؒ نے اسمبلی کے فیصلے کے برعکس قدم اٹھایا تھا۔ قائداعظمؒ کا اعلان تو سراسر جمہوری فیصلے کا احترام تھا۔ ملک تو ٹوٹا ہمارے غیر جمہوری اقدامات سے۔ اور اس وقت کی دونوں سپر پاورز امریکہ اور سوویت یونین کی منصوبہ بندی سے۔ کیا جرمنی مغربی ار مشرقی جرمنی میں اور کوریا شمالی اور جنوبی کوریا میں زبان کی بنیاد پر بٹے تھے؟ اس وقت کی عالمی طاقتوں کے مفادات اور ان کی Strategic (تزویراتی) ضروریات نے ان سے ایسا کروایا۔

ہم نے مغربی پاکستان کے صوبوں کا ون یونٹ بنا کے اور پیرٹی لا کے ان کی 54 فی صد اکثریت کو 50 فی صد کیا اور مغربی پاکستان کے 46 فی صد تناسب کو 50 فی صد تک بڑھا دیا۔ انہوں نے ملک کے وسیع تر مفاد میں یہ بھی مان لیا۔ 56ء کا آئین انہوں نے تسلیم کیا۔ اسی 56ء کے آئین کے تحت وہ فروری 1959ء میں ہونے والے عام انتخابات میں پر جوش حصہ لے رہے تھے کہ کمانڈر انچیف جنرل محمد ایوب خاں نے یہ بساط ہی الٹ دی۔ اور ان سیاستدانوں کو سیاست میں حصہ لینے کے لئے نااہل قرار دیدیا

جنہوں نے گیارہ برس قبل قائداعظمؒ کی قیادت میں سب سے بڑی مسلمان مملکت قائم کی تھی۔ ان میں وہ بنگالی قیادت بھی شامل تھی جس نے دستور ساز اسمبلی کے اجلاس مذکور میں اردو کو قومی یکجہتی اور مسلم انڈیا کی زبان ہونے کے سبب قومی زبان بنانے پر زور دیا تھا۔ فروری 52ء میں تخریب کاروں نے زبان کے مسئلے پر وہاں گڑبڑ پھیلائی۔ بنگالی کو بھی سرکاری بان قرار دینے کا مطالبہ ہوا۔ مشرقی بنگال اسمبلی نے اس ضمن میں قرارداد منظور کی۔ نورالامین کی صوبائی حکومت نے مرکزی دستور ساز اسمبلی کو سفارش کی کہ اردو کے ساتھ بنگالی کو بھی سرکاری زبان قرار دیا جائے۔ خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ سے برطرفی کے بعد محمد علی بوگرہ کو وزیراعظم بنایا گیا۔ زیر تشکیل آئین میں اردو اور بنگالی دونوں کو قومی زبان قرار دینے کا اصول طے ہو گیا۔ جب مسٹر عطا ربانی یہ کہتے ہیں: ''بنگلہ اور اردو دونوں کو قومی زبانیں قرار دینا چاہئے تھا، یہ صورت دونوں بازوؤں کو قابل قبول ہوتی'' تو ان کی لاعلمی سامنے آتی ہے، کیونکہ ایسا آئینی طور پر ہو چکا تھا۔ 24 اکتوبر 1954ء کو گورنر جنرل غلام محمد نے وہ دستور ساز اسمبلی ہی توڑ دی جو دو ماہ بعد قائداعظمؒ کے 79 ویں یوم پیدائش پر آئین نافذ کرنے والی تھی، لیکن بعد کے آئین میں بھی بنگالی کو اردو کے ساتھ قومی زبان قرار دیا گیا بلکہ مغربی پاکستان میں بنگالی کی ترویج بھی شروع کر دی گئی۔ حتیٰ کہ اقبال کے ساتھ نذرالاسلام کو بھی لا کھڑا کیا گیا۔ ''نذرالاقبال'' کے نام سے سیمینار بھی ہوتے رہے۔ لیکن آمریت اور مارشل لا کا تسلسل ہر اچھے قدم کے نتائج غارت کرتا چلا گیا اور آج موجودہ پاکستان کے مسائل کی شدت کے پیچھے یہی آمرانہ حکمرانی کارفرما ہے نہ کہ کسی بڑے یا چھوٹے صوبے کی زبان۔

ملک اردو کو قومی زبان قرار دینے پر نہیں ٹوٹا۔ ملک ٹوٹا آمریت اور مارشل لاؤں کے تسلسل کے سبب۔ حسین شہید سہروردی مشرقی ہی نہیں پورے پاکستان کے بھی لیڈر تھے۔ وہ دونوں حصوں کے درمیان ایک مضبوط پل تھے۔ اس پل نے 62ء کی قومی اسمبلی میں اپوزیشن لیڈر اور دیرینہ مسلم لیگی یوسف خٹک کے ذریعے صدر جنرل محمد ایوب خاں کو مغربی اور مشرقی پاکستان کی یکجہتی کے حوالے سے پیغام بھیجا۔ بقول یوسف خٹک:۔

> ''سہروردی صاحب نے مجھے ایک نہیں دو مرتبہ کہا تھا کہ آپ ایوب خاں سے کہیں کہ میں مرنے سے پہلے پاکستان کے لئے ایک آخری خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان ایک CONSTITUTIONAL SETTLEMENT (آئینی تصفیہ) ہو جائے۔ ورنہ میرے بعد کوئی ایسی شخصیت نہیں ہوگی جو یہ خدمت انجام دے سکے۔ میں ایوب خاں کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں پاکستان میں نہ



صدر جنرل محمد ایوب خاں کے خلاف صدارتی انتخابی مہم کے دوران میں مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ پشاور سے سلہٹ تک جہاں بھی گئیں، عوامی جوش و خروش بے پایاں رہا

رہوں تو اس کے بعد جب تک ایوب خاں صدر ہوں میں ملک سے باہر چلا جانے کیلئے بھی تیار ہوں۔ بلکہ وہ اگر دوسری مرتبہ بھی صدر منتخب ہونا چاہیں تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ میرے لئے یہی کافی ہے کہ میں پاکستان کے لئے یہ آخری خدمت انجام دے دوں کیونکہ میں دل کا مریض ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ اب میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہوں گا۔ لیکن میں پاکستان کے لئے یہ آخری خدمت انجام دینا چاہتا ہوں اور مجھے کچھ نہیں چاہئے''۔ (سیاسی اتار چڑھاؤ۔ صفحہ 242۔ آتش فشاں لاہور)۔

بتایئے اس میں اردو یا بنگلہ زبان کا کوئی دخل ہے؟ جنرل ایوب نے یہ آفر مسترد کردی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے پیش کش کی کہ میں 6 نکات چھوڑتا ہوں جنرل ایوب خاں 62ء کے آئین میں ترمیم کروادیں کہ ایک بار صدر مغربی پاکستان سے ہوگا اور ایک بار مشرقی پاکستان سے۔ چودھری محمد علی یہ تجویز لے کر گئے۔ جنرل ایوب نے یہ بھی مسترد کردی۔

آپ کہتے ہیں کہ ملک اس لئے ٹوٹا کہ قائداعظمؒ نے اردو کو قومی زبان ڈیکلیئر کیا۔ قائداعظمؒ کا نہیں وہ تو پاکستان دستور ساز اسمبلی کا فیصلہ تھا۔ انہوں نے بطور سربراہِ مملکت اس فیصلے کا اظہار کیا۔ 2 جنوری 65ء کے صدارتی انتخاب کے لئے انتخابی مہم کے دوران میں مشرقی پاکستان نے صدر جنرل ایوب کے مقابلے میں قائداعظمؒ کی بہن مادر ملت محترمہ فاطمہ جناحؒ کا کس قدر والہانہ انداز میں ساتھ دیا تھا، لیکن جنرل ایوب کی دھاندلی نے انہیں بدظن کردیا کہ ہم ووٹ کے ذریعے تبدیلی نہیں لا سکتے۔ ان میں نفرت اور احتجاج کی چنگاریاں اردو نے نہیں اس دھاندلی نے بھڑکائیں۔ 65ء کی جنگ نے انگیخت دی کہ اس دوران میں انہیں کسی بیرونی جارحیت کی صورت میں عدم تحفظ کا احساس ہوا۔ 70ء کے انتخابات میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے اکثریت حاصل کی۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور صدر جنرل آغا محمد یحییٰ خاں نے انہیں اقتدار دینے کے بجائے ان کے خلاف فوجی ایکشن کیا۔ جنرل نیازی نے ہتھیار ڈالے۔ ملک ٹوٹا۔ اردو کا منفی کردار کہیں بھی نظر نہیں آتا۔

القصہ، پاکستان دستور ساز اسمبلی کے فیصلے کے نتیجے میں قائداعظمؒ کی طرف سے اردو کو قومی زبان قرار دینے کے نتیجے میں نہیں، ہماری سیاسی اور انتظامی حماقتوں کے نتیجے میں ملک ٹوٹا۔ ڈھاکہ میں 21 مارچ 1948ء کے اسی جلسۂ عام میں جہاں قائداعظمؒ نے اردو کو قومی زبان قرار دیا تھا وہاں دشمن کے ناپاک ارادوں اور منصوبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی کہا تھا:'' مشرقی

بنگال کو انڈین یونین میں واپس لانے کا تصور ترک نہیں کیا گیا۔ وہ ابھی تک اپنے اس ارادے پر قائم ہیں۔اور مجھے یقین ہے-- مجھے یہ کہتے ہوئے باک نہیں، لیکن چوکنا رہنا بہتر ہے-- کہ وہ لوگ جو ابھی تک مشرقی بنگال کو واپس انڈین یونین میں لانے کا خواب دیکھ رہے ہیں وہ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں''۔

ہمارے غیر جمہوری اور مارشل لائی حکمرانوں کی بدولت مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بنا۔ پھر بھی قائداعظمؒ کی یہ پیش گوئی کس قدر سچ ثابت ہوئی کہ انڈیا کا وہ پھر بھی حصہ نہیں بنا بلکہ وہ بنگلہ دیش بن کر بھی بھارت کے سینے پر مسلسل مونگ دل رہا ہے۔

ایک طرف تو ربانی صاحب بنگلہ کو اکثریتی زبان کہتے ہیں۔اردو جو ملک کے دونوں حصوں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی اور جو تحریک قیام پاکستان کی زبان بھی تھی وہ تو انہیں قبول نہیں، الٹا انگریزی کو بیچ میں گھسیٹ لائے ہیں کہ انگریزی کو قومی زبان قرار دے دیا جاتا تو ملک بچ جاتا-- یہ کس قدر غیر منطقی اور مضحکہ خیز دلیل ہے۔

مسٹر عطا ربانی کہتے ہیں، اکثریتی زبان ہونے کے سبب بنگالی قومی زبان ہونی چاہئے تھی۔تو کیا اب جو پاکستان ہے، یہاں اکثریتی زبان ہونے کے ناتے پنجابی قومی زبان ہونی چاہئے؟اور جس طرح جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف نے وفاق کی چولیں ڈھیلی کی ہیں اور بلوچستان وغیرہ میں جو کچھ ہو رہا ہے بلکہ بلوچستان کے بارے میں کہا جا رہا ہے:''مشرقی پاکستان کی طرح بلوچستان کی صورتحال بھی خطرناک ہے''۔کیا یہ زبان کا مسئلہ ہے یا آمرانہ حماقتوں کا نتیجہ؟

❋

میں، مولانا عبدالستار خاں نیازی
قیمت: 100 روپے

نصف صدی کی چشم دید سیاسی تاریخ۔ لاتعداد دلکش و دلخراش واقعات سے معمور۔

ایک دل ہزار داستان
آغا اشرف کی آپ بیتی

پون صدی قبل کے برصغیر کی مجلسی زندگی، سماجی، تمدنی رسوم و قیود، رواجوں، روایتوں اور سیاسی نشیب و فراز کا ایسا گلدستہ کہ پڑھنے والا گل و لالہ اور گل نشاط کے سرور میں ڈوب جائے۔

قیمت: 500 روپے

اقبالِ کامل
مصنف: مولانا عبدالسلام ندوی

قیمت 250 روپے

علامہ اقبالؒ کے مفصل سوانح حیات کے ساتھ ان کی تصنیفات، فلسفہ اور شاعری پر نقد و تبصرہ

روزگارِ فقیر
مصنف فقیر سید وحید الدین

قیمت: 300 روپے

علامہ اقبالؒ کی گھریلو زندگی کے روزمرہ مناظر اور نجی صحبتیں

المیۂ مشرقی پاکستان، پانچ کردار
قیمت 150 روپے

جنرل (ر) یحییٰ خاں، آغا محمد علی، جنرل (ر) گل حسن، ایئر مارشل (ر) رحیم خاں اور میجر (ر) نادر پرویز سے منیر احمد منیر کے انٹرویوز

سیاسی اتار چڑھاؤ
قیمت 250 روپے

یحییٰ بختیار، سر ظفر اللہ خاں، سردار عبدالحمید دستی، یوسف خٹک اور سید مرید حسین شاہ سے منیر احمد منیر کے انٹرویوز۔۔۔ گزشتہ پون صدی کے سیاسی اُتار چڑھاؤ کی تلخ، شیریں، ترش، اور خوش رنگ داستانیں

آتش فشاں
78 ستلج بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن۔ لاہور
پوسٹ بکس 162 لاہور
موبائل: 0333-4332920

محسن اعظمؒ اور محسنینؒ
قیمت: 100 روپے

THE BENEFACTOR
(Translation of Mohsin-I-Azam and Mohsanin)

Price:. Rs. 200/-

سیاستِ ملیہ
مصنف: محمد امین زبیری

تحریکِ پاکستان پر لکھی جانے والی تمام کتب میں بنیادی درجے کی حامل کتاب

قیمت: 400 روپے

رنجیت سنگھ
مصنف سر لیپل گرفن — ترجمہ مولوی نظیر حسین فاروقی

اس دور کے ہندستان، بالخصوص پنجاب و سرحد پر معلومات و واقعات کا خزینہ۔

قیمت: 150 روپے

میرا شہر لاہور
مصنف: یونس ادیب

اندرون لاہور کا چشم دید ثقافتی سراپا

قیمت: 250 روپے

جو میں نے دیکھا
وہ کتاب جس نے تہلکہ مچادیا

راؤ عبدالرشید سے منیر احمد منیر کا انٹرویو

قیمت: 200 سو روپے

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ
مولانا مودودی پر ایک دستاویز

قیمت: 150 روپے

انجمن
برصغیر کی 34 سیاسی، علمی و ادبی شخصیات سے متعلق نادر واقعات اور یادداشتوں کا مجموعہ

مصنف: فقیر سید وحید الدین — قیمت: 300 روپے

میری داستان
ایڈیٹر "الفلاح" پشاور سید عبداللہ شاہ کی یادداشتیں

قیمت: 100 روپے

رو میں ہے رخشِ عمر
ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کی خودنوشت

قیمت: 300 روپے

نصف صدی کی ایک سیاسی، ثقافتی، علمی اور ادبی تاریخ جو آنکھوں دیکھے ایسے واقعات و حقائق کی دلچسپ داستان ہے جو کسی تاریخ کے اوراق میں نہیں ملیں گے۔

میرا بھائی
قیمت 100 روپے

بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ کی داستان حیات جسے ان کی عظیم بہن مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی یادداشتوں سے کشید کیا۔

قائداعظمؒ اور قانون وقف علی الاولاد
تالیف: شیخ گلاب دین — قیمت: 100 روپے

قائداعظم جناحؒ
جیسا میں انہیں جانتا ہوں

مصنف: حسن اصفہانی — قیمت: 300 روپے

قائداعظمؒ کی شخصیت، مطالبہ پاکستان کے ارتقا اور اس دور کی بعض شخصیات اور واقعات کی اصلیت ایک نئے انداز میں۔

قائداعظمؒ پر قاتلانہ حملہ
قیمت 100 روپے

مصنف: اکبر اے پیر بھائی بار ایٹ لا — ترجمہ: منیر احمد منیر

صرف مسٹر جناح
تالیف سید شمس الحسن — ترجمہ منیر احمد منیر

قائداعظمؒ کے ذاتی ریکارڈ سے مرتب قائداعظمؒ کی بے کراں، بے دھڑک، بے کھوٹ، بے ریا اور بے نظیر شخصیت پر ایک دستاویز۔ قیمت 300 روپے

MOHOMED ALI JINNAH
AN AMBASSADOR OF UNITY

BIOGRAPHICAL APPRECIATION BY SAROJINI NAIDU — Price: Rs. 300/-

فضائیہ میں گزرے ماہ وسال

سابق ائیر چیف پاکستان ائیر فورس ائیر مارشل (ر) ظفر چودھری کی یادداشتیں

دلچسپ اور معلوماتی قیمت: 200روپے

پاکستان کا المیہ

قیمت: 150 روپے

چودھری ظفر اللہ خاں کے چالیس سالہ تجربات اور مشاہدات کا حاصل

کچھ شکستہ داستانیں، کچھ پریشاں تذکرے

قیمت 150روپے

بابائے صحافت مولانا ظفر علی خاںؒ کے ساتھی اور روزنامہ "زمیندار" کے سابق مدیر اشرف عطا کی یادداشتیں۔

پاکستان -- سیاسی جوار بھاٹا

قیمت 250 روپے

آغا غلام نبی پٹھان اور سید امجد علی سے منیر احمد منیر کے طویل انٹرویوز
نصف صدی پر محیط کیسے کیسے دلکش اور دلخراش واقعات بکھیرتے چلے جاتے ہیں

آؤٹ آف ڈیٹ

قیمت:100روپے

بیتے دنوں کے فلمی ستاروں کی دلربا یادداشتیں

نور جہاں کی کہانی میری زبانی

قیمت ڈیڑھ سو روپے

ملکۂ ترنم نور جہاں کی زندگی کا انوکھا مگر اصلی روپ ---- تصاویر نایاب اور یادگار

سفرنامۂ خواجہ حسن نظامی

صاحب طرز ادیب خواجہ حسن نظامی کا اچھوتا، سحر آمیز، خوبصورت اور مشاہداتی حسن کی دل پذیری سے مالا مال سفرنامہ۔ اس دور کے مصر، فلسطین، شام وحجاز کے رہن سہن، برتاؤ اور اطوار کی رونق سے بسا ہوا۔ قیمت :100روپے

اے۔آر۔شبلی کی تحقیق اور کمال محنت کا نچوڑ

پاکستان اور بھارت کے دوطرفہ تعلقات اور کشمیر

سینکڑوں کتابوں کی ورق گردانی کی روشنی میں واقعاتی تجزیوں سے بھرپور تصنیف۔ پاک بھارت تعلقات اور مسئلہ کشمیر کو سمجھنے کے لیے تاریخی اہمیت کی حامل ایک اہم کتاب۔ قیمت: 250روپے

سفرنامۂ عراق عرب

مولوی محبوب عالم کا 1917ء کا ایک خوبصورت سفرنامہ

مشاہداتی حسن، صحافیانہ تجسس، تحیر اور کھوج سے مالا مال قیمت 100روپے

سفرنامۂ افغانستان

خواجہ حسن نظامی کا 1931ء کا سفرنامہ

انداز بے ساختہ، زبان شستہ، واقعات شاندار

سیر وسفر کی چاشنی کے ساتھ ساتھ مؤرخانہ حسن سے آراستہ ایک یادگار سفر قیمت 100روپے

کافرستان

نظر ثانی: احمد منیر

قیمت:200 روپے

محمود ایرانی کا کافرستان، چترال، دیر اور سوات کا انکشافات سے بھرپور سفرنامہ جس نے دھوم مچادی

جہاں نما

ممتاز احمد خاں کا سفرنامہ ایران، ترکی، ہالینڈ، جرمنی اور فرانس۔ دلچسپ بھی اور مفید بھی

قیمت: 100 روپے

ماڈرن کولمبس

قیمت 200روپے

جاوید اقبال کارٹونسٹ کا سفرنامہ کویت، پیرس، لندن، نیویارک اور کینیڈا۔
اس کے کارٹونوں کی طرح شوخ، بے تکلف، بے خوف اور بے نظیر۔

عجمی کاج

قیمت 100روپے

پروفیسر ڈاکٹر اے۔آر۔خالد کا یہ سفرنامہ حج بلاشبہ اردو سفرناموں میں ایک شاندار اضافہ ہے۔
پروفیسر موصوف کی شخصیت کی طرح بے لاگ، بے خوف، باوقار

ماڈرن ابنِ بطوطہ

قیمت: 100 روپے

جاوید اقبال کارٹونسٹ کا سفرنامہ لندن، جرمنی، ڈنمارک، سویڈن، ناروے
اُسکے کارٹونوں کی طرح ہنستا بولتا

یادِ ایام

مصنف عبدالرزاق کانپوری

قیمت 300روپے

برصغیر کی مختلف قومی وملی شخصیتوں کے حوالے سے فن سوانح نگاری کا بیش بہا اثاثہ

خوں بہا

قیمت 150روپے

بلند پایہ ادیب حکیم احمد شجاع کی انمول خودنوشت

ATISH FISHAN

آتش فشاں